انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

ستمبر 2011
جلد 34 شمارہ 6
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37 - اردو بازار، کراچی

خط و کتابت کا پتہ۔ ماہنامہ کرن، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

کرن ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ خواہشات کی قربانی اور عبادات و اطاعت کا مہینہ ہے۔ نیکی و تقویٰ کا مہینہ ہے۔ اس مہینے کا انعام عید الفطر ہے۔

عید کے لغوی معنی خوشی، مسرت و شادمانی اور انعام و اکرام کے ہیں۔ اس انعام کے حق دار وہی لوگ ہیں جنہوں نے روزے اور اس کے اغراض و مقاصد کو پورا کیا۔ تمام مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطہ ارض میں ہوں یہ دن عبادت، اجتماعی خوشی، عقیدت اور پوری تعظیم سے مناتے ہیں۔ عید ایک طرف قلبی مسرت اور روحانی انبساط پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف تعلقات اور محبت کو بھی گہرا کرتی ہے۔ اسلام چونکہ دین مساوات و مواخات ہے اس لیے اسلام نے ہر موقع پر غریبوں اور مسکینوں کا خیال رکھا ہے اور انہیں بھی عید کی خوشیوں میں شامل کرنے کے لیے صدقۃ الفطر کو واجب قرار دیا ہے۔ تاکہ غریب و نادار لوگ بھی اپنی ضروریات سے بے فکر ہو کر عید کی خوشیوں میں شامل ہو جائیں۔

صحیح معنوں میں عید وہی ہے جب سب مسرور ہوں۔ امیر غریب کی تخصیص نہ ہو۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقدس تہوار کی فضیلت سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ادارہ کرن کی طرف سے قارئین کو عید مبارک۔

اس شمارے میں،

- "عید پھر آگئی" عید کے موقع پر اداکاروں سے دلچسپ سروے،
- اداکار "نبیل" قارئین کی عدالت میں،
- "مجھ سے ملیے" فوزیہ یاسمین کی باتیں،
- "آواز کی دنیا سے" ایف ایم 105 کی پریزنٹر "ہما کاشف" کی باتیں،
- ایف ایم 104 کے پریزنٹر "علی سید" کی نایاب جیلانی سے گفتگو،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول،
- "او دیسی پیا" نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول،
- "من کا ملے تو اچھا" انیلا کرن کا مکمل ناول،
- "سو ہراتے جاتی" فرحانہ ناز ملک کا دلچسپ مکمل ناول،
- "رودادِ قفس" بیں روشنی بخاری کا دلچسپ ناولٹ،
- "تاباں ہے چاند رات" نازیہ جمال کا ناولٹ،
- صباحت یاسمین، عقیلہ ہاشمی، عائشہ نصیر اور سمیرا حمید کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

تحفہ،

کرن کتاب "عید الفطر اور آپ" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

ہر اک شے پہ اُس کا کرم دیکھتے ہیں
بصیرت کی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں

پکارا اُسے مرکزِ دل سے جس دم
معاً اپنی پلکوں کو نم دیکھتے ہیں

انہیں عالم الغیب پر کیا بھروسا
جو ہر بات میں جامِ جم دیکھتے ہیں

نہیں ہم ہیں مایوس رحمت سے اُس کی
فلک کی طرف دم بدم دیکھتے ہیں

ہوا سر فگندہ جو رحماںؑ کے در پر
جہاں میں اُسے محترم دیکھتے ہیں

چمن میں نوا سنجیاں پھول نے کیں
شیاطیں کو مصروفِ غم دیکھتے ہیں

تنویر پھول

نعت رسول مقبول ﷺ

تیرا کرم ہے بیکراں، سیدِ کون و مکاںؐ
تُوؐ آسماں ہے آسماں، سیدِ کون و مکاںؐ

ہے منبعِ الطاف و کرم تیری اک نظر
تُوؐ مہرباں ہے مہرباں، سیدِ کون و مکاںؐ

تُوؐ اماناتوں کا امیں ہے میرے رسولؐ
تُوؐ رازداں ہے رازداں، سیدِ کون و مکاںؐ

تُوؐ خاتم النبیینؐ ہے تُوؐ خاتم الرسلؐ
تُوؐ خاتم الزماں ہے زماں سیدِ کون و مکاںؐ

جہاں پہ ہو نامِ خدا، جہاں پہ ہو ایماں
تُوؐ وہاں پہ ہے وہاں، سیدِ کون و مکاںؐ

آصف بشیر انجم

نبیلہ عزیز

دردِ دل

۱۳

تیرہویں قسط

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابا اقبال مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے …

فاطمہ ہر دو منٹ کے وقفے سے گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا رہی تھی اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے وہ جلد از جلد مریم کے گھر پہنچنا چاہتی تھی اور اس سے بھی زیادہ جلدی جودت کو تھی وہ بھی جلد از جلد اپنی منزل پہ پہنچنا چاہتا تھا' اس کی منزل اس سے دور نہیں تھی اور یہی سرشاری اس کی روح کو معطر کیے دے رہی تھی وہ بائیک ڈرائیو کرتے ہوئے بھی جھوم رہا تھا۔ اگلے دس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد فاطمہ کی گاڑی نے دائیں طرف ٹرن لیا تھا اور اس کے پیچھے جودت کی بائیک نے بھی...!

پہلی دو گلیاں کافی کشادہ تھیں اس لیے فاطمہ کی کار با آسانی تنگ گلی کے کونے تک آگئی تھی اور گلی کے کونے پہ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ تیزی سے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی اور انتہائی عجلت سے گاڑی لاک کرکے بائیں سائیڈ والی گلی میں مڑ گئی۔ البتہ جودت کو بائیک سے اترنے کی ضرورت نہیں تھی وہ بائیک سمیت ہی اس گلی میں جا سکتا تھا اس لیے بائیک کی اسپیڈ کم رکھتے ہوئے وہ بھی اسی گلی میں مڑ گیا تھا بائیک کسی اور کی لے کر آیا تھا اور سر پہ ہیلمٹ چڑھا رکھا تھا اس لیے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

فاطمہ اس گلی کے پانچ یں نمبر والے گھر کا دروازہ دھڑا دھڑ پیٹ رہی تھی اور جودت کی نظریں اس کے تعاقب میں اس دروازے تک گئی تھیں اور وہیں پہ ٹھہر گئی تھیں۔ گھر کی دیوار میں دروازے کے قریب ہی چھوٹی سی نیم پلیٹ نصب تھی' جس پہ بے رنگ اور دھندلے دھندلے سے لفظوں میں گھر کا ایڈریس اور "فاروق نیازی" کا نام لکھا ہوا تھا۔

جس کو پڑھنے کے بعد اس کی باقاعدہ تسلی ہو گئی تھی اور وہ بائیک کو کک لگا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے حواس باختہ ہو کر ان کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا ہو' مریم ابھی ابھی مغرب کی نماز پڑھ کے فارغ ہوئی تھی امی اور ایمن نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگنے میں مصروف تھیں اس لیے ایمان ذرا فاصلے تھی اسی نے آگے بڑھ کے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیکن سامنے فاطمہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"فاطمہ آپی' آپ...؟" اس نے بدحواس سی فاطمہ کو حیرت اور الجھن سے دیکھا تھا۔

"عدیل کہاں ہے...؟ مریم کہاں ہے...؟ سب ٹھیک تو ہیں نا...؟ کیا ہوا ہے گھر میں..." فاطمہ [illegible] کو دھکیل کر سیدھی اندر آئی تھی اور بدحواسی سے کئی سوال ایک ساتھ پوچھ ڈالے تھے عدیل جو [illegible] اپنے گھر کے صحن میں کسی کی بلند آواز سن کر وہ بھی نیچے اتر آیا تھا لیکن فاطمہ کی حالت دیکھ کر ٹھٹک [illegible] عدیل کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر لپک کے قریب آئی تھی۔

"تم... تم ٹھیک ہو نا؟" کیا ہوا تھا؟ کیا ہنگامہ ہوا ہے گھر میں' مریم کہاں [illegible] ہے؟ انکل تو ٹھیک ہیں نا۔"

وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر عدیل کا بازو دونوں ہاتھوں میں [illegible] سب کا پوچھ رہی تھی لیکن کیوں پوچھ رہی تھی یہ گھر کے کسی بھی فرد کو سمجھ نہیں آیا تھا [illegible] اس کے ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے مریم کو آنکھ نظروں سے دیکھا تھا۔

"مریم! لگتا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں [illegible] آرام سے بٹھاؤ اور پانی پلاؤ۔" عدیل نے فاطمہ کے ہاتھ پیچھے ہٹا کر مریم کو اشارہ کیا تھا مریم فوراً [illegible] تھی وہ ابھی ابھی جائے نماز سے اٹھی تھی اس کا دوپٹہ چہرے کے گرد ہالے کی صورت میں [illegible] فاطمہ نے عدیل کو دیکھنے کے بعد مریم کو دیکھا تھا ان دونوں کے چہروں پہ حیرانی ضرور تھی لیکن پریشانی [illegible] کھائی نہیں دے رہی تھی جس پہ فاطمہ بری طرح ٹھٹک گئی تھی۔

"[illegible]! آؤ میرے ساتھ۔" مریم نے آگر اس کا بازو تھام لیا تھا لیکن فاطمہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی تھی۔ [illegible] کیا بات ہے... کیا ہوا ہے...؟ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟" [illegible] نے نرمی سے اس کے کندھے پہ دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے [illegible] سے پوچھا اور سامنے کھڑا عدیل بھی [illegible] نظروں سے دیکھ رہا تھا فاطمہ نے گہری سانس کھینچی [illegible] سے اپنا شولڈر بیگ اتارا اور زپ کھول کر اپنا موبائل نکالا اور مسیج اوپن کرکے موبائل عدیل کی [illegible] بڑھا دیا تھا۔ عدیل الجھن آمیز انداز میں اس [illegible] موبائل تھام کے مسیج پڑھنے لگا۔

"فاطمہ! کہاں ہو...؟ کیا تمہیں کچھ خبر نہیں ہے؟ کل رات ہمارے گھر پہ قیامت گزر گئی' میں بہت پریشان ہوں' مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے [illegible] پاس جلدی پہنچو' تمہاری دوست مریم۔"

مسیج پڑھ کے عدیل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"آپ کو یہ مسیج کس نے بھیجا ہے؟" اس کا سوال بھی الجھا ہوا تھا۔

"میں تو یہی سمجھی تھی کہ مریم نے بھیجا ہے؟" فاطمہ اپنی جگہ حیران پریشان اور الجھی سی کھڑی تھی۔

"حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ ہمارے گھر میں فون اور موبائل کی سہولت نہیں ہے۔" عدیل نے اسے ایک اور غلطی کا احساس دلایا تھا۔

"مگر پریشانی میں مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ آپ لوگوں کے پاس موبائل فون ہے یا نہیں...؟ مجھے تو یہ پڑھ کر شاک لگا تھا کہ کل رات آپ کے گھر پہ کوئی مصیبت گزر گئی ہے۔ میں نے [illegible] وقت کا احساس کیا اور نہ ہی یہ جاننے کی زحمت کی کہ نمبر کس کا ہے؟" فاطمہ پریشانی سے کہتی دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"[illegible] کوئی قدم اٹھانے سے پہلے جاننے کی زحمت ضرور کرلینی چاہیے' شام کا وقت ہے اندھیرا گہرا ہو رہا ہے' اور آپ اکیلی عورت ذات ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئیں' وہ بھی صرف ایک مسیج پڑھ کے؟ سوچیے اگر آپ کو کوئی حادثہ پیش آجاتا تو...؟" عدیل نے اسے سخت لہجے میں سمجھایا تھا اور فاطمہ اس کی بات کی گہرائی جان کر خاموش سی ہو گئی تھی وہ واقعی سچ ہی تو کہہ رہا تھا آج کل ملک اور شہر کے حالات ہی ایسے تھے کہ دن کے وقت گھر سے نکلنا محال ہوتا تھا یہ تو پھر شام کا وقت تھا۔

"بھائی! آرام سے بات کریں نا' وہ پہلے ہی اتنی پریشان ہے' نہ جانے کس خبیث نے یہ گھٹیا مذاق کیا ہے۔" مریم نے عدیل کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔

"میں بھی ان محترمہ کے لیے ہی بات کر رہا ہوں۔ اگر خود ان پہ کوئی مصیبت آجاتی تو؟" عدیل ہنوز سخت سست سنا رہا تھا اور اس بار فاطمہ نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا تو نظریں مسکرا رہی تھیں۔

"کاش کہ کوئی مصیبت آہی جاتی تو اچھا تھا کم از کم آپ میرے لیے پریشان تو ہوتے رہتے۔" اس نے دل میں آئی بات زبان کی نذر کر ڈالی تھی اور عدیل اس کی بات پہ بری طرح سٹپٹا گیا تھا اس نے بے ساختہ مریم کی سمت دیکھا تھا مریم اپنی مسکراہٹ دبا کر چہرہ جھکا گئی تھی۔

"اتنی فرصت نہیں ہے میڈم کہ دوسروں کے لیے بھی پریشان ہوتے پھریں۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"دوسرے بھی تو آپ کے لیے پریشان ہوتے ہیں مسٹر عدیل عمر؟" اس نے پیچھے سے آواز دے کر کہا تھا۔

"دوسروں کو ہم نے نہیں کہا کہ ہمارے لیے پریشان ہوتے رہیں' اپنے لیے پریشان ہونے کے لیے ہم خود ہی کافی ہیں۔" وہ پلٹ کر اسے جواب دیتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور فاطمہ نے گردن موڑ کر مریم کو شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"اچھے بھائی صاحب کی باتیں سن رہی ہو۔ ؟ پھر تم مجھے الزام دیتی ہو کہ میں ایسا ویسا کہہ جاتی ہوں۔" فاطمہ مریم کو گھور رہی تھی اور مریم بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"ارے بابا! نہیں دیتی الزام بھائی واقعی غلط کہہ رہے ہیں۔ میں بات کروں گی ان سے' اٹھو تم اندر آجاؤ' یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو؟" مریم اس کی طرف داری کرتے ہوئے بولی اور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اندر کمرے میں لے آئی تھی۔

"ایمان! فاطمہ کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔" مریم نے کمرے سے ہی آواز دی تھی فاطمہ بے دھیانی میں عدیل کے بستر پہ ہی ٹک کر بیٹھ گئی اور مریم نے اس کے سامنے کرسی کھینچ لی تھی۔ اتنے میں ایمان چھوٹی سی ٹرے میں پانی کا گلاس لے آئی تھی۔ فاطمہ نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے ایمان کو تھینکس کہا تھا۔

"ہاں اب بولو کیا مسئلہ ہوا ہے؟" مریم نے تحمل سے پوچھا تھا۔

"یار! میں یونیورسٹی گئی ہوئی تھی یونیورسٹی سے آف ہوا تو لائبریری چلی گئی وہاں اتنا ٹائم گزرا کہ احساس ہی نہ ہوا' ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچی تھی' شاور لیا' اور کپڑے چینج کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ تمہارا میسج۔ میرا مطلب ہے کہ یہ میسج ملا اور میسج پڑھنے کے بعد تو مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ میں فوراً گاڑی لے کر گھر سے نکل آئی۔" فاطمہ نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

"لیکن فاطمہ یہ بھی تو سوچو تمہارے ساتھ یہ مذاق کس نے کیا ہوگا۔ ؟ کون ہے جو تمہاری اور میری دوستی کو جانتا ہے اور میرا نام لے کر تمہیں بلیک میل کر رہا ہے' یہ تو سراسر دھوکے کا کیس ہے یار' تم اس نمبر کی چھان بین کرواؤ۔" مریم نے اسے مشورہ دیا ہے۔

"وہ تو میں ضرور کرواؤں گی' لیکن یار بات پھر وہیں پہ آجاتی ہے کہ آخر میرے ساتھ یہ مذاق کیوں اور کس لیے کیا ہے۔ ؟

کس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ ؟ آخر مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" فاطمہ خود بھی الجھ رہی تھی اور اسی الجھے الجھے دھیان میں مریم کا خیال اس لڑکے کی سمت چلا گیا جسے فاطمہ کا بھائی جودت کے نام سے بلا رہا تھا اور اسی جودت نامی لڑکے کی نظریں پورے فنکشن میں مریم پہ ہی جمی رہی تھیں وہ سب سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتا رہا تھا۔ کہیں یہ سب اس کا کارنامہ تو نہیں تھا۔ ؟ مریم نے بے اختیار سوچا تھا اور بالکل صحیح سوچا تھا لیکن وہ اپنی اس سوچ کا اظہار فاطمہ کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ تو تم چھان بین کرواؤ گی تو مقصد کا پتا چلے گا۔ خیر تم کچھ دیر یہیں رہو اور کھانا کھا کر جانا۔" مریم سر جھٹک کر کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے نہیں یار! میں نے لنچ کافی لیٹ کیا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے' اب تو نائٹ ہی کھانا کھاؤں گی' البتہ آپ لوگوں نے کھانا کھانا ہے تو کھالیں میں ابھی یہیں رکتی ہوں' سائم کو فون کرتی ہوں وہ مجھے پک کرلے گا۔

فاطمہ اب خود بھی اکیلی واپس نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے وہیں ٹھہری تھی۔

"زیادہ نہ کھاؤ' تھوڑا سا کھالو۔" مریم نے اصرار کیا۔

"نہیں یار! مائنڈ مت کرنا' میرا موڈ نہیں ہے کھانے کا۔" فاطمہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا مریم چپ ہو گئی۔

"تم بیٹھو میں سائم کو فون کرلوں۔" اس نے اپنے بیگ سے دوبارہ موبائل نکالا اور سائم کا نمبر ڈائل کیا تھا لیکن

اس کا نمبر بزی جا رہا تھا۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے خفگی سے موبائل سائیڈ پہ رکھ دیا تھا لیکن موبائل رکھتے ہوئے بھی اس کی نظر عدیل کے تکیے کے نیچے سے جھانکتی کسی چمکتی ہوئی چیز پہ جا پڑی تھی اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر وہ چیز باہر نکالی اور بیگ کھول کر کے لیڈیز گلاسز دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"لیڈیز گلاسز۔ ؟ عدیل عمر کے تکیے کے نیچے۔ ؟" وہ گلاسز کو حیران پریشان دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسی ہی کیفیت مریم کی بھی ہوئی تھی اسے بھی یہ گلاسز دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"یہ کس کے گلاسز ہیں۔ ؟" فاطمہ نے ڈائریکٹ مریم سے پوچھا تھا۔

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔ ؟"

مریم کی آواز بھی قدرے کھوئی ہوئی تھی۔

"او تو مسٹر عدیل عمر کا کسی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے؟" فاطمہ نے خود سے ہی اندازہ لگایا تھا۔

"بھائی کا کسی کے ساتھ چکر کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ ؟" مریم بے یقین بھی تھی۔

"تو پھر یہ کس محترمہ کے ہیں۔" فاطمہ نے چڑ کر گلاسز اس کے سامنے لہرائے تھے۔

"یہ تو وہی جانتے ہیں کہ یہ کس کے ہیں' لیکن جس کے بھی ہیں کافی خوبصورت اور اسٹائلش ہیں۔" مریم نے تعریف کی اور فاطمہ نے اسے مزید گھور کے دیکھا تھا۔

"اسٹائلش لڑکیاں ہی اسٹائلش گلاسز پہنتی ہیں لہٰذا تم یہ نہ سوچو کہ صرف گلاسز ہی اسٹائلش ہیں بلکہ یہ بھی سوچو کہ ان کو پہننے والی لڑکی بھی ماڈرن اور اسٹائلش ہے' اور وہ کون ہے؟ یہ بھی پتا کرو۔" فاطمہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"میں بھلا کیسے پتا کر سکتی ہوں؟"

"تو کیا میں پتا کروں؟"

"تو کرلو۔"

"ہونہہ! میں کروں گی تو پتنگے لگ جائیں گے تمہارے بھائی کو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی تھی۔

"تمہیں بھی تو لگ رہے ہیں۔" مریم نے چھیڑا۔

"میرا مشورہ مانو تو یہ گلاسز اپنے ساتھ لے جاؤ' ان کی انویسٹی گیشن کرواؤ کہ آخر یہ کس حسینہ کے ہیں۔ کون اپنے چمکتے دمکتے نئے نکور گلاسز میرے بھائی کے تکیے کے نیچے چھوڑ گئی ہے؟ آخر کس کی رسائی ہوئی یہاں تک ہے۔ ؟" مریم مسکرا کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اتنے میں عدیل بھی واپس آگیا تھا اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کی ڈیڑھ لیٹر کی دو بوتلیں تھیں کوک اور اسپرائیٹ اس نے دونوں بوتلیں مریم کی سمت بڑھا دیں۔ مریم سمجھ گئی تھی کہ وہ فاطمہ کے لیے ہی لے کر آیا ہے۔

"نو تھینکس! اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے' میں گھر جا رہی ہوں۔" فاطمہ ہمیشہ کی طرح عدیل کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"گھر۔ ؟ مگر تم اکیلی گھر کیسے جاؤ گی۔ ؟" مریم ٹھٹک گئی۔

"چلی جاؤں گی کچھ نہیں ہوتا۔"

اس نے تنک کے جواب دیا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم بیٹھو عدیل تمہیں چھوڑ آتا ہے۔"

عدیل کی امی نماز پڑھ کے فارغ ہو چکی تھیں فاطمہ کا سارا مسئلہ وہ ایمان کی زبانی سن چکی تھیں اس لیے فاطمہ کو

اکیلے جانے سے روک دیا تھا جس پہ عدیل نے ایک بار پھر سٹپٹا کے دیکھا تھا۔

"نہیں آنٹی! میں چلی جاؤں گی خوامخواہ کسی کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟" اس نے انکار کر دیا۔

"ارے بیٹا! تم ہماری پریشانی میں یہاں تک چلی آئی ہو تو کیا ہم تمہیں اسی طرح واپس بھیج دیں۔؟ جاؤ بیٹا فاطمہ کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔"

انہوں نے اشارہ کیا اور عدیل سب کے سامنے ماں کے حکم سے انکار نہ کر سکا اور خود بخود ہی قدم باہر دروازے کی سمت بڑھا دیے تھے۔

"جاؤ! مر واب۔؟" مریم نے فاطمہ کو اس کے پیچھے دھکیلا اور فاطمہ اپنے دل کی خوشی دل میں دباتی عدیل کے پیچھے گلی میں نکل آئی تھی وہ کافی سست قدم اٹھا رہا تھا جبکہ فاطمہ کے قدم بہت فریش اور سرشار سی کیفیت کی نشاندہی کر رہے تھے وہ بڑی خوشی خوشی اس کے برابر قدم اٹھا رہی تھی اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر عدیل رک گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ گاڑی کا لاک کھولے لیکن فاطمہ نے چابی اس کی سمت بڑھا دی تھی۔

"مجھ سے ڈرائیو نہیں ہو گی۔ تم ڈرائیو کرو۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"آئیم سوری! میں نہیں کر سکتا۔ آپ خود کریں۔" اس نے چابی تھامنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا بلکہ گردن نفی میں ہلا کر انکار کر دیا تھا۔

"میں خود تو کر لوں مگر ڈر ہے کہ ایکسیڈنٹ کروں گی تمہارے ہوتے ہوئے میرا دھیان کسی اور طرف ذرا کم ہی جائے گا۔" اس نے کندھے اچکا کر لاپروائی ظاہر کی۔

"دیکھیے! یہ وقت یہاں کھڑے ہو کر باتیں بنانے کا نہیں ہے۔ گاڑی نکالیں اور شرافت سے گھر چلیں۔" عدیل نے اسے خفگی سے اشارہ کیا تھا۔

"تم ڈرائیو کر لو تو ٹھیک ہے ورنہ یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا بھی برا نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور عدیل نے زچ ہو کر اس کے ہاتھ سے چابی جھپٹی اور لاک کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا فاطمہ جلدی سے لپک کے دوسری سائیڈ پہ آئی تھی اور فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی عدیل نے گاڑی بیک کی اور واپسی کے لیے مین روڈ پہ ڈال دی فاطمہ اسے اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی وہ لوگ کافی راستہ طے کر [illegible] فاطمہ کو کوئی خیال چھو کے گزرا تھا۔

"اک بات پوچھوں تم سے؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"پوچھیں۔" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے اجازت دی۔ اور فاطمہ [illegible] کے لیے ٹھہری گئی تھی۔

"پوچھیے فاطمہ صاحبہ؟" اس کی چپ پہ عدیل نے اسے خود متوجہ کیا تھا۔

"وہ گلاسز کس کے ہیں؟" آخر کار پوچھ ہی ڈالا۔

"گلاسز؟" وہ سمجھا نہیں تھا۔

"وہی گلاسز جو تمہارے بستر کے تکیے کے نیچے بڑی احتیاط سے رکھے ہیں اور یقیناً ان کی وجہ سے تم تکیے پہ سر رکھ کے نہیں سوتے ہو گے کہ کہیں وہ گلاسز ٹوٹ ہی نہ جائیں۔؟" فاطمہ نے اسے گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے کہا تھا اور عدیل ان "گلاسز" کا خیال آتے ہی مسکرا دیا تھا اس کے خیال کے پردے پہ مدیحہ کا عکس ابھرا اور پر غرور سا سراپا لہرا گیا تھا۔

"کیوں مسکرا رہے ہو؟"

"بس آپ نے کسی کی یاد دلا دی اور میں مسکرا دیا۔" اس نے شانے اچکائے۔

"کون ہے وہ لڑکی۔" فاطمہ کی آواز جیسے کسی پاتال سے سنائی دی تھی۔

"بتانا ضروری نہیں ہے۔" اس نے ٹال دیا۔

اس کے جواب پہ فاطمہ کا دل مزید جل کر رہ گیا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ اتنی خوش تھی اور ابھی پل بھر میں ہی اس کی خوشی غارت ہو گئی تھی۔

"یعنی آپ چھپا رہے ہیں؟" وہ دوبارہ سے "تم" سے "آپ" تک آ گئی تھی۔

"ایسی باتیں چھپانے والی ہی ہوتی ہیں۔" وہ جانے کیوں محظوظ ہو رہا تھا اور فاطمہ چپ کی چپ رہ گئی تھی اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا عدیل نے اس کے گھر کے سامنے بریک لگائے تھے اور فوراً سے پیشتر گاڑی سے اتر گیا تھا۔

"میری ذمہ داری آپ کو گھر تک چھوڑنے کی تھی میں نے آپ کو گھر تک چھوڑ دیا ہے اب آپ جا سکتی ہیں۔" وہ گھوم کے دوسری طرف آیا تھا اور فاطمہ کی سائیڈ پہ کھڑکی کی سمت جھکتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ جواباً کچھ بھی نہ بولی۔

"اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا لیکن چند قدم دور جا کر دوبارہ واپس مڑ آیا تھا۔

"ویسے آپ کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے میرا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں چل رہا میرا دامن بھی صاف ہے اور ہاں وہ گلاسز کس میڈم کے ہیں؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا امانت ہیں کسی کی واپس لوٹانے ہیں۔" اس نے کھڑکی میں جھکتے کہا اور دوبارہ واپس چلا گیا تھا۔

"آٹو۔" اس نے رکشے والے کو اشارہ کیا تھا اور اگلے پل وہ رکشا میں سوار ہو گیا تھا۔ فاطمہ تعجب سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر ذرا تسلی ہوئی تو مسکرا اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے پلان کی کامیابی پہ سرشار سا تھا تبھی گنگناتا ہوا کی چین گھماتا سیڑھیاں چڑھ کے سائم کے فلیٹ کے سامنے آ رکا تھا اور بڑی ترنگ میں دستک دی تھی سائم نے اسے ہول سے دیکھ لیا تھا اسی لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

"ہیلو ایوری باڈی۔" اس نے اندر داخل ہو کر ہاتھ ہلایا تھا۔

"ہائے! کہاں تھے تم؟" مائلہ لپک کے اس کے قریب آئی تھی اور دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال دیے تھے۔

"لگتا ہے تم مجھے بہت مس کر رہی تھیں؟" وہ مائلہ کے سلکی شولڈر کٹ بالوں کو چھیڑتے ہوئے بولا تھا۔

"آف کورس یار۔ تمہارے بغیر میں ہمیشہ ہی بور ہوتی ہوں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"چلو پھر تم لوگوں کی بوریت دور کرتا ہوں۔"

"ہیں؟ وہ کیسے۔۔؟" وہ سب کورس میں بولے تھے۔

"شیشہ کلب چلتے ہیں پارٹی میری طرف سے۔"

"پارٹی؟ مگر کس خوشی میں؟" یہ سوال کاشی کا تھا۔

"خوشی کا بھی پتا چل جائے گا پہلے تم لوگ تو چلو۔" سبھی لڑکے لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جودت کی دعوت پہ یہ قافلہ سیدھا شیشہ کلب پہنچا تھا کبھی کبھی وہ سب دوست اگر خوش اور موڈ میں ہوتے تو ایک دوسرے کو شیشہ پینے کی (جو کہ ایک قسم کا نشہ ہے) دعوت دیتے تھے اور اس وقت بھی وہ لوگ جودت کی دعوت پہ اس ٹھکیے سے

اندھیرے والے کیبن میں بیٹھے شیشہ پی کر مسرور ہو رہے تھے جووت اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شیشہ شیئر کر رہا تھا اور کاشی اور سائم وغیرہ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ شیئر کر رہے تھے۔

"ہوں! اب بولو کس خوشی میں دعوت دی ہے۔۔۔؟" سائم نے ذرا سا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا اور جووت کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا۔

"میں نے مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا کر لیا ہے۔" اس نے سائم کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا سائم اسے ششدر سا دیکھ رہا تھا۔

"مریم کے گھر کا پتا۔۔؟"

"جی ہاں! مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا۔" اس نے دہرا کر اور زور دے کر کہا تھا البتہ چہرے پہ فتح مندی کا سرشار سا احساس بکھرا ہوا تھا۔

"مگر کیسے۔۔؟" سائم کو بے چینی ہوئی تھی۔

"کیسے کو چھوڑو، بس میری کامیابی پہ مبارک باد دو مجھے۔" جووت سرشاری سے بولا۔

"لیکن جووت تم۔۔۔"

"بس یار بس! کوئی نصیحت نہیں اور کوئی ہدایت نہیں، بس اب صرف یہ سوچو کہ جووت آفندی، مریم فاروق نیازی سے ملاقات کیسے کرے گا۔؟ ملاقات، مطلب ملنا، سمجھ گئے نا تم۔۔؟" وہ ذو معنی لہجے میں کہہ رہا تھا اور سائم چپ سا ہو گیا، جووت آفندی واقعی بہت خبیث ثابت ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح گیارہ بجے کا وقت تھا جب وہ سو کر اٹھی تھی۔

اے سی کی کولنگ کی وجہ سے وہ کافی گہری اور سکون کی نیند لے کر بے دار ہوئی تھی لیکن باہر آگ اگلتے سورج نے حشر اٹھا رکھا تھا تیز دھوپ لوگوں کے سروں پہ چڑھ کے ناچ رہی تھی اور اس دھوپ اور گرمی کو برداشت کرنے والوں کا برا حال تھا اس نے ذرا کی ذرا کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں جبھی [illegible] پیشتر وہ دوبارہ واپس گرا دیا تھا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں انگڑائی لیتی ہوئی شاور لینے کے لیے [illegible] کے بعد موڈ فریش ہوا تو تیار ہو کر نیچے آ گئی تھی اتنے میں ہاتھ میں پکڑا سیل بج اٹھا تھا اس نے [illegible] دیکھا تو مسکرا کر منہ بنا لیا تھا۔

"سوری جیوزی اس وقت بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کال ڈس کنیکٹ کرتے ہوئے دل ہی دل میں جیوزی سے معذرت کی تھی اور باقی کی دو تین سیڑھیاں بھی اتر آئی۔

"گڈ مارننگ۔" اس نے سامنے سے آتے نبیل کو فریش انداز میں [illegible]

"مارننگ۔" وہ کافی سنجیدگی اور کافی آہستگی سے کہہ کر [illegible] گزر کے اوپر چلا گیا تھا جس پہ مدیحہ کو بے حد اچنبھا ہوا تھا اس نے حیرانی سے مڑ کر نبیل کی پشت کو دیکھا تھا [illegible] وہ بغیر کچھ کہے پاس سے کیوں گزر گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایسا نہیں تھا، وہ تو پاس ٹھہر کر حال چال پوچھنے اور پیار کرنے والا آدمی تھا۔ یقیناً" کچھ ہوا تھا اسے جو وہ اس طرح چپ چاپ گزر گیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے آخر۔۔؟ اب تو میں نے کوئی کچھ نہیں کیا، جس کا انہیں غصہ ہو گا۔" وہ سوچتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"مام۔۔! وہ نبیل بھائی کو کیا ہوا ہے۔؟ وہ اتنے چپ۔۔۔" کہتے کہتے اچانک اس کی نظر دائیں طرف کے صوفے کی

سمت اٹھی تھی اور منہ کے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے تھے بلیک لیدر کے ون سیٹر صوفے پہ اس کے والد محترم ممتاز حیات بڑے شاہانہ انداز میں براجمان تھے جن کو دیکھ کر مدحیہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے وہ گڑھے کھڑے سپاٹ پتھر کی مورت بن گئی تھی۔

"کیسی ہو بیٹا۔؟ کیا دیکھ رہی ہو۔؟" انہوں نے اسے یوں مخاطب کیا جیسے روز صبح کا معمول ہو جیسے ڈیڑھ سال بعد ملنا تو کوئی خاص معنی نہ رکھتا ہو۔ مگر ان کے مخاطب کرنے پہ مدحیہ کے اندر غم و غصے سے ابال اٹھنے لگے تھے اس کا چہرہ نفرت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ نظروں میں کئی ایسے مناظر گھوم گئے تھے جن کی وجہ سے اس کا فشار خون بلند ہونے لگا تھا اور شدت ضبط سے اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لی تھیں اور ایسی کیفیت میں بہتر تھا کہ وہ وہاں سے چلی جاتی۔

"مدحیہ! سلام کرو اپنے بابا کو؟" وہ واپس پلٹ رہی تھی جب فائزہ بیگم کی آواز پہ اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"ایم سوری مام! سلام کا مطلب ہوتا ہے کسی پر سلامتی بھیجنا جو میں نہیں بھیج سکتی اور ویسے بھی سلام اسے کیا جاتا ہے جسے سلام کا پتا ہو۔" نفرت اور حقارت اس کے لب و لہجے سے ہی امڈ رہی تھی۔ فائزہ بیگم اس کے جواب پہ سٹپٹا کر رہ گئیں جبکہ ممتاز حیات کے چہرے پہ غصے کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"مدحیہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔؟ تمیز سے بات کرو بابا ہیں تمہارے۔" انہوں نے بیٹی کو سرزنش کی تھی جس پہ مدحیہ کو اور بھی تپ چڑھ گئی تھی۔

"ہونہہ سوئٹ مام! بہت بھولی، بے وقوف اور نادان عورت ہیں آپ، ہر ڈیڑھ دو سال بعد تھکن اتارنے کے لیے گھر آجاتے ہیں تو آپ عزت، احترام اور تمیز کے ساتھ ان کی خدمتوں میں لگ جاتی ہیں کبھی ان سے یہ بھی تو پوچھ لیا کریں کہ وہ دو سال یا ڈیڑھ سال کہاں اور کن کاموں میں گزار کے آتے ہیں؟ یا پھر آپ یہ ہی پوچھ لیا کریں کہ یہ عزت، احترام اور تمیز کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔" وہ نفرت سے طنزیہ اور استہزائیہ انداز پہ اتر آئی تھی۔

"مدحیہ!" ممتاز حیات یک دم دھاڑ اٹھے تھے لیکن یہ بھول گئے تھے کہ مقابل ان کی اپنی ہی اولاد ہے جو ڈرنے والی یا جھکنے والی ہرگز نہیں تھی۔

"مسٹر ممتاز صاحب! آہستہ آواز میں بولیے ورنہ مجھے آپ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولنا آتا ہے۔" وہ انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولی تھی۔

"مدحیہ! یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو اپنے بابا کے ساتھ۔" فائزہ بیگم بھی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"پلیز مام! مجھے بار بار یہ احساس مت دلائیں کہ یہ میرے بابا ہیں، مجھے نفرت ہو رہی ہے یہ سوچ کر کہ میں ان کی اولاد ہوں گھن آتی ہے اپنے آپ سے بھی ڈیڑھ سال ہو گیا ہے مجھے اپنے آپ سے لڑتے ہوئے ڈیڑھ سال سے جل رہی ہوں، صرف یہ سوچ سوچ کر کہ میں اس انسان کی اولاد ہوں اور اس کا گھٹیا اور گندہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔" وہ کہتے کہتے یک دم پھٹ پڑی تھی اور فائزہ بیگم [illegible] رہ گئیں۔

"بد تمیز، بے ہودہ لڑکی، تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم اپنے باپ کے بارے میں بات کرو۔" وہ اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے قریب آئے تھے۔ مگر وہ بھی پیچھے ہٹنے کی بجائے ان کے سامنے ڈٹ کے کھڑی رہی۔

"میں آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے اپنی توہین محسوس کرتی ہوں، آپ کی عزت میری نظر میں ڈیڑھ سال پہلے کینیڈا کے ایک ہوٹل کی راہداری میں ختم ہو گئی تھی اسی روز میں نے آپ پہ فاتحہ پڑھی تھی، مر گئے تھے آپ میرے لیے، آپ کی عزت، آپ کا وقار، آپ کا احترام سب مر گیا تھا اس روز۔۔۔ اور یقیناً آپ کو خبر ہو گی کہ مرے ہوئے جذبات، مرے ہوئے احساسات اور مرے ہوئے انسان زندہ نہیں ہوتے؟ آپ بھی مر گئے ہیں، سمجھے آپ؟" وہ یک دم اونچی آواز میں دھاڑی تھی۔

"اسٹاپ اٹ! جسٹ اسٹاپ اٹ۔" انہوں نے جواباً غراتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن اچانک نبیل سامنے آگیا تھا۔

"پلیز بابا! اسٹاپ یور سیلف۔ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"آپ ان کو کرنے دیں، میں بھی دیکھتی ہوں کہ کیا کرتے ہیں، ڈیڑھ سال سے انتظار تھا اس گھڑی کا کہ کبھی میرا اور ان کا بھی سامنا ہو۔" مدحیہ یک دم دوبارہ سامنے آئی تھی۔

"مدحیہ پلیز! اپنے بیڈ روم میں جاؤ۔" نبیل نے اسے پیچھے ہٹایا۔

"ہرگز نہیں! میں آج ان کو آئینہ دکھا کر ہی جاؤں گی، آخر ان کو پتا تو چلے کہ وہ کس حد تک گر چکے ہیں؟" وہ اونچی اور بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ نبیل نے اسے بازوؤں میں گھیرتے ہوئے بمشکل پیچھے کھینچا تھا۔ وہ عجیب جنونی سی ہو رہی تھی اس کا انداز ہذیانی سا تھا۔

"مدحیہ! پاگل مت بنو یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔" نبیل اسے ڈرائنگ روم سے باہر کھینچ لایا تھا۔

"اس انسان کے ساتھ یہی طریقہ ہو سکتا ہے بات کرنے کا، یہ درندہ صفت انسان ہمارا باپ نہیں ہو سکتا۔" وہ چیخ رہی تھی اور نبیل اسے کھینچ کے بیڈ روم تک لایا تھا۔

"بیٹھو یہاں، کیوں پاگل ہو رہی ہو؟ کیا ہوا ہے آخر۔" نبیل نے اسے بیڈ پہ بٹھاتے ہوئے خفگی سے کہا تھا۔

"ان کی اصلیت، ان کا جو روپ میں نے دیکھا ہے وہ آپ نے نہیں دیکھا اسی لیے پاگل ہو رہی ہوں، آپ دیکھ لیتے تو شاید ابھی اسی وقت اس نام نہاد باپ کو اٹھا کر اس گھر سے باہر پھینک دیتے جو ہمارا باپ اور ہماری ماں کا شوہر کہلائے جانے کے لائق نہیں ہے۔" مدحیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ممتاز حیات کو گولی سے اڑا دے۔ اس کے اندر پلنے والی نفرت آج عود کے سامنے آئی تھی۔ وہ حشر اٹھا دینے کے درپے تھی۔ حالانکہ کسی حد تک نبیل حیات بھی اپنے باپ کے کرتوت جانتا تھا۔ مگر جو کچھ مدحیہ دیکھ چکی تھی اگر واقعی نبیل بھی دیکھ لیتا تو جیتے جی مر جاتا یا پھر اپنے باپ کو مار دیتا۔

"یہ شخص اگر ایسا ہے تو میں بھی اسی گندے شخص کی اولاد ہوں میں بھی انہیں دکھاؤں گی کہ عیاش ہونا کیا ہوتا ہے۔" وہ جو منہ میں آ رہا تھا بولے جا رہی تھی۔

"یہ لو پانی پیو۔" نبیل نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی، میرے دل و دماغ میں جلتی آگ اس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔" وہ نبیل کا ہاتھ ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مدحیہ۔" فائزہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے پریشان نظروں سے دیکھا۔

"مام پلیز! مجھ سے کچھ مت کہیے گا، میرا دماغ پہلے ہی ماؤف ہو رہا ہے اور کچھ سنا تو پھٹ جائے گا۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا اور اتنے میں دوبارہ اس کا سیل فون بجا تھا۔ مدحیہ نے پلٹ کر بیڈ سے اپنا سیل اٹھا کر نمبر دیکھا اور اس بار کال ریسیو کرتے ہوئے سیل کان سے لگا لیا تھا۔

"ہائے جیزی! ہاؤ آر یو۔" اس نے بلا خوف و خطر بات کی تھی۔

"ایم فائن، تم سناؤ بار بار فون کیوں کر رہے ہو؟" مدحیہ بات کرتے ہوئے بیڈ روم کے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

"ارے واہ! تم پاکستان آ رہے ہو؟ امیزنگ یار، خوب انجوائے کریں گے، بس جلدی سے آجاؤ، میں بھی بہت مس کر رہی تھی، بہت بور ہو گئی ہے یہاں۔" وہ باآواز بلند کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی فائزہ بیگم اور نبیل ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔ وہ مدحیہ جو ایک نارمل مدحیہ کے روپ میں ڈھل رہی تھی، ممتاز حیات کی

اچانک آر پہ دوبارہ سے پچھلے خول میں اتر گئی تھی۔ نبیل کو بے پناہ اذیت کا احساس ہوا تھا وہ بے بس سا کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عبداللہ کو فون کروں یا نہ کروں؟"

وہ صبح سے اسی ایک کشمکش کا شکار تھا اور یہی سوچے جا رہا تھا اس کا سارا دھیان زری کی طرف تھا اور اسی وجہ سے وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا نہ عبداللہ کے ساتھ اور نہ ہی نبیل حیات کے ساتھ کیونکہ زری ایک کی عزت تھی تو ایک کی محبت۔

دل آور شاہ اپنا رازداں بناتا بھی تو کس کو؟ اس لیے سود و زیاں کا سودا طے کرنا تھا تو خود ہی طے کرنا تھا یہاں اس کے دوستوں کی دوستی کام نہیں آسکتی تھی۔ البتہ اسے دوستی کا بھرم ضرور رکھنا تھا تاکہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دل آور شاہ سے شکایت نہ ہو پائے۔ اور ان ہی کوششوں میں وہ زرین ملک کا دل نیزے کی انی میں پروئے جا رہا تھا۔ دل آور شاہ کا زری کو نظرانداز کرنا زری کے لیے کسی جان لیوا مرض سے کم نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل رات سے اس کا کیا حال ہوا ہو گا؟ اور اسی حال کو مزید جاننے کے لیے وہ عبداللہ یا نگارش بھابھی کو کال کرنا چاہ رہا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا۔ لیکن عبداللہ شاید اس سے بھی زیادہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ جب ہی تو اس کا خود فون آگیا۔ دل آور نے ایک ہاتھ سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی کال ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" عبداللہ ذرا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہمیشہ کی طرح فٹ فائن ہوں، تم اپنی سناؤ، تم فٹ نہیں لگ رہے؟" دل آور نے گاڑی موڑتے ہوئے اپنی بات بھی اپنے مطلب کی سمت موڑی تھی۔

"ہاں یار! بہت ڈپریسڈ ہوں میں۔" عبداللہ نے اعتراف کیا تھا اور دل آور ہمہ تن گوش ہوا تھا کہ آخر ان دونوں بہن بھائی کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ دونوں ہی اسے فون کرنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ بہن نے رات کو کیا تھا اور بھائی نے دن میں۔

"ڈپریسڈ ہونے کی وجہ؟" اس نے بڑے سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وکیل تھا آخر بات پوچھنے کا ڈھنگ خوب جانتا تھا۔

"پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا کل۔" عبداللہ نے بات شروع کی۔

"تو؟"

"تو وہ زری کو پاکستان واپس بھیجنے کا اصرار کر رہے تھے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ زری کی شادی کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے کوئی پرپوزل آیا ہوا ہے۔"

"اوہ! تو یہ ڈپریشن ہے۔" دل آور نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ ڈپریشن کچھ کم نہیں ہے دل آور! بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں ابھی زری کو پاکستان نہیں بھیجنا چاہتا جبکہ وہ ضد پہ اڑے ہوئے ہیں، میری بات سے تو وہ ویسے ہی خار کھاتے ہیں۔" عبداللہ پریشانی کا شکار تھا۔

"کیا بات کی ہے تم نے؟"

"بس میں نے تو یہی کہا ہے کہ میں زری کو اس کے لاسٹ ایگزامز سے پہلے نہیں بھیجوں گا اور اگر بھیجوں گا بھی تو شادی زری کی پسند سے ہوگی ورنہ نہیں ہوگی۔" عبداللہ نے اپنی بات دہرائی۔

"بات تو بڑی انقلاب کی ہے تم نے" مگر کیا یقین ہے کہ تم اس پہ قائم بھی رہو گے؟" دل آور شاہ اس کی ثابت قدمی کا یقین چاہ رہا تھا۔

"دل آور صاحب! میں تمہارا دوست ہوں اور اپنے دوست کو تم بخوبی جانتے ہو گے مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن گستاخی معاف! ایک بات کہنا چاہوں گا تم سے۔" دل آور نے اکڑ کر کہا تھا۔

"کہو۔"

"اپنی بہن کو میرا مطلب ہے کہ زرین ملک کو تم اس کی پسند کی آزادی تو دے رہے ہو اگر یہی آزادی تمہارے لیے مشکل بن گئی تو؟" دل آور ایک بک شاپ کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے ایک پوائنٹ کی بات پوچھ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں! زرین ملک میری بہن ہے میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں وہ میری بساط سے زیادہ پاؤں نہیں پھیلائے گی وہ خود تو مشکل میں پڑ سکتی ہے لیکن میرے لیے مشکل کھڑی نہیں کر سکتی۔ جو کہوں گا وہ مانے گی۔" عبداللہ کے لہجے میں یقین تھا۔

"ہوں! یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن کسی کے دل کا حال تو کوئی بھی نہیں جانتا کبھی کبھی کسی کی پسند پوری کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔"

"جو کام ہم اپنے لیے کر سکتے ہیں وہ بہن اور بیٹیوں کے لیے بھی کر سکتے ہیں میں ہائر اسٹڈی کے لیے انگلینڈ آیا تھا اور زری کی بھی خواہش تھی کہ وہ ہائر اسٹڈی کے لیے جائے سو دیکھ لو میں نے اس کی خواہش پوری کی ہے اس کے لیے مجھے اپنی ساری فیملی کی مخالفت مول لینی پڑی تھی میں نے لے لی اور دیکھ لینا اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہو گا۔" عبداللہ کی بات اور لہجے کی مضبوطی سے دل آور کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ زری کے لیے ڈٹ جائے گا لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ زری کسی اور کی پسند تھی اور پسند کسی اور کو کرتی تھی۔ عبداللہ کو اگر پتا چلتا تو وہ کس کا ساتھ دیتا۔ زری کا یا پھر نبیل کا؟ فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا۔

اس نکتے پہ اگر سوچا بھی جاتا تو دماغ شل ہو جاتا تھا اور دل آور اکثر اس سارے معاملے سے دامن بچا کے گزر جاتا بات زری کی ہوتی یا نبیل کی وہ اکثر نظرانداز کر جاتا تھا۔

"ان شاء اللہ! اللہ بہتر کرے گا تم زیادہ ٹینشن مت لو۔" وہ اس کے ساتھ موبائل پہ بات کرتا ہوا گاڑی سے نکل آیا تھا۔

"یار! ٹینشن تو ہوگی سارا معاملہ ہی بہت سنگین ہے اب دیکھو کہ اگر ایگزامز کے بعد زری پاکستان جاتی ہے تو بابا جان کی یہی کوشش ہوگی کہ وہ اس کی جلد سے جلد شادی کر دیں جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا میں چاہتا ہوں کہ وہ پہلے پاکستان جائے وہاں دوبارہ سے ایڈجسٹ کرے پھر پتا چلے گا کہ وہ جاگیرداروں اور حویلی والوں سے شادی کر کے نباہ سکتی ہے یا نہیں۔"

"تو پھر یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟" دل آور گاڑی لاک کر کے مضبوط قدم اٹھاتا بک شاپ کی طرف آیا تھا۔

"یہ سب اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں بھی کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آجاؤں۔" عبداللہ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"تم پاکستان آجاؤ گے اور نگارش بھابھی؟"

"وہ بھی میرے ساتھ ہی آئیں گی۔"

"لیکن تمہارے گھر والے تو انہیں قبول کرنے پہ تیار نہیں ہیں؟"

"جانتا ہوں اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تمہاری طرح لاہور میں اپنا گھر لے لوں اور میں نے تمہیں اسی لیے فون

کیا ہے کہ تم میرے لیے کوئی اچھا سا گھر دیکھو۔"

"او تو یہ معاملہ ہے؟"

"ہاں یار! مجبوری ہے' زری اکیلی ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی' وہ تو پل میں ہتھیار ڈال دے گی' میرا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔"

"ہوں! واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو' اچھا ارادہ ہے تمہارا' میں بات کروں گا کسی سے' گھر کرائے پہ لینا ہے یا ذاتی؟"

"نہیں یار! میں کرائے کا جھنجٹ نہیں پال سکتا' ذاتی ہی لوں گا' اگر دوبارہ انگلینڈ آیا تو اس گھر کی ذمہ داری تم ہی سنبھالو گے۔" عبداللہ نے پہلے سے ہی اطلاع دے دینا ضروری سمجھا تھا' جس پہ دل آور کے تو تیور بدل گئے تھے۔

"کیوں؟ میں تم دونوں کا منیجر ہوں؟ سیکرٹری ہوں؟ یا چوکیدار؟ پہلے تم دونوں کو چیزیں لے کر دوں' پھر ان کی حفاظت بھی کروں' واہ کیا بات ہے جناب؟ ساری زندگی تم دونوں کے کاموں میں گزار دوں اور اپنا کچھ نہ کروں۔"

دل آور نے اسے کھری کھری سنا ڈالی تھی۔ عبداللہ اس کی بات پہ یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"اپنا کیا کرنا ہے تم نے؟" وہ غصے میں تھا اور عبداللہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"جنازہ جائز کرنا ہے جیسے تم نے کیا ہے۔"

"صرف جنازہ ہی جائز کرنا ہے؟ شادی نہیں کرنی تم نے؟" عبداللہ نے دوبارہ چھیڑا۔

"عبداللہ صاحب! تم اس وقت فون پہ ہو' میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ میں نے کیا کیا کرنا ہے؟ اور میرے کرنے کا سن کر تمہارے کانوں سے دھواں نہ نکل جاتا تو میرا نام بھی دل آور شاہ نہیں تھا۔" وہ اک اک لفظ غصے اور خفگی سے چبا کر بولا تھا جس پہ عبداللہ کو جیسے ہنسی اور قہقہوں کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں ابھی ہمارے کام نبٹا لو' پھر بعد میں تمہیں فرصت ہی کب ملے گی بھلا؟"

"ایسی کی تیسی تمہارے کاموں کی' بس تمہیں گھر لے کر دوں گا' بعد میں جو بھی چاہے کرتے رہنا' سمجھے تم؟"

دل آور نے اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

"ارے یار! تم جانتے ہو تمہارے سوا ایسے کام کوئی نہیں کر سکتا' اسی لیے تم سے ہی کہنے پڑتے ہیں' مجبوری ہے ہماری۔"

"کیوں؟ کیا میں پراپرٹی ڈیلر ہوں؟ کسی نے گھر لینا ہے' کسی نے شوروم بنانا ہے' ایک کے بابا صاحب [illegible] سے پاکستان آئے ہیں تو وہ پریشان ہے' ایک کے بابا جان پاکستان سے انگلینڈ جانا چاہ رہے ہیں تو وہ پریشان ہے' ایک کو مدحیہ حیات نے ستا رکھا ہے تو دوسرا زرین ملک کے لیے ستایا جا رہا ہے' واہ میرے [illegible] الجھنوں میں الجھ گئے ہو؟" دل آور در حقیقت ان کا مذاق اڑا رہا تھا جس پہ عبداللہ بھی اپنی [illegible] والی ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

"ہاں یار! یہ تو تم سچ ہی کہہ رہے ہو' بہت الجھ گئے ہیں ہم لوگ' [illegible] کرتے ہیں کہ اللہ تمہیں بھی الجھا دے' شادی کے چکروں میں۔"

"ہونہہ! مجھے الجھنے دو گے تو میں الجھوں گا نا۔ جب تک تم دونوں میرے پیچھے پڑے ہو' میرا کچھ نہیں بننے والا۔" آج دل آور شاہ کو رہ رہ کے اپنا خیال آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے جناب آج بار بار اپنے [illegible] جا رہی ہے' کوئی خاص وجہ؟" عبداللہ نے معنی خیزی سے پوچھا۔ جس پہ دل آور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"وجہ کیا ہو گی یار؟ آج بس [illegible] شادی کا دل کر رہا ہے۔" دل آور اس سے بھی زیادہ معنی خیزی سے بولا تھا۔

"ارے ہوئے! ابھی سے بے تاب لگتے ہو؟ بتول آنٹی سے بات کروں کہ ان کے بیٹے کا شادی کرنے کا دل کر رہا ہے' جوانی منہ کو آ رہی ہے' صبر نہیں ہو رہا شہزادے سے؟"

"تمہاری بتول آنٹی کو خود ہی پتا ہے کہ ان کا بیٹا کیسا ہے؟ [illegible] کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں ایک بات اور' جوانی کو بھی اتنا بے صبرا بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ منہ [illegible] میں ہر چیز کو ایک حد تک رکھنے کا قائل ہوں۔" دل آور نے استہزائیہ سا جواب دیا تھا۔

"ویسے ایک بات تو بتاؤ یار! تمہیں کوئی پسند بھی ہے یا نہیں؟"

نہ جانے کیوں عبداللہ نے بے ساختہ ہی یہ سوال کر [illegible] تھا اور دل آور کے فر فر بولنے والے ہونٹوں پہ چپ کا تالا پڑ گیا تھا۔ وہ عجیب تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے دل آور؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟ کیا میں زیادہ پرسنل ہو گیا ہوں؟" عبداللہ نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے' ابھی اس پسند اور ناپسند والے معاملے پہ دھیان نہیں دیا' لیکن جب دیا تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" دل آور نے شائستگی سے بات ٹالی تھی۔

"کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تم نے اس معاملے پہ دھیان دیا تو تمہاری پسند' تمہارا انتخاب کیسی لڑکی ہو گی؟"

عبداللہ کا [illegible] پوچھا ہوا سوال آیا تھا اور دل آور کی آنکھوں کے سامنے اک نرم ملائم اور دلکش سا سراپا پوری آب و تاب کے ساتھ کھنچ گیا تھا۔ محبتوں اور مٹھاس سے گندھا ہوا' دل آور شاہ کے عشق میں پور پور ڈوبا ہوا۔

"کیا میں نے کچھ غلط پوچھ لیا میں نے؟" عبداللہ نے پھر متوجہ کیا تھا اسے۔

"میری پسند' میری اماں بہتر جانتی ہیں' ہو سکے تو ان سے پوچھ لو۔" دل آور نے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور عبداللہ اس کے جواب پہ بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

"کیا تم اپنی اماں کی پسند سے شادی کرو گے؟"

"ہاں کہہ سکتے ہو' کیونکہ میری اور میری اماں کی پسند تقریباً ایک ہی ہو گی۔ جس سے وہ کہیں گی میں شادی کر لوں گا۔" دل آور کے جواب پہ عبداللہ نے گہری سانس کھینچی تھی اور پھر چند اور باتوں کے بعد فون بند کر ڈالا' لیکن دل آور کے ذہن میں ہزاروں سوچیں اور ہزاروں الجھنیں چھوڑ گیا تھا' اس کا دماغ بوجھل اور منتشر ہو رہا تھا' وہ بوجھل قدم اٹھاتا ایک شاپ کے اندر آ گیا تھا' کچھ کتابیں لینی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک لیلیٰ کھڑی ہوئی ہے نئے زمانے کی تلخیوں میں
پھر ایک وعدہ امر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
ابھی تو پھرتے ہو دوستوں میں عزیز کوئی جدا نہیں ہے
کوئی ادھر سے ادھر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
محبتوں میں تو پتھروں کو بھی موم ہوتے سنا ہے لیکن
تمہارے دل پہ اثر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا
وہ جس کی خاطر زمانے بھر کو بنا رہے ہو تم اپنا دشمن
وہی نہ تھا اپنا اگر ہوا تو محبتوں کا پتا چلے گا

نگارش کسی کام سے باہر نکلی تھی لیکن گھر کے چھوٹے سے لان میں اسے سفید کاغذ جا بجا بکھرے ہوئے نظر

آرہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھا۔ زری کی ہینڈ رائٹنگ میں چند اشعار تحریر تھے جن کو پڑھ کے نگارش نے چونک کر زری کے بیڈ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں سے اور بھی کاغذ زمین کی طرف چلے آرہے تھے۔ اس نے ڈائری پھاڑ ڈالی تھی شاید۔

"او مائی گاڈ! یہ کیا کیا اس نے؟" نگارش چکرا گئی تھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اندر کی طرف بھاگی اس کا رخ زری کے بیڈ روم کی طرف تھا اس نے آتے ہی دروازہ دھڑام سے کھولا تھا۔

"زری۔۔۔!" نگارش نے تڑپ کے پکارا تھا اسے اور تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آئی تھی اس نے بے تحاشا آنسو بہاتی ہچکیوں سے روتی ہوئی زری کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟" نگارش نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"ہاں پاگل ہو گئی ہوں میں، تڑپ مار رہی ہوں اپنے اندر کی، یہ لفظ صرف لفظ نہیں ہیں یہ اس شخص کی یاد، اس کی تڑپ، اس کی طلب ہیں، جب جب اس کے لیے تڑپی ہوں تب تب میں نے لفظ تحریر کیے ہیں، جب جب اسے یاد کیا ہے تب تب اپنے دل کا حال لکھا ہے اور وہ شخص۔۔۔ وہ میری تڑپ، میرے دل کا حال ہی نہیں جانتا، انجان پھر رہا ہے مجھ سے جیسے میرا۔۔۔ میرا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے جیسے اس کے انجان پن سے مجھے تو درد ہی نہیں ہوتا، مجھے تو تکلیف ہی نہیں ہوتی، پورا ایک سال ہو گیا ہے اسے دیکھے ہوئے، اس سے بات کیے ہوئے، آج میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کر لیا تو وہ میرا دیوتا بن بیٹھا، اس کے سامنے ایڑیاں رگڑتی رہی لیکن اس نے فون کو آن کر کے کان سے لگانے کی زحمت نہیں کی۔ جانتی ہیں آپ کتنی بار فون کیا ہے میں نے۔۔۔ دس بار، پورے دس بار، اور دس بار اس نے تڑپ کا تماشا دیکھا ہے، ایک بٹن۔۔۔ محض ایک بٹن دبا کر اس تڑپ کو کان سے لگا کر قرار نہیں دیا، صرف یہ سوچ کر کہ کہیں زری اس قرار، اس تسلی کی عادی نہ ہو جائے۔ کہیں اس سے عمر بھر کا ساتھ نہ مانگ لے، بھابھی میری بات کاغذ پہ لکھ کے رکھ لیں، وہ شخص دوستیاں نبھانے والا شخص ہے، محبتیں نہیں، وہ کبھی میری محبت پہ ترس نہیں کھائے گا، کبھی گلے نہیں لگائے گا، وہ کبھی بھی زرین ملک پہ اپنی نگاہ یار کی برسات نہیں برسائے گا اور میں ترس ترس کر پیاسے صحرا کی مانند ہو جاؤں گی۔" زری رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ دل آور شاہ کے ستم سے آگاہ بھی کر رہی تھی نگارش سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"زری پلیز! کیوں اتنی بدگمان ہو رہی ہو؟ ہو سکتا ہے اسے تمہاری کال کا پتا ہی نہ چلا ہو، ہو سکتا ہے وہ سو رہا ہو یا پھر سیل ہی اس کے پاس نہ ہو؟" نگارش نے اس کی تسلی کے لیے کئی بہانے ڈھونڈے تھے جس پہ زری بے ساختہ تلخی سے مسکرائی تھی۔

"ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے پاس سیل نہ ہو، سیل اس کے پاس تھا، اس کے پاس ہی ہوتا ہے مگر پھر بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی، اس نے میرے لیے، میری ہی کال ریسیو نہیں کی، نظر انداز کیا، اس کے سیل پہ وائبریشن ہوتی رہی اور وہ دیکھتا رہا، میری تڑپ کا تماشا دیکھتا رہا۔" زری اک اک بات ایسے بتا رہی تھی جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی رہی تھی یا پھر اسے الہام ہوا ہو، ایسے عالم میں اگر دل آور شاہ زری کی باتیں سن لیتا تو یقیناً ششدر رہ جاتا، اس کی باتیں اور اس کی عادتیں تو وہ ایسے جانتی تھی جیسے اس کے اندر رہتی تھی اور ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔

"لیکن زری! اسے بھلا کیا پرابلم تھی کال ریسیو کرنے میں۔۔۔؟"

"پرابلم تھی بھابھی، پرابلم ہی تو تھی، آپ نہیں جانتیں اس بامروت شخص کی پرابلمز کو۔۔۔" اس نے دکھ سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"مگر زری! تم خواہ مخواہ اپنا دل جلا رہی ہو، دل آور بھائی تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ہی رہیں گے۔" نگارش

حوصلہ نہیں کرنے دیتی تھی زری بے تحاشا رونے کے بعد رانگ چیئر پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی لیکن اچانک بجنے والے اس کے سیل فون نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا، نگارش نے لپک کے اس کا سیل بیڈ سے اٹھایا تھا اور اس کا چہرہ یکدم کھل اٹھا تھا۔

"زری! بتول آنٹی کی کال ہے۔" نگارش نے چہکتے ہوئے پرجوش سے انداز میں کہا تھا اور زری نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے بے یقینی سے دیکھا تھا لیکن نگارش نے اس سے پہلے ہی کال آن کر کے موبائل زری کے کان سے لگا دیا تھا۔

"السلام علیکم۔" زری نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو بیٹا۔" بتول شاہ کا پرسکون ٹھہرا ہوا لہجہ اور محبت بھری آواز سنائی دی تھی۔

"جی ٹھیک ہوں میں۔" زری [illegible] بھی تو گیا۔۔۔؟

"اوہ اچھا! تو تم نے بھی میرے دل آور کی طرح جھوٹ بولنا سیکھ لیا ہے؟" ان کی بات پہ زری کا دل زور سے دھڑکا تھا کہ انہیں میرے دل کی کنڈیشن کا کیسے پتا چلا۔۔۔؟

"ایم سوری آنٹی! میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔۔۔؟"

"وہ بھی کچھ ایسے ہی کہتا ہے حالانکہ بات پل میں سمجھ جاتا ہے۔ پھر بھی کہتا ہے کہ میں سمجھا نہیں۔" بتول شاہ ذرا مسکرا کے بولی تھیں۔

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔۔۔؟" زری نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "اسی کی جس سے تم بات کرنا چاہ رہی تھیں، جس کو تم نے دس بار کریدا ہے، دس بار ضرب لگائی ہے تم نے۔" بتول شاہ کی بات سن کر زری دھک سے رہ گئی۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ دل آور شاہ نے اپنی اماں کو کیسے بتا دیا۔۔۔؟

"بیٹا! اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے، وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا، میں اس کی ماں ہی نہیں ہمراز بھی ہوں، اس کی ہر بات جانتی ہوں، اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے کل رات زندگی میں پہلی بار اس کے نمبر پہ فون کیا تھا۔ لیکن وہ سن نہیں سکا، لیکن بیٹا اس کے فون نہ سننے پہ دل برداشتہ مت ہونا، اس کی کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے۔ وہ تمہاری کال سے بہت ڈسٹرب تھا، پریشان تھا کہ آج زری اپنی چپ کیوں توڑ رہی ہے؟ آخر کیا وجہ ہے؟ اور یقیناً اسی پریشانی میں وہ رات بھر سویا بھی نہیں ہو گا۔" بتول شاہ بات کر رہی تھیں اور زری کے دل پہ پھوار برس رہی تھی اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا دلکش تھا کہ دل آور شاہ نے اسے کسی کے ساتھ ڈسکس تو کیا ہے نا؟ کسی کے سامنے اس کا نام لیا ہے، اس کا ذکر کیا ہے، کال بے شک نہیں سنی مگر کال۔۔۔ پریشان تو ہوا ہے؟ رات بھر سویا نہیں، جاگ کر مجھے سوچا تو ہے نا۔۔۔؟ وہ بے ساختہ پلکیں موند کر دل ہی دل میں تشکر کا احساس لیے خدا کے حضور جھک گئی تھی دل سجدے پہ سجدہ کر رہا تھا۔۔۔ روح شانت ہو چکی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے چہرے پہ بکھرنے والے سکون اور اطمینان کے رنگ نگارش کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکے تھے نگارش اس کے قریب آئی اور زری نے شدت جذبات اور خوشی کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے نگارش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا!

"تم پاکستان کب آ رہی ہو؟" بتول شاہ نے ذرا ٹھہر کے سوال کیا۔

"نیکسٹ منڈے سے میرے فائنل ایگزامز اسٹارٹ ہو رہے ہیں، مہینہ یا پھر ڈیڑھ مہینہ لگ جائے گا میری واپسی کو۔"

"اچھی بات ہے، جلدی سے آجاؤ، میں بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"جی ضرور کیوں نہیں۔" زری سے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔
"نگارش کیسی ہے۔"
"جی نگارش بھابھی بھی ٹھیک ہیں، میرے پاس ہی ہیں۔"
"ارے واہ! بات کرواؤ میری۔" انہوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور زری نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون نگارش کو تھما دیا تھا۔
"السلام علیکم آنٹی۔"
"وعلیکم السلام، جیتی رہو، کیسی ہو؟"
"جی اللہ کا احسان ہے ٹھیک ٹھاک ہوں۔"
"بیٹا! پاکستان کا چکر لگاؤ، تم لوگ کیا انگلینڈ کے ہی ہو کے رہ گئے ہو۔"
"ان شاء اللہ بہت جلد ہم لوگ پاکستان آئیں گے۔"
عبداللہ خود بھی کہہ رہے تھے "کافی عرصہ ہو گیا ہے" اور اب تو ولی اور بھائی کی طرح نبیل بھائی بھی چلے گئے ہیں۔ عبداللہ بہت اکیلا فیل کرتے ہیں اپنے آپ کو۔"
"کیا! بندہ اکیلا ہی فیل کرے گا نا۔
بس جلدی سے آجاؤ۔"
"ضرور آئیں گے آنٹی، آپ دعا کیجیے بس کچھ پریشانیاں ہیں اللہ کرے کہ یہ پریشانیاں دور ہو جائیں۔"
"ان شاء اللہ۔ اللہ کرم کرے گا۔" بتول شاہ نے تسلی دی اور پھر کافی دیر نگارش کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ اور جیسے ہی فون بند ہوا۔ نگارش، زری پہ چڑھ دوڑی تھی۔
"اب بولو محترمہ! کیا کہا تھا میں نے۔؟ کب سے سمجھا رہی ہوں، تسلیاں دے رہی ہوں، لیکن تم ہو کہ پاگل پن کی حد کر ڈالی تھی، تڑپ تڑپ کر میرا کلیجہ بھی تڑپا ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر اور بتول آنٹی کا فون نہ آتا تو میں خود رو دینے والی تھی۔" نگارش نے اسے چپت رسید کرتے ہوئے کہا اور زری کھلکھلاتی ہوئی ہنستی ہوئی مسرور سی ہو رہی تھی۔
"بس بھابھی اس نے مجھے نظر انداز بھی تو ایسے ہی کیا تھا کہ میرے دل میں اک بات کا خوف بیٹھ گیا تھا۔"
"کس بات کا خوف۔" نگارش نے ٹھٹک کے پوچھا۔
"بقول شاعر۔

جسے اپنا یار کہنا، اسے چھوڑنا بھنور میں
یہ حدیث دلبراں ہے، یہ کمال دلبری ہے

زری نے شعر کہتے ہوئے نگارش کو دیکھا۔
"بس اسی بات سے ڈر گئی تھی کہ میرا دلبر بھی مجھے بھنور میں نہ چھوڑ دے۔"
"ہونہہ! بھاڑ میں گئی تمہاری شاعری، سر درد کر ڈالا ہے۔" نگارش اسے کھینچ کے کشن مارتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری ایک بار پھر کھلکھلائی تھی اور سر شاری سے ڈرائنگ ٹیبل پہ جھولنے لگی، ہونٹ بے وجہ ہی مسکرا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"امی! کہاں جا رہی ہیں آپ۔" وہ حویلی کے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھیں کہ پیچھے سے دانیال کی آواز سنائی دی۔ عائشہ آفندی کے قدم ٹھہر گئے تھے۔
"حویلی کی طرف۔"
"کیوں؟"
"ارے! کیوں کا کیا مطلب ہے۔؟"
"کیوں کا مطلب ہے کہ آپ کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو پھر کیوں جا رہی ہیں آپ؟" دانیال عشاء کی نماز پڑھ کے آیا تھا اور ابھی کچن سے پانی پی کر لوٹا تھا جب ان کو یوں باہر جاتے دیکھ کر رک گیا تھا۔
"میری طبیعت کافی بہتر ہے، ایک ہی جگہ رہ رہ کر دماغ بھی تھک گیا ہے اور جسم بھی، بے شک سبھی باری باری میرے پاس آتے رہتے ہیں لیکن میں تو ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ گئی ہوں۔" وہ کافی دھیمے سے کہہ رہی تھیں اور دانیال ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے پہ مجبور ہو گیا تھا۔
"ہوں! ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، جانا چاہیے آپ کو۔ انوشہ کہاں ہے؟"
"انوشہ بھی وہیں ہے لڑکیوں کے پاس۔"
"تو پھر میں اکیلا یہاں کیا کروں گا، چلیے میں بھی چلتا ہوں۔" وہ تعجب سے کہتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا اور عائشہ آفندی بے ساختہ اس کی بات پہ مسکرا اٹھی تھیں۔
اور وہ دونوں ماں بیٹا ایک ساتھ حویلی میں داخل ہوئے تھے، ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ سبھی چونک اٹھے تھے۔
کومل اور آذر ہی ان کے بڑے بھتیجی اور بھتیجے تھے اور وہی دونوں سب سے زیادہ خوش ہو کر ان کی طرف آئے تھے اور دونوں ہی اپنی اس بے ساختگی پہ پل بھر کے لیے ٹھٹک سے گئے۔ کومل نے آذر کو دیکھ کر چہرہ جھکا لیا تھا جبکہ آذر نے آگے بڑھ کے عائشہ پھوپھو کا بازو تھام لیا تھا۔
"آئیے پھوپھو، یہاں بیٹھیے۔" آذر نے اپنی جگہ پیش کی تھی اور وہ زری سے مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی تھیں۔

ساتھ ساتھ

صباحت یاسمین

"کیا بات ہے بھئی' آج کیا محفل لگا رکھی ہے؟"

انہوں نے آذر سے پوچھا تھا جو اس ینگ پارٹی میں ذرا کم ہی نظر آتا تھا اس کا زیادہ تر وقت کاروباری سلسلوں میں گزرتا تھا' گھر پہ ہوتا تب بھی وقار آفندی' اسرار آفندی اور اظہار آفندی کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ ڈسکس کرنے میں مصروف نظر آتا تھا۔

"پھپھو! در اصل یہ محفل میں نے نہیں لگائی بلکہ لگوائی گئی ہے اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ہماری اس شرارتی بلی کا ہے۔" آذر نے قالین پہ بیٹھی انوشہ کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

"اچھا؟ وہ کیسے۔۔۔؟" انہیں اور دانیال کو حیرت بھی ہوئی تھی اور دلچسپی بھی۔

"وہ ایسے کہ میں اپنے عشاء کی نماز پڑھ کے اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے جا رہا تھا جب یہ مجھے سیڑھیوں سے پکڑ لائی ہے' اور اپنی بات منوانے کی ضد کر رہی ہے' مگر اس کی بات ماننا ذرا مشکل کام ہے اس لیے میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ کیا کروں اور کیا نہیں۔۔۔؟"

آذر اپنی پھوپھی زاد کزن انوشہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا جو معصوم اور مسکین سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔

"کیسی بات؟ کیسی ضد اور کیسا فیصلہ۔۔۔؟" عائشہ آفندی کو تجسس ہوا تھا کہ ان کی بیٹی ان کے بھتیجے سے کیا منوانا چاہ رہی ہے؟ وہ بھی اتنے لوگوں کے ساتھ مل کر۔

"آذر بھائی! دس از ناٹ فیئر' آپ ہمارا پلان لیک آؤٹ کر رہے ہیں۔" انوشہ خفگی سے منہ بنا کر بولی تھی۔

"تو کیا اس پلان کو تم لوگوں نے سیکرٹ رکھنا ہے۔" آذر کو حیرانی ہوئی۔

"نہیں سیکرٹ تو نہیں رکھنا' لیکن پہلے آپ کی اجازت تو مل جائے' پہلے آپ تو مان جائیں۔"

"کام بہت مشکل ہے' میرا ماننا آسان نہیں ہے' یوں سمجھ لو یہ ایک رسک ہے اور میں اکیلا اتنی عوام کا رسک نہیں لے سکتا۔" آذر نے عوام کہتے ہوئے لڑکیوں کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ دانیال اور احمد مسکرا دیئے تھے۔

"تو آپ دانیال بھائی کو اور احمد بھائی کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔"

انوشہ بھرپور طریقے سے کیس لڑ رہی تھی۔ ساری لڑکیوں نے دل ہی دل میں انوشہ کی ہمت اور حوصلے کی داد دی تھی۔

"اوکے! میں اگر اجازت دے بھی دیتا ہوں تو ڈیڈ سے اجازت کون لے گا۔" آذر نے دوسرے پہاڑ کا ذکر کیا جس کو سر کرنا واقعی سب کے لیے مشکل تھا۔

"ان سے صرف وہی لوگ اجازت لے سکتے ہیں۔" انوشہ نے فوراً کہا۔

"ایک آپ اور ایک علیزے۔" اس نے آذر کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس کی بات پہ کومل نے چونک کر دیکھا تھا اس کے چہرے پہ جو رنگ ابھرا تھا وہ آذر کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا اور آذر یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔"

بڑے عجلت بھرے انداز میں ماہ دولت اس وقت دونوں ہاتھوں میں اوپر نیچے دو دو پلیٹیں اٹھائے اس ٹیبل کی طرف بڑھ رہے تھے جس پہ Family Friends کا کیپشن لگا تھا جب ایک نسوانی آواز نے توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ اگرچہ میں نے ایک لمحے کے لیے ہی سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا مگر یہی ایک لمحہ گڑبڑ کر گیا اور میرے بائیں ہاتھ کا توازن بگڑا اور اوپر موجود سلاد والی پلیٹ سے ایک کھیرے کا قتلا فرش پر اور وہ سلاد سے نیچے والی پلیٹ (جس میں روسٹ چکن کا ننھا منا پہاڑ کھڑا تھا) میں منتقل ہو گیا اور میں محترمہ کو "No Thanks" کہتے کہتے رہ گیا کیونکہ اس نے بڑھ کر سلاد والی پلیٹ پکڑ لی۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں نے تہ دل سے کہا۔

"کیا آپ یہ سب ایک ساتھ مکس کرنے والے ہیں۔"

آنکھوں کی مدد سے اس نے میرے دو ہاتھوں میں موجود تین پلیٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔"

مجھے حقیقتاً اس یک لفظی فقرے کے سوا کچھ نہ سوجھا تھا۔ ہاں البتہ میں نے اپنی "ہمشیرہ محترمہ" اور "بھابھی ماں" کو کوسا جنہیں میں کھانا سپلائی کرتا جا رہا تھا۔

"خیر یہ آپ کی صحت کو تباہ کر سکتے ہیں۔"

غالباً کھانے کی مقدار کو دیکھ کر یہ ماہرانہ پیشن گوئی کی گئی تھی میں نے اس بات کا جواب کچھ دیر کے لیے ادھار کیا کیونکہ Family Friends کیپشن والا ٹیبل میرے سامنے تھا پہلے میں نے روسٹ والی پلیٹ ٹیبل پر پٹخی پھر دائیں ہاتھ کی اوپر والی پلیٹ میں رائتہ تھا وہ پٹخی پھر اس سے نیچے والی [illegible] پلیٹ (جس پہ رائتے کی پلیٹ کی الٹی سائیڈ [illegible] گرام بھی بن چکا تھا) ۔ میرے اس کارنامے کے بعد وہ یقیناً کھانے پہ ٹوٹ پڑتیں اگر مہندی، نیل پالش، انگوٹھیوں، چوڑیوں اور لمبے لمبے ناخنوں والا ہاتھ ان کے ٹیبل پر نفاست سے بنا آواز پیدا کیے سلاد کی پلیٹ نہ رکھتا۔

دونوں نے ہی بہت محبت پاش اور بے حد ایکسرے کرنے والی نظروں سے اس اجنبی کو نوازا اور دونوں نے ہی ایک ساتھ مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے باری باری دونوں سے ہاتھ ملایا۔ اور میرے ذہن میں ان کے متوقع ریمارکس آنے لگے جو وہ عنقریب ہی "اس" کے متعلق دینے والی تھیں۔

"کتنی جچ رہی تھی نا صیب کے پہلو میں۔ مجھے تو لگا خدا نے اسے بنایا ہی ہمارے صیب کے لیے ہے۔" وغیرہ وغیرہ دراصل جب سے زارا نے انگیج منٹ رنگ واپس کی تھی وہ 420 لڑکیوں کے متعلق یہ کہہ چکی تھیں۔ واللہ اعلم وہ سب بعد میں کہاں تو دو گیارہ ہو جاتی تھیں۔

"آپ کا نام؟"

شفق کی آواز مجھے خیالوں سے واپس لائی وہ ابھی تک اس کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی اور اب بڑی [illegible] مسکان کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

"ارنی۔" یک لفظی جواب دیا گیا۔ وہ دونوں [illegible] چھوڑ کر اپنی اپنی نشستوں پہ براجمان ہو [illegible] اپنی میرے ساتھ اس ٹیبل کی جانب [illegible] جہاں کچھ دیر قبل میں اپنی پلیٹ رکھ [illegible]

"آپ یقیناً [illegible] والوں کی طرف سے ہیں۔"

زارا کی اور [illegible] بے حد کلوز تھی لہٰذا اتنا مجھے یقین [illegible] طرف سے نہیں ہے۔

"[illegible] کی بیسٹ فرینڈ ہوں۔"

[illegible] سے لہجے میں جواب دیا گیا پھر چند لمحے خاموشی رہی اور اس خاموشی کو اسی کی آواز نے توڑا وہ کہہ رہی تھی۔

"اور اس کی سابقہ منگیتر۔"

اس کا لہجہ تو پہلے کی طرح عام سا ہی تھا مگر یہ خبر مجھے کچھ خاص معمولی نہیں لگی تھی جبھی میں نہایت غور

سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے بھی بلیک کلر پہن رکھا تھا اور بیبانی کی دو پلیٹ۔ جس پہ وہ جھکی ہوئی تھی شاید تب ہی سے اس کے ساتھ تھی جب اس نے مجھے مدد کی آفر کی تھی غالباً" وہ میری نظروں کا ارتکاز محسوس کر گئی تھی جبھی میری طرف دیکھ کر ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے دو لفظی جواب دیا۔

"یہ باتیں انٹرسٹنگ [illegible]" اس نے جیسے مزا لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں کہہ سکتے ہیں مگر [illegible] انٹرسٹنگ بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے [illegible] ہوا ہے۔"

شاید میں [illegible] تھا کہ ہم دونوں نے ہی ہاتھی رنگ [illegible] وہ یقیناً میری طرح صدمے کی کیفیت [illegible] تھی۔ جبھی ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوئی۔

"اس کے علاوہ اور کچھ۔"

"تھینک۔" میں نے بات ختم کردی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے مجھے یہاں کیا سوچ کر بلایا ہے؟" میں نے دانت پیستے ہوئے زارا سے سوال کیا۔ میں اس وقت زارا کی جانب سے شہر کے بہترین ہوٹل میں مدعو تھا۔ جہاں پہ رنگ و بو اور مسکراہٹوں اور قہقہوں کا سیلاب آیا ہوا تھا زارا بے حد زندہ دل اور خوش مزاج لڑکی تھی اس کا فرینڈز سرکل بھی بہت وسیع تھا وہ ہر بات کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی شاید اسی وجہ سے عبدالرحیم سے محبت کے بعد اس نے بے حد آسانی سے اپنی "ارینج انگیجمنٹ" کے خلاف اسٹینڈ لیا یہاں تک تو ٹھیک تھا میں چڑتا اس بات سے تھا کہ منگنی کے ٹوٹنے کے بعد بھی سابقہ منگیتر سے وہ دوستی برقرار رکھنا چاہتی تھی جو کہ مرحوم منگنی کا نتیجہ تھی اسی وجہ سے اب میں اس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ تقریباً منہ بناتے ہوئے بولی۔

"میں فرینڈز کو پارٹی دے رہی تھی تو سوچا تم [illegible]"

"تم مجھے [illegible] دینے کا حق کھو چکی ہو۔" میں نے تیزی [illegible] بات کاٹ دی۔

"[illegible] تم میرے فرینڈ ہو۔" اس نے مجھے یاد دہانی اور [illegible] دلانے کے لیے کہا۔

"[illegible] سمجھ کر ہی تم مجھے بلاتیں۔ یہی سوچ لیتیں کہ تمہارا دوست اپنی سابقہ منگیتر کی شادی کی پارٹی زیادہ خوشی سے اٹینڈ نہیں کرے گا۔" میں بھی سچائی زارا سے نظریں ملانے سے گریز کرتا ہوا خلاؤں میں دیکھتا بول رہا تھا۔

"تمہاری خوشی کے لیے کچھ ہے یہاں مسٹر جبھی تم بلائے گئے ہو۔" وہ میرے غصے سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر اپنے مخصوص ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کیا؟" میں نے چہرہ اس کی طرف کرکے سوالیہ نظروں کے ساتھ بے آواز پوچھا۔ جواباً اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ڈانس کارنر کی طرف گھما دیا۔ عام کلبز کے ڈانس فلور کی نسبت نہ تو یہاں نیلی پیلی روشنیاں تھیں نہ آدھے ادھورے لباس نہ تیز دھنوں پہ کیا جانے والا بے ہودہ ڈانس۔ سفید برقی قمقموں کی شفاف روشنی میں کئی شادی شدہ اور کئی منگنی شدہ جوڑے موسیقی کی ایک نرم دھن کو نہایت شریف اور مہذب انداز میں انجوائے کر رہے تھے۔

سب چہرے ہی جانے پہچانے تھے مگر زارا نہ جانے کس کو میری خوشی کہہ رہی تھی۔

"وہ دیکھو نا عبدالرحیم کے ساتھ۔" اس نے اپنے شوہر کا حوالہ دے کر کہا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے عبدالرحیم کی جانب دیکھنا پڑا حالانکہ چند ساعتیں قبل جب میری اس پر نظر پڑی تھی تو میں نے فوراً سے بیشتر نظریں موڑ لی تھیں اب بھی بے حد احتیاط کے ساتھ میں نے اس سے بچتے بچاتے اس عورت کی سے اس کے پہلو میں دیکھا کہ اس کا چہرہ میری نظروں کی زد میں آیا ہی نہیں۔

"ارنی؟" میں نے حیرت اور استفسار بھرے لہجے میں زیر لب کہا۔

"بس اچھا کیا نا اس کو بلا کر؟" زارا نے غالباً "پر جوش ہونے کے سبب اس کو کافی لمبا کھینچا تھا۔

"صرف اچھا نہیں بہت خوب منگنی توڑ کر ایک کاری ضرب تو اس کو لگائی ہی پھر شادی میں بلایا اب پارٹی میں مکمل کوا اپنے بچوں کی برتھ ڈے میں بھی ضرور بلانا۔" میں نے لہجے میں خوب طنز بھر کر کہا۔ زارا میرے اس انداز کے سبب روہانسی سی ہوگئی اور بولی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"آئی مین کہ چھوٹے چھوٹے چرکے لگانے کا کوئی موقع بھی مس نہ کرنا تم لوگ۔" میں نے تنفر بھرے لہجے اور پھولے سانس کے ساتھ کہا۔ میری بات پوری ہوتے ہی زارا کے لبوں پہ مسکان آگئی اور وہ بولی۔

"مسٹر مہیب اگر ہم آج کی پارٹی یا ہماری شادی پہ اس کو انوائٹ نہ کرتے تو اس کو اتنا ہی برا لگتا جتنا تمہیں ہماری منگنی کے ٹوٹنے کا تھا۔ اینڈ تم جانتے ہو۔ عبدالرحیم کی جتنی شکر گزار وہ اس کی اور اپنی منگنی پہ تھی اس سے زیادہ منگنی ٹوٹنے پہ تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"مطلب یہ کہ عبدالرحیم نے ارئی سے اس وقت منگنی کی جب اس کی پھوپھی اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ارئی کا رشتہ لینے کے درپے تھی اور اس کے پاپا کے لیے انکار کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ اپنی لاڈلی بہن کو یہ بات جا کر کبھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اعلا عہدے پہ فائز اس کا ایجوکیٹڈ بیٹا ڈرنک بھی کرتا ہے اور جوا بھی کھیلتا ہے۔"

زارا تیز تیز بولتے ہوئے کہہ رہی تھی اس کا سانس پھول گیا تھا مگر وہ رکی نہیں تھی۔

پھوپھی کا کہنا تھا کہ اگر اس کے بیٹے سے زیادہ اچھا زیادہ پڑھا لکھا کوئی شخص ارئی کو بیاہنے آتا ہے تو وہ خود ہی اپنی خواہش سے دستبردار ہو جائے گی اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اتنی خوبیوں کی مالک سویٹ سی ارئی کا تب تک کوئی قابل ذکر رشتہ نہیں آیا تھا اور عبدالرحیم نے بیسٹ فرینڈ ہونے کا حق ادا کردیا۔" میں ارئی نامے میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ یہ فراموش کر بیٹھا کہ زارا کی تیز گام کی رفتار سے چلتی زبان جس اسٹاپ (عبدالرحیم کے ذکر) پہ آکر رکی تھی وہاں پہ پہنچ کر آہیں بھرنا میں کافی عرصے سے خود پہ فرض کر چکا تھا۔ میں بولا تو صرف اتنا کہ......

"منگنی ٹوٹی کیوں؟" حیرت انگیز طور پہ میرے لہجے میں طنز تھا نہ تنفر نہ غصہ بلکہ غیر محسوس انداز میں مگر میں پوری طرح ارئی نامے میں انوالو ہو چکا تھا۔

"ارئی کے نانا ان لوگوں میں سے ہیں جو مذہبی طور پر شدت پسند ہوتے ہیں اپنے گھر کی کسی فرقہ وارانہ ٹائپ سی محفل میں جب انہوں نے عبدالرحیم کو مدعو کیا تو ان کے علم میں آیا کہ عبدالرحیم کا تعلق دوسرے مسلک سے ہے۔ وہ چونکہ ارئی کے پاپا کے بزنس پارٹنر بھی تھے لہٰذا انہوں نے اپنے داماد کو مجبور کردیا کہ وہ ان کی نواسی کا رشتہ ان کے مخالف مسلک والوں سے ختم کردیں۔ ورنہ ان کی پارٹنر شپ خطرے میں ہے اور دوسرا اتفاق جو اس ساری کہانی میں ہوا وہ یہ تھا کہ ان دنوں انکل بزنس میں پوری طرح اپنے سسر پہ depend کررہے تھے اور عبدالرحیم نے ایک دفعہ پھر بیسٹ فرینڈ ہونے کا حق ادا کردیا۔" تیز گام اب بھی اپنے سابقہ اسٹاپ پہ ہی آکر رکی تھی۔ میں اب بھی ٹھنڈی آہ نہ بھرتی تھی۔ البتہ دور کسی نقطے کو گھورتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہا۔

"منگنی توڑنا آسان ہوتا ہے کیا؟"

"ہوتا ہے، بالکل ہوتا ہے۔" زارا کے ٹھوس لہجے میں دیے گئے جواب نے مجھے اس کی آنکھوں میں دیکھنے پہ مجبور کردیا وہ مسکرا رہی تھی۔

"مگر صرف ان لوگوں کے لیے جنہیں منگنی کا چھلا پہنتے ہی اپنے منگیتر سے محبت نہیں ہوجاتی۔ اور ان لوگوں کے لیے بھی جو رشتہ پکا ہوتے ہی یہ نہیں سوچتے کہ ان کی جوڑی میں ہیر رانجھے سے زیادہ عشق و عاشقی ہوگی۔"

میرے پاس اس کی ان حقیقت پسند باتوں کے جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تبھی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا وہ پھر بولی۔

"منگنی کے فوراً بعد ارئی کو طف سی جاب مل گئی۔ جاب میں وہ پوری طرح سیٹ نہیں ہوئی تھی کہ اس کے پھوپھی زاد کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے اور شادی ہی کی کسی رسم میں اس کے نانا نے عبدالرحیم کو اپنے ہاں کی کسی فرقہ وارانہ سی محفل کا دعوت نامہ دیا تھا۔"

تیز گام کا اسٹاپ اس بار بھی وہی تھا مگر میرا دھیان اس بار وہاں نہیں تھا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس کی شادی ہو گئی۔" میں نے فریش سے لہجے میں کہا تھا۔

"کس کی؟" زارا نے پوچھا۔

"ارئی کے پھوپھی زاد کی۔"

"بہت خوش ہو رہے ہو تو اس کے سامنے خوشی دکھاؤ۔" زارا میرے موڈ کو نارمل ہوتے دیکھ کر اپنی مخصوص ٹون میں چہک رہی تھی۔

"میں کیوں خوش ہوں گا بھلا؟" میں نے اس سے خود سے سوال کیا تھا وہ اب میرا بازو پکڑے مجھے عبدالرحیم اور ارئی جانب لے کر جا رہی تھی۔

"میں نے اپنی شادی کی پوری موی میں تمہیں صرف اس وقت مسکراتے دیکھا تھا جب تم ارئی کے ساتھ تھے۔" وہ مزے لیتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میں اپنی اور ارئی کی اس ملاقات کو جزئیات سمیت یاد کرنے لگا تھا تاکہ جان سکوں کہ آخر میں مسکرایا کب تھا؟ زارا کی کھنکتی آواز نے ہی مجھے وہ ملاقات مزید سوچنے سے روکا وہ کہہ رہی تھی۔

"میں تو تب ہی جان گئی تھی کہ تم اس میں انٹرسٹڈ ہو۔"

"واٹ؟" مجھے اس کی سوچ پہ شاک لگا تھا اس کے تیز تیز چلتے قدم تھم گئے اور میرے بازو بھی اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہوگئے مگر میری "واٹ" کی وجہ یہ نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ میں اور وہ ارئی اور عبدالرحیم کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ غالباً ارئی عبدالرحیم کو کسی کا نمبر لکھوا رہی تھی۔

"بس؟" عبدالرحیم نے نمبر نوٹ کرنے کے بعد سر اٹھا کر ارئی سے پوچھا۔

"ہاں بس مہیب سے ملیے۔" ارئی کی بجائے زارا نے جواب دیا تھا اور استحقاق بھرے انداز میں عبدالرحیم کی موبائل اسکرین پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"او بھئی کافی لیٹ آئے آپ۔" جواباً اس نے خوش دلی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا تھا اور ارئی سے میرا تعارف کرایا۔

"ارئی یہ مہیب ہے اور مہیب یہ ارئی ہے میری۔"

"بیسٹ فرینڈ + ایکس فیانسی۔" میں نے ارئی سے مصافحہ کرتے ہوئے عبدالرحیم کی بات کاٹ دی تھی۔ سب کے چہرے پہ مسکان آگئی۔

سب اس وقت ڈانس فلور پر تھے اور ارئی میرے پہلو میں آکھڑی ہوئی تھی۔

"تمہاری عبدالرحیم سے دوستی ختم نہیں ہوئی؟" ہم دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتے میوزک کارنر سے ذرا ہٹ کے لگی کرسیوں کی جانب بڑھ رہے تھے جب میں نے آہستہ آواز میں اس سے پوچھا۔

"دوستی ختم ہو سکتی ہے؟" اس نے سوال کے بدلے سوال کردیا۔

"شروع ہو سکتی ہے تو ختم بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے کندھے اچکا کر کہا۔

"شروع کیسے ہو سکتی ہے؟" وہ سب سے قریبی ٹیبل کے نزدیک جا کے رک گئی تھی۔

"جب دو لوگ ملتے ہیں ان میں کمیونیکیشن ہوتی ہے پھر ملتے ہیں پھر کمیونیکیشن ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ تو ان میں دوستی کی ابتدا ہو جاتی ہے۔" اپنی بات کے اختتام پر میں نے کرسی کی جانب ہاتھ بڑھا کر اس کو بیٹھنے کی آفر کی وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"اچھا سمجھنے سے کیا مراد ہے؟ وہ ایک دوسرے کو اچھا انسان تصور کرتے ہیں یا ایک دوسرے کی نیچر کو

اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں؟"

اس کے سوال پہ میں پرسوچ انداز میں سرہلاتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں کہنیاں ٹیبل پہ ٹکائے ہاتھوں کے کٹورے میں چہرہ سجائے منتظر نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"دونوں مفہوم لیے جاسکتے ہیں۔"

"اگر ہم اس کو فرسٹ میننگ کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھتے ہیں تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو فراڈ فرینڈز ملتے ہیں اور اگر سیکنڈ میننگ کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھیں تو بھی میرا ایک کونسچن ہے۔"

"ضرور پلیز۔" میں نے اس کو دوسرا سوال کرنے کی بھی دعوت دی۔

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنی فیلنگز اپنے بیسٹ فرینڈ سے ضرور شیئر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بیسٹ فرینڈ ایسے کیوں ہوتے ہیں کہ ان کو کہہ کر بول کر اپنی feelings ظاہر کرنی پڑتی ہیں؟ وہ بن کہے کیوں نہیں سمجھ جاتے؟ اور اگر وہ بن بتائے نہیں سمجھتے تو کوئی بے وقوف انہیں بیسٹ فرینڈ کا درجہ دیتا ہی کیوں ہے؟"

اس نے کافی لمبا سوال کیا تھا۔ میں نے جواب دینے کی بجائے ٹیبل پر پڑے گلاس میں جگ سے پانی ڈالا اور گلاس کے قریب ہی پڑی نمک دانی اٹھا کر گلاس میں نمک چھڑکنے لگا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ کافی سارا نمک چھڑکنے کے بعد میں اس کی جانب متوجہ ہوا اور بولا۔

"کوئی بہت ہی زیرک اور تیز نگاہ ہو گا جس کو پہلی نظر میں یہ علم ہو جائے گا کہ یہ پانی نمکین یا کڑوا ہے باقی لوگوں کو اسے برت کر ہی اس کی خصوصیات معلوم ہوں گی۔ فراڈ فرینڈز کا بھی یہی حساب ہوتا ہے۔" یہاں میں نے چند لمحوں کا توقف کیا اور [illegible] ہوا۔

"جہاں تک بیسٹ فرینڈز [illegible] ہے تو جناب میں یہی کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہماری ضروریات کوئی نہیں جانتا تو وہ پھر بھی دعا کے لیے کہتا ہے تو میرے ناقص خیال کے مطابق بعض مقامات پر لفظ رشتوں کی تزئین و آرائش کا کام سرانجام دیتے ہیں۔"

"واؤ گریٹ۔ اب تو میں اپنے "حالیہ" میں دوستی پر ایک اچھا سا مضمون لکھ سکتی ہوں۔"

اس نے بیک وقت میری بات کی تعریف کر کے مجھے خوش بھی کیا اور حالیہ کا نام لے کر چونکا بھی دیا۔

"حالیہ؟" میں نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"یس۔"

"میں بھی "the life" جوائن کرنے سے پہلے حالیہ میں ہی تھا۔" میں نے اپنے چونکنے کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔

"پھر چھوڑا کیوں؟" اس نے دلچسپی سے سوال کیا۔

"اس لیے کہ چینل کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ حالیہ بہت اچھا میگزین ہے لیکن مجھے شروع سے ہی چینل میں کام کرنے کا شوق تھا یوں بھی میرے [illegible] میں جو چیئر تھی اس پہ تو دو دن بیٹھنا بہت حوصلے کی بات ہے میں تو دو سال بیٹھا۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

"وہ سیٹ تو میں نے جاب کے [illegible] چینج کروائی تھی۔" اس نے [illegible] مطلع کیا۔

"پرسنل ریسور[illegible] پُریقین لہجے میں سوال کیا [illegible] تھا یہ جواب اثبات میں آئے گا [illegible] میں بولا۔

"[illegible] آئیڈیا میرے ذہن میں آیا مجھے life the [illegible] آئی۔" میری بات ختم ہوتے ہی اس کا فون بجنے لگا اور وہ اپنے نفیس سے ٹک کی آواز سے کھلنے اور بند ہونے والے پرس سے موبائل نکال کر اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ہیلو کہنے کے بعد اس نے جی اچھا کہا اور آخر میں آئی ایم کمنگ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"مجھے اب جانا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا وہ بھی اٹھ گئی ایک دفعہ پھر ہم ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہے تھے دروازے سے نکلتے ہوئے وہ بولی۔

"the life میں کوئی ویکنسی ہوئی تو مجھے انفارم کرنا۔"

بات کے اختتام پہ ایک وزیٹنگ کارڈ اس نے مجھے تھمایا۔ جو شاید موبائل رکھتے ہوئے اس نے پرس سے برآمد کیا تھا۔

"sure" میں نے یقین دہانی کرائی۔

"اللہ حافظ۔" وہ [illegible] سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے بولی میں نے [illegible] سر کو ذرا سا خم دیا اور ذرا کو اپنی واپسی کا بتانے کے لیے اس کو تلاش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

[illegible] عجلت بھرے انداز میں ہاتھ میں پکڑے پیپرز الٹ پلٹ کرتا ہوا تیزی سے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ رہا تھا جب مجھے منان کی آواز سنائی دی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کلن کے پیچھے اڑے سے بن کی طرف جاتا میرا دایاں ہاتھ واپس پیپرز پہ آن رکا تھا۔

"لانگ ڈرائیو پہ۔" میں نے تپ کر کہا تھا۔

"آفس آورز میں؟ بتاؤں پاپا کو؟"

"یار کورینج کے لیے جا رہا ہوں۔ شوق سے بتاؤ۔ اس حلیے میں اب انڈے لینے تو جا نہیں سکتا۔"

"لانگ ڈرائیو سے واپسی پہ خرید لانا انڈے۔" میں سیر تو وہ سوا سیر تھا۔

"آج تمہیں فری ٹائم کیسے ملا؟ وہ بھی انکل کی موجودگی کے باوجود؟"

جب تک منان کے پاپا آفس میں رہتے منان کو کسی سے ہیلو ہائے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا لہٰذا میری حیرت بجا تھی۔

"پاپا انٹرویوز میں بزی ہیں اور میں انجوائے منٹ میں۔"

"انجوائے منٹ میں نہیں ان کی مصروفیت کا فائدہ اٹھانے [illegible] ور نہ [illegible] درستگی کرنا لازم جانا۔"

"[illegible] پاپا فون تھامیں۔" منان کی [illegible] فون بج رہی تھی۔

"جی پاپا۔" اس نے فون اٹھاتے ہی بڑی سنجیدہ آواز میں کہا۔

"اندر تشریف لائیے۔ میں آپ سے سیکھنا چاہوں گا کہ انٹرویو کیسے کیا جاتا ہے۔" انکل کی آواز ماؤتھ پیس سے باہر آ رہی تھی منان کی اب والی انجوائے منٹ کو انجوائے کرنے کا میرا خوب ارادہ تھا۔ لیکن اچانک مجھے کسی کی بات یاد آ گئی اور میں نے پوچھا۔

"انٹرویوز کیوں کر رہے ہو تم لوگ؟"

"کیونکہ جو سیٹیں خالی ہوئی ہیں پاپا ان پہ ٹیڈی بیئرز بٹھانے کے لیے رضامند نہیں ہو رہے۔"

"یار مجھے بھی کسی کو جاب دلوانی ہے۔" اس وقت اس کی غیر سنجیدہ باتوں کو سنجیدگی سے لینا کسی اور کو نہایت سنجیدہ کر سکتا تھا جب ہی میں نے اپنے مطلب کی بات کی۔

"فرینڈ ہے یا کزن؟" وہ حیرت انگیز طور پہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"فرینڈ ہے۔"

"اوکے اسے کہنا تمہارے ریفرنس کا بتا دے میں پاپا سے بات کرتا ہوں۔"

"پاپا فون تھامیں۔" اس کی بات مکمل ہوتے ہی ایک دفعہ پھر اس کا فون بجا تھا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا میں نے جیب پاکٹ سے والٹ نکالا اور اس میں رکھے کارڈ پہ لکھا موبائل نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

سائٹ گلاس چائے کی بورڈ پہ تیزی سے انگلیاں چلاتے میں پوری طرح اپنے کام میں مگن تھا جب میرے موبائل کی بپ بجی میں نے بنا نمبر دیکھے یس کا بٹن پش کر کے موبائل بائیں کندھے اور کان کے درمیان اٹکا دیا۔

"کون تھی؟" حنان چھوٹتے ہی بولا۔

"ڈسکنیکٹ ہوگئی؟" میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کردیا۔ کی بورڈ پہ چلتی میری انگلیاں تھم گئیں۔

"کل پاپا تمہاری عقل کے حضور اکیس توپوں کی سلامی پیش کرنے والے ہیں۔" "کیا مطلب؟" میں واقعی نہ سمجھ سکا۔

"روم سے اس کے نکلنے کے بعد پاپا نے جو شعر کہا ہے وہ سنا رہا ہوں تمہیں سمجھ آجائے گی۔"

"سناؤ۔"

نور حسین چھوڑ کر گیا ہے نور بانو نہیں
ہمیں میل چاہیے نی میل نہیں

"نور حسین والی سیٹ کے لیے انٹرویو تھا؟ اوہ مائی گاڈ" میں حقیقتاً "صدمہ کی کیفیت کے زیر اثر آگیا تھا۔ کیونکہ انجانے میں ہمیں۔۔۔ ارئی کو لائٹ مین بنوانے جارہا تھا۔

"کیا ہے تم معذرت کرلو پھر بات کرتے ہیں۔" حنان نے شرارت سے بھرپور لہجے میں کہا تھا میں فوراً" اپنی جگہ سے اٹھا اور آکر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کھنگالنے لگا جلد ہی میرا والٹ میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے فوراً" سے پیشتر ارئی کا آفیشل موبائل نمبر ڈائل کیا۔ حالیہ والے اپنے ہر ورکر کو ایک موبائل لازما" دیتے تھے آج دن میں بھی میں نے ارئی کو اسی نمبر سے فون کیا تھا۔ مسلسل بیل جارہی تھی مگر فون اٹھایا نہیں جارہا تھا ساتویں آٹھویں بیل پہ کال پک کرلی گئی۔

"ہیلو۔" "تخابا" نمبر دیکھے بنا فون اٹھایا گیا تھا۔

"السلام علیکم۔"

"مہیب؟" اس نے فوراً" ہی پہچان لیا تھا۔

"آئیم سوری یار یہ ویک بہت بزی گزرا مجھے پتا ہی نہیں چلا آفس میں کیا ہورہا ہے کیا نہیں اور صبح جب انٹرویوز کا پتا چلا تب بھی میرا دماغ کہیں اور تھا بھی تمہیں مس گائیڈ کر۔۔۔"

ٹوں ٹوں ٹوں۔ فون کٹ دیکا تھا۔۔۔ انداز میں بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ تنی تی۔۔۔ سوکتے میں نے ٹھنڈی سانس خارج کی اور۔۔۔ رکھ لیا۔

"میسج ٹون سنائی دی تو میں بے دلی سے اس کی جانب متوجہ ہوگیا کوئی انجان نمبر تھا۔

"مسٹر اوکے مہیب آگئی تو تم مجھے مو نہیں سمجھ سکتے نہ ہی لائٹ مین کی پوسٹ کے لیے اہل سمجھ سکتے ہو اس موبائل کی بیٹری ختم ہوگئی ہے۔"

"یار غلطی سے ہوا تمہیں برا تو نہیں لگا؟"

"زیادہ نہیں۔" "فوراً" جواب موصول ہوا تھا۔

"تم میرے آنے تک رکی بھی نہیں تو مجھے لگا تم کو بہت غصہ آیا ہے۔"

"جناب میرا تو ارادہ تھا کہ آپ سے ملوں اور دیکھوں کہ آپ کے اس کیبن کی کرسی کتنی آرام دہ ہے مگر دو گھنٹوں کا ویٹ میں نہیں کرسکتی تھی۔"

"چلو میری کرسی تو دیکھی۔"

"ہاں جی تمہارا کیبن اچھا ہے۔"

"میں بھی تو اچھا ہوں۔"

"مجھ سے زیادہ نہیں۔"

"اچھا جی۔" "میں نے ابھی یہ ٹائپ ہی کیا تھا کہ موبائل آف ہوگیا بجلی کب کی گئی تھی نہیں چل سکا تھا لہٰذا میں نے سونے کی خاطر آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

صحافیوں کے متعلق کوئی اچھا سا لطیفہ آیا تھا ان باکس میں میں نے ہر اچھے ۔۔۔ میسج کی طرح اس کو بھی ارئی کے نمبر پر سینڈ کردیا۔

"تم نے مجھے جوک ۔۔۔" میسج پڑھتے ہی اسے پتا چل گیا کہ وہ بری ۔۔۔

"بڑی فضول ۔۔۔ تمہاری اتنی بچی۔" رات کے ۔۔۔ بجاتی وال کلاک کو دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا آخر وہ مہیب ہی کیا جو مان جائے۔

"ہاں ہے۔ بالکل تمہاری سوچ کی طرح۔"

"تھینکس کیوزی۔"

"کیسا لگا سچ؟"

"net آن کرو ذرا۔" اس کی عجیب سی بات کو سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟" تھوڑی ہی دیر بعد کمپیوٹر پر اس کا پیغام

مزید ہو رہا تھا۔

"تم نے میری سوچ کو پچی کیوں کہا؟"

"مجنوں کا جانشین بننے کا جو تہیہ کر رکھا ہے۔"

"اس نے مجھے ریجیکٹ کیا تھا کیا میں ری ایکٹ نہ کرتا؟"

"آج تم نے منان کی لانگ ڈرائیو کی آفر ریجیکٹ کی۔ اپنی ماما کی بنائی کافی تمہیں روز ہی پسند نہیں آتی' یہ بھی تو ریجیکشن ہے۔"

"مگر میں ان کو as a person ریجیکٹ نہیں کرتا۔"

"تو زارا نے تمہیں کب کہا کہ تم نہیں ہو؟"

"اس نے یہ تو جتلا دیا نا کہ میں اس کے لیے کچھ نہیں ہوں۔"

"کچھ نہ ہوتے تو وہ تم سے بے ایمانی کا رشتہ بنا لیتی اور اس ٹف ٹائم کو avoid کر لیتی جو منگنی توڑتے وقت اس کی زندگی کا حصہ بنا۔"

"وہ سب اس نے میرے لیے نہیں عبدالرحیم کے لیے سہا کیونکہ وہ اس سے پیار کرتی ہے۔"

"same feelings تمہاری زارا کے لیے ہیں کیا تم اس کے لیے نہیں سہہ سکتے یہ سب؟"

"سہا ہی تو ہے۔"

"سہا ہے یا اس کی تشہیر کی ہے؟"

اور اس کی اس بات پہ مہیب کی انگلیاں کی بورڈ پہ نہیں چل سکی تھیں۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی طرف سے خاموشی پا کر زارا نے لکھا۔

"دل کے معاملات دل تک رہنے چاہئیں نا۔؟"

"میری پوری زندگی کا معاملہ تھا۔"

"بہت بڑی well wisher ہے وہ تمہاری' چاہتی تو تمام عمر تمہیں ثانوی درجے کے جذبات سے بہلاتی رہتی۔"

"میں کیا کروں؟" میں زچ ہو گیا تھا۔

"نارمل ہو جاؤ' کسی اچھی سی لڑکی [illegible] سے پہلے کہ لڑکیاں تمہیں لڑکے کا چچا [illegible] شروع کریں۔"

"میں ویسے بھی 90 فیصد نارمل ہو چکا ہوں۔"

"100 فیصد ہو جاؤ' لڑکیوں کی اکثریت کاملیت پسند ہوتی ہے۔"

"او کے سر۔" میں نے بحث سمیٹ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں ہو بھئی؟ کب سے میسج کر رہا ہوں۔" میں نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"سوری یار ہسپتال آئی تھی۔" ارنی کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔

"ہاسپٹل؟ کیا ہوا؟ خیریت؟" خود بخود ہی میرے لہجے میں پریشانی در آئی تھی۔

"ہاں خیریت ہے بس رات جب تم نے جگایا تو اس کے بعد سو نہیں سکی ٹھیک سے' صبح معمول سے ذرا جلدی ناشتا کر لیا۔ ہیوی ناشتا تھا تو ڈائجسٹو سسٹم میں پرابلم ہو گیا۔"

وہ جانتی تھی تفصیل جانے بنا میں نے ٹلنا نہیں تھا جبھی اس نے تمام قصہ میرے گوش گزار کر دیا۔

"اوہ۔ ایم سوری۔ میں آ رہا ہوں تمہیں دیکھنے ایڈریس سینڈ کرو۔"

"ہاں ٹھیک ہے کرتی ہوں اور تمہارا ویٹ بھی کرتی ہوں۔"

"سی یو سون۔" میں نے فون بند کیا اور دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتا ہوا لاؤنج میں پہنچ گیا۔

"مہیب" [illegible] قدم رکھتے ہی۔ ماما کی آواز سنائی دی۔

[illegible] ایڑھیوں کے بل گھوم گیا۔

"جاتے ہوئے مجھے ذرا زرین کی طرف ڈراپ کر دو۔" وہ نک [illegible] سے درست جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھیں۔

"کر دیتا ہوں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" وہ سوالیہ انداز میں کہتی ہوئی قریب آ گئیں۔

"لیکن یہ کہ پہلے آپ کو میرے ساتھ ایک فرینڈ کے ہاں جانا ہو گا۔" مہیب نے لاؤنج کا دروازہ عبور کرتے ہوئے کہا۔ ماما بھی اس کے پیچھے پیچھے لاؤنج کا دروازہ عبور کر کے باہر آ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"خیریت تو نہیں ہو گا تمہارا فرینڈ؟ پھر مجھے نکلنا بھی ہے۔" شوکت علی نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اور ارنی لان میں رکھی کرسیوں پہ بیٹھے تھے ارنی چائے پی رہی تھی۔ جبکہ اس [illegible] چکے تھے۔

"نہیں پاپا بس۔" ارنی [illegible] مکمل نہیں ہوا تھا کہ گیٹ پہ گاڑی رکنے [illegible] سنائی دی۔

"آ گیا۔" [illegible] کی آواز کی طرف متوجہ رہنے کے [illegible] اپنی بات مکمل کی۔ چند ہی ساعتوں [illegible] مہیب اور اس کی ماما کو لے کر ان کی طرف [illegible] ارنی نے چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ شوکت علی بھی استقبالاً کھڑے ہو گئے۔

"[illegible] آ رہی ہو؟" مہیب نے ہاتھ میں پکڑی پھولوں سے سجی ٹوکری ارنی کو تھمائی جس میں سرخ سرخ رنگ کے سیب پڑے تھے۔

"فائن تھینکس۔۔۔" ارنی نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے ٹوکری تھام لی۔

"فائن ہو تو خواہ مخواہ ہی اتنا خرچ کروا دیا۔" مہیب نے ہلکے پھلکے شگفتہ لہجے میں کہا جبھی اس کی نظر شوکت علی پہ پڑی۔

"السلام علیکم انکل!" اس نے مؤدب لہجے میں کہتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"وعلیکم السلام۔" شوکت علی نے پرجوش انداز میں جواب دیا تھا ارنی اب مہیب کی ماما کے ساتھ محو گفتگو تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیسے ہو؟" مہیب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول پہ بیٹھا دراز کھنگال رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔" ارنی بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔

"سنانے کو تو بہت مزے کی بات ہے۔ میرے پاس۔" مہیب نے سر اٹھانے کے انداز [illegible] "اچھا [illegible]" ارنی نے میگزین [illegible] پسند آ گئی ہو۔" مہیب نے ہونٹوں کا کونا دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

"اور پاپا کو تم؟" وہ بھی مسکراہٹ چھپا رہی تھی۔

"سچی؟" مہیب نے تصدیق چاہی جبھی اس کی نگاہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اٹھی اور وہ اپنے عکس کو دیکھنے لگا۔ وہ عکس جو اچنبھے میں نہیں تھا بلکہ از سرتاپا خوشگوار حیرت میں ڈوبا ہوا تھا اور جاندار سی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

☼ ☼ ☼

ساؤنڈ سسٹم پہ چلتے میوزک کی لے بدلی تھی اور اس کے ساتھ ہی نوجوان شادی شدہ اور منگنی شدہ جوڑے ازراہ تفریح پارٹنرز بدلنا شروع ہو گئے۔ جب معمول ارنی اور مہیب موسیقی کی لے کے بدلنے کے ساتھ ہی میوزک کارنر سے دور ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔

"کتنا انوکھا پیار ہے نا ان کا۔" زارا اور عبدالرحیم بھی میوزک کارنر سے ہٹ رہے تھے۔ جب زارا نے مہیب اور ارنی پہ تبصرہ کیا۔

"ہاں جیسے خدا نے انہیں بنایا ہی ایک دوسرے کے لیے ہو۔" عبدالرحیم نے تائیدی انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ہم لوگ ان دونوں کو ملوانے کا ذریعہ تھے اور کچھ بھی نہیں۔"

زارا عبدالرحیم کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتی کہہ رہی تھی۔ عبدالرحیم نے لب کی بار محض سرہلانے پہ اکتفا کیا۔ زارا اس کو خاموش دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

"پتا ہے عبدالرحیم ان دونوں کے ساتھ نے ان کے وجود کو جس الوہی چمک کے حصار میں لے لیا ہے اس کو دیکھ کر بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے یہ دونوں ہمیشہ یوں ہی رہیں خوش خوش اور ساتھ ساتھ۔"

"آمین۔ ثم آمین۔" عبدالرحیم نے اس کی بات پر صدق دل سے کہا تھا۔

☼ ☼

صبح کی نرم و خوشگوار کرنیں ایک نئے پیغام کے ساتھ اس کی جاگنے کی منتظر تھیں۔ پر تعیش سامان سے آراستہ اس کے کمرے کی سامنے والی دیوار پر بھی اس کی مرحومہ ماں کی بڑی سی تصویر جیسے پچکار پکار کر اسے جگانے کے تاثرات اپنائے ہوئے تھی۔ تین چار کروٹوں اور دو، تین انگڑائیوں کے بعد اس کے جاگنے کے آثار پیدا ہوئے تو جیسے مرحومہ ماں کی تصویر پر اطمینان غالب آگیا ہو۔ آنکھ کھلتے ہی اس کی نگاہ سامنے تصویر پر جا پہنچی۔ لگا مرحومہ ماں بے چینی سے اس کے جاگنے کی منتظر تھی۔

"باپ رے۔" لحاف پھینک کر وہ بستر سے

ناولٹ

چھلانگ مارتی تصویر تک پہنچی۔ تصویر کے رنگ کچھ خفگی والے ہوگئے تھے۔

"آئی نو۔ آئی نو۔ میری سالگرہ ہے۔ اور آپ کو میرے جلدی نہ اٹھنے کا غصہ ہے۔" تھوڑا سا آگے ہو کر تصویر کو چوما۔

"مفت غصہ بھگایئے اور مجھے وش کیجیے۔ نہیں تو میں سمجھوں گی آپ کو بھی آج میری پیدائش سے زیادہ ابا والا غم کھائے جارہا ہے۔" کہنے کے بعد قدرے دور جاکر بغور تصویر کو دیکھا۔ تصویر چمک کرتی نظر آئی۔ گویا اماں بہت خوش تھیں۔ وہ بھی خوشی خوشی باتھ روم میں گھس گئی۔

۞ ۞ ۞

"طوبیٰ۔" وسیع و عریض بیڈ روم کی دیوار پر مرحومہ بیوی کا بڑا سا رافوٹو آویزاں تھا۔

"پھر سے وہ تاریخ آگئی۔" چوہدری حشمت اس تصویر کے سامنے کھڑے بظاہر خود کلامی میں محو تھے۔ مگر سب جانتے تھے انہیں مرحومہ بیوی کی تصویر سے باتیں کرنے کی عادت تھی۔ ابھی بھی انداز بظاہر ہلکا پھلکا تھا جیسے مرحومہ بیوی کی تصویر میں سے جھانکتی جلالی نگاہوں کی زبان سمجھ کر بھی ناچار دل کا درد بتانا چاہ رہے ہوں۔

"ایک اور سال بیت گیا۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ کے ساتھ دکھ رویا۔

"تم زندگی کی ساتھی تھیں۔ وفاداری کا عہد لے کر میری زندگی میں آئی تھیں۔ دو سال پورے بھی اس عہد کو نہ نبھا سکیں۔" جہاں چوہدری حشمت کے چہرے پر کرب پھیلنے لگا تھا وہیں تصویر غصے سے بھری جارہی تھی۔

"ویسے ویسی جاہلیں جاہل سے ایسی کی امید بھی نہیں۔" جانتے تھے کہ یہ ... وحشت کا ہے۔ مگر وہ کیا کرتے ... کی طرح اس خصوصی دن کے موقع پر ... کھل جاتے تھے۔ جدائی کے زخم ... سے تازہ ہو جاتے۔

"... بیس سال ہوگئے ہماری جدائی کو۔ کہنے کو بیس سال ... اور مجھ سے پوچھو تو بیس صدیاں۔ تمہارے بغیر ایک ایک پل پہاڑ کے جیسا گزر رہا ہے۔" اپنا غم روتے ہوئے وہ یہ بھول گئے باہر زارا ناشتے پر منتظر ہے اور اندر مرحومہ کی تصویر مارے غصے سے چنگاری نظر آرہی ہے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جانتا ہوں تمہیں میرا یوں دکھڑے رونا برا لگ رہا ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے تمہاری جدائی سے زیادہ زارا کی پیدائش کا دن مناتے رہنا چاہیے۔" وہ قدرے ... پھلا کر اپنی صفائی دینے کے انداز میں بولے۔

"ڈور میں ہر سال اس کی سالگرہ اس کی خوشی اور خواہش کے مطابق مناتا بھی ہوں۔ تم گواہ ہو اس بات کی پر بیوی۔ تم سے تو دل کا حال کہنے میں کوئی حرج نہیں۔" ان ... سے ... درد تھا۔ تصویر کا غصہ برقرار نظر آیا۔

"... بیٹا۔" "معاً" زارا کی چہکار نے ان کے ہوش اور حواس سب واپس لوٹا دیے۔

"... کو سنو۔ کہہ رہی ہے ابا جی ناشتا۔ ابا کو ناشتا

بتلایا۔" یکدم سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔
"بابا جی۔ اب یہ چھمائیں جھٹنے والی نہیں تھیں۔" چوہدری حشمت نے بوکھلا کر تصویر کی جانب دیکھا۔ وہاں بھی ایسے تاثرات تھے جیسے اب بھی نہ گئے تو مرحومہ بیوی نے تصویر کی قار ملیٹی جھلا کر باہر نکل کر کچھ جوڈو کراٹے آزما کر ڈائننگ ہال تک پہنچانا تھا نہیں۔
"آیا۔ آیا پتر جی۔" ایک الوداعی نظر تصویر پر ڈال کر وہ تیر کی طرح باہر نکل گئے تھے۔ تصویر کی زبان صرف وہی سمجھنے والے پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو واضح محسوس کرتے کہ مرحومہ بیوی کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کا منظر ہے۔
ہونٹ مسکرا رہے ہیں مگر آنکھوں کی جھلملاہٹ ان کے دل کا درد بانٹنے میں پیش پیش تھی۔

☆ ☆ ☆

"جس دن میری سالگرہ ہوتی ہے۔" ڈائننگ ٹیبل پر خوبصورت اور لاڈلی بیٹی کے شکوے چھوٹوں نے استقبال کیا۔
"اس دن آپ کمرے سے لیٹ کیوں نکلتے ہیں؟ ناشتا بھی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔" لہجہ ہی نہیں انداز بھی تھانیدارانہ تھا۔
"تو میرا پتر۔" چوہدری نے سارے جہاں کی محبت نظروں میں سمو کر بیٹی کو دیکھا۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آنکھ ہی دیر سے کھلی۔"
"آنکھ۔" زارا نے لفظ "آنکھ" کو اتنا لمبا کھینچا کہ چوہدری کو کھنکار کر اپنی بہادری برقرار رکھنی پڑی۔
"دیر سے کھلی۔ یا خشک دیر سے ہوئی۔؟" وہی مخصوص تفتیشی خون خشک کرتا انداز۔
"باتوں میں تم سے کوئی جیت سکتا ہے؟" چوہدری حشمت نے پہلے سر جھکا کر اپنی شکست مانی۔ پھر قہقہہ لگا کر گویا اس کی خوبی کا بھی اعتراف کیا۔
"آج کی تاریخ میں۔" زارا نے ہاتھ میں پکڑا سلائس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا۔ اور [illegible] نظروں سے دیکھ کر ٹھہرے ہوئے انداز [illegible]
"آپ صرف میرے اس دنیا میں آنے کی خوشی منا لیا کریں۔" پھر سلائس اٹھا کر لاپروائی دکھاتے ہوئے مزید کہا۔
"مانا کہ اماں بھی آج ہی کی تاریخ میں ہم سے جدا ہوئیں۔ میرے آنے کی خوشی پہ یہ غم حاوی ہو گیا تھا۔ لیکن ابا۔" وہ چوہدری حشمت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک امید کے ساتھ التجا گزار ہوئی۔
"اس جدائی کا غم تو ہم روز ہی مناتے ہیں۔ آج صرف خوش ہو لیا کریں۔ میری خاطر۔" آنکھیں ہی نہیں لہجہ بھی نم تھا۔ چوہدری حشمت کے دل پر گھونسا پڑا۔ یوں تو اپنا غم اپنے تک ہی رکھنے کے معاملے میں وہ محتاط رہتے تھے لیکن انجانے میں ہی۔۔ زارا تک اس کی ہوا پہنچی ضرور تھی۔
"کیوں نہیں۔" اگلے ہی پل وہ بالکل نارمل ہو گئے۔
"یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ آج خوب شو شا کریں گے۔ موم بتیاں جلائیں گے ہم کیک کاٹیں گے۔ اپنی بیٹی کے سارے گلے دور کر دیں گے۔" وہ یوں ہشاش بشاش ہو گئے جیسے کہ اداس تھے ہی نہیں۔ زارا اس دوران نہایت سنجیدگی کے ساتھ انہیں [illegible]
"مجھے شو۔ شا نہیں۔" چوہدری کی بات ختم ہوتے ہی اس نے نہایت پر اسرار انداز میں کہا۔ چوہدری حشمت نیا حکم سننے کے انتظار میں بے چاری سی شکل بنا کر بیٹھ گئے۔ یوں لگ رہا تھا زارا کسی دھماکے کے موڈ میں ہے۔
"صرف [illegible] زبردست سا۔" اور زارا نے خلاف [illegible] کر ان کا سانس بحال کر دیا۔ وہ محض [illegible]
"[illegible] نہ ہو تو۔ میرا دل سکوڑ ڈالا۔" ان کے قہقہے میں بڑی جان تھی۔

☆ ☆ ☆

کاؤنٹر پر رکھے اس کرسٹل کے کی چین میں کوئی تو بات ایسی تھی کہ انہوں نے فوراً اسے اٹھا لیا۔
"بزرگوار۔" پہلے گلا کھنکارنے اور پھر شائستگی سے پچکارنے کی آواز آئی۔ چوہدری نے سر اٹھا کر یوں دائیں بائیں دیکھا جیسے کہ شک ہو کہیں ہوں مخاطب انہیں ہی کیا گیا؟ تب تک زین ان کے دائیں طرف سے ہو کر سامنے آگیا تھا۔
"یہ میں پسند کر چکا ہوں۔" اس کا اشارہ چوہدری کے ہاتھ کی طرف تھا۔ جس میں وہ دیدہ زیب و نفیس کی چین دبا ہوا تھا۔
"تو۔" چوہدری حشمت نے ابرو اچکائے۔ زین کو دھچکا سا لگا۔ یعنی چوری اور سینہ زوری والی بات تھی۔
"بزرگوار آپ شاید سن نہیں [illegible] نہیں پائے۔ میں نے کہا ہیں یہ۔۔" چوہدری کی عقاب مار کہ مسلسل گھورتی نظروں سے خائف ہوتا بظاہر مسکراہٹ سجا کر بولا۔
"میں نے [illegible] سمجھا بھی۔" بات کاٹ کر چوہدری [illegible] اطمینان سے کہا۔
"پھر [illegible] لوں گا۔"
"ہاں۔" زین کی خفت پر حیرت اور پھر غصہ غالب ہوا۔
"دیکھیے بزرگوار۔"
"کیا بزرگوار۔ ہاں جی؟" چوہدری کو بھڑنے سے اکھڑنے میں بس اتنی مہلت چاہیے تھی۔
"کس کا بزرگوار؟ اوئے جگہ جگہ سے منہ تو تیرا لٹکا ہوا ہے۔ بزرگ مجھے بنا رہا ہے۔"
"دیکھیے۔ آپ۔" زین کا بھی میٹر گھوم گیا۔ بزرگوار جان کو آرہا تھا۔
"بزرگ بزرگ کر رہے ہو۔ اوئے بزرگ والا مقام بھی دو۔"
"دیکھیے میں نے بھی کوئی تلوار نہیں سونت رکھی۔ عزت سے ہی کہہ رہا ہوں آپ مجھے یہ واپس کر دیں میں پسند کر چکا ہوں۔" بہت زیادہ تنگ ہونے کے باوجود بھی وہ اگر تحمل سے پیش آرہا تھا تو کمال کی بات تھی۔
"تو پسند کرنے کے بعد کیا روٹی ہضم کرنے چل دیے تھے؟" چوہدری حشمت کے چمک کر کہنے پر زین نے بے ساختہ گہری سانس لی۔ یعنی تحمل سیدھی انگلیوں سے نکلتا نظر نہیں آرہا تھا۔
"یہ [illegible] نے ہاتھ میں پکڑا سرخ پھولوں کا [illegible] کے سامنے [illegible]
[illegible] تھا۔ قریب ہی۔"
"[illegible] اسی پہ گزارا کرو۔" زین کا بس نہیں چلا بزرگوار کا آج کام تمام کر دے۔
"کمال کرتے ہیں آپ۔" اس کی جھنجلاہٹ حد سے سوا تھی۔
"ایسے کیسے گزارہ کروں۔" وہ بھی آپے سے باہر ہو گیا مگر آواز دبا کر۔
"چھ دن خوار ہونے کے بعد مجھے میری مطلوبہ چیز ملی ہے۔ جوتے گھس گئے' ٹانگیں اکڑ گئیں' اتنی مشقت کی۔ اور اب خوشی خوشی وار دوں وہ بھی آپ پہ۔"
اس ساری جوشیلی حق بھری تقریر کو چوہدری نے سپاٹ و جامد تاثرات کے ساتھ سنا۔
"لائیے۔ دیجیے۔" زین نے نہایت اکتاہٹ کے ساتھ ہاتھ آگے پھیلایا۔ جیسے چوہدری دے ہی دیں گے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہنوز گھورتے رہے۔
"حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی۔" زین کا فشار خون بری طرح سے تیز ہوا۔
"لوئے ولادو۔۔ اوطیفے۔" زین پر متواتر نظریں مرکوز کیے چوہدری نے حلق پھاڑا۔ آن کی آن میں دو گن بردار دہشت گرد خصوصیات کا اشتہار آدمی چوہدری کے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے۔ زین کی سٹی گم ہو گئی' آنکھیں پھاڑے وہ مسلح باڈی گارڈ کو دیکھنے لگا۔
"تو جانتا نہیں' میں کون ہوں؟" مونچھوں کو تاؤ دیتے چوہدری حشمت میں سے مصطفیٰ قریشی بول اٹھے۔
"مم۔ مم۔ میں جان بھی کیسے سکتا ہوں؟ میں تو آج ہی ملا ہوں آپ سے۔" زین کو گفت مونگا پڑ گیا۔ گن مین تھوڑا آگے بڑھے۔ زین نے بے بسی سے چوہدری کو دیکھا اور پھر حسرت سے چوہدری کے ہاتھ میں دبے کی چین کو ایک بار پھر گن بردار کو دیکھا۔ مگر

اس بار نظریں چونکی تھیں۔ پھر چوہدری اور آخر میں ان کے ہاتھ میں دبے گن پر اچانک سے جھپٹا مارا۔ ارادہ تھا دہشت گردوں سے غنڈہ بن کر چھینتے ہی اڑن چھو ہو جائے گا۔ مگر یہاں ایسی نوبت نہ آسکی۔ گن چھین زین کے ہاتھ میں آنے کے بجائے نیچے گرتے ہی ٹوٹ گیا۔

"باپ رے۔ گیا کام سے۔" زین کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ پڑا۔ چوہدری کا غضب الگ' ٹانگیں کپکپانے لگیں۔

"توڑ مسل دو اوئے اس کیڑے کو۔" چوہدری کی گرج نے آدھا کام کر دیا۔ زین پر ابھی سے بے ہوشی طاری ہونے لگی۔

"گنّے بھی چڑی مار ہیں۔" اپنی طرف بڑھتے دلاور اور طفیلے کو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بڑبڑایا۔ تب تک سیلز مین بھی پہنچ چکا تھا۔ زین کی حالت پتلی ہو گئی۔

"سر پے منٹ۔" زین نے سانس روک کر اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داری ملاحظہ کی۔

"یہ۔" زین نے فرش پہ بکھرے شیشوں کو دیکھا۔

"آ۔ہا۔" نا سمجھ میں آنے والے الفاظ چوہدری کو دیکھ کر برآمد کیے۔

"یہ۔" انگلی سے چوہدری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

"یہ خرید چکے تھے نا ان سے وصولیں۔" اور کسی کو موقع دیے بغیر۔

"بھاگ۔۔۔ چور۔۔۔ بھاگ۔" کہتا اس رفتار سے بھاگا کہ چوہدری اور سیلز مین اس کی خاک بھی جاتی ہی دیکھ سکے۔ گن مین تک سر دھن رہے تھے۔

"سر۔" سیلز مین نے روئے سخن چوہدری حشمت کی طرف کیا۔

"پے منٹ۔" سیلز مین کا انداز میکانکی تھا۔

"اف۔" چوہدری بے بسی سے بھنا کر رہ گئے۔

✡ ✡ ✡

پھولی ہوئی سانسوں اور لال [illegible] لیے اس نے بریک زارا کے سامنے ہی جا کر لگائی۔

"کیا ہوا۔ پیچھے کتے لگے ہیں کیا؟" کب سے اس کے انتظار میں اس ریسٹورنٹ میں مشکوک کروا رہی بیٹھی زارا نے غصہ دبا کر حیرت دکھائی۔

"کتے نہیں سانڈھ۔۔۔ وہ بھی جنگلی۔"

"کیا؟" انداز ایسا تھا کہ زارا کو لگا کہ یہیں چیخ بھی جائے گا۔ وہ خود گھبراہٹ کے مارے کھڑی ہو گئی۔

"تو ہو بیٹھو۔ اب اس کی پہنچ سے دور ہوں۔" زارا کو ہلکا سا دھکیل کر بٹھانے کے بعد وہ خود بھی بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں صبح کس کو دیکھ کر اٹھا تھا؟" پانی کا گلاس پی لینے کے بعد وہ پریشانی سے بولا تھا۔

"شیشہ دیکھا ہو گا۔" زارا نے جل کر طنز کیا۔

"عجیب سنکی بڈھا تھا۔ کھڑوس کہیں کا۔ مجھے تو پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگ رہا تھا۔ میری جان کو آ گیا؟"

زارا کو فی الحال اس سیاپا نامے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ آج اس ریسٹورنٹ میں ایک گھنٹے سے خود کو سنوار کر بیٹھی تھی۔ ایک تو اس کی زندگی کا اہم دن۔ اوپر سے اتنا لمبا انتظار اور اب زین کی آمد وہ بھی خالی ہاتھ۔ وہ سلگ گئی۔

"میرا گفٹ۔" زین کی بات پر مٹی پاؤ [illegible] وہ بے صبری سے بولی۔ زین نے [illegible] نظروں سے اسے دیکھا اور طویل [illegible] تک دیکھا۔

"یہ ہے۔" پھر اپنی طرف اشارہ کر کے زور سے کہا۔

"کیا مطلب؟" زارا کا غصہ عود آیا۔

"مطلب [illegible] پچھاڑ سے نکل کے آیا ہوں۔ زندہ سلامت [illegible] سالگرہ پر میری اس نئی زندگی کو تحفہ سمجھو۔" لہجہ احسان جتاتا تھا۔ زارا کے تلووں تک آگ لگ گئی۔

"مجھے تم سے توقع ہی یہ ہی تھی' ایک نمبر کے کنگلے ہو۔"

"تمہارے اسی گفٹ کی وجہ سے یہ حال ہوا ہے۔" زارا کی خفگی کا برا مان کر وہ بھی زور سے بولا۔

"تو وہ صندوقوں کی تالیاں تھیں مجھ پر۔" پھر زارا کی شعلہ بار نظروں سے خائف ہوا تھوڑا نرم پڑا۔

"تمہیں بھی تو ایسی چیزیں گفٹ میں چاہئیں جو میوزیم میں ہی رکھی جاسکتی ہیں بس۔" زارا دانت پہ دانت جمائے چپ بیٹھی رہی۔ یہ شدید ناراضی کی علامت تھی۔ زین کو سمجھ نہیں آ رہی تھی صورت حال کیسے سنبھالے۔

"لڑکیوں والے شوق ہوتے تو اب تک کوئی لپ اسٹک کوئی انگوٹھی کوئی چھین لے بھی چکا ہوتا۔" زارا کی حد ختم ہو گئی تھی کندھے پر بیگ لٹکاتے ہی وہ فورا" آگے بڑھ گئی۔

"زارا۔ سنو۔ رکو تو۔ اچھا کیک تو کاٹتی جاؤ۔" پیچھے کیک اٹھائے وہ بھی بھاگا۔

✡ ✡

چوہدری حشمت اپنے بستر پر چند لڑکوں کی تصویریں بکھیرے باآواز بلند خود کلامی میں مصروف تھے۔

"اچھا ہے؟" مرحومہ بیوی کی تصویر تھی۔ جس کے تاثرات انہیں سنجیدہ لگ رہے تھے۔

"کل تک گود میں کھیلتی تھی۔" ایک ایک کر کے تصویر دیکھنے کے ساتھ وہ بولتے بھی جا رہے تھے۔

"آج اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ مجھے اس کی شادی کی فکر ستانے لگی ہے۔" ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر بیوی کی تصویر دیکھی۔ وہاں کے رنگ مدبرانہ نظر آئے۔

"تم ہوتیں تو پھر کیسی فکر۔ سب کچھ تم ہی سنبھالتیں اور میں۔" دروازے پہ پڑنے والی دستک نے ان کی خود کلامی کا گلا گھونٹا۔ زارا دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی۔

"ارے میرا بچہ۔ میرا شیر۔" ان کی آنکھیں بھی روشن ہو جاتی تھیں اسے دیکھ کر۔

"پہلے دودھ۔ باقی کے کام بعد میں۔" ان کے ہاتھ میں گلاس پکڑا کر تب تک کھڑی رہی جب تک انہوں نے گلاس خالی کر کے نہ دیا۔

"شرافت کہاں مر گیا؟ یہ کام اس کے کرنے کے ہیں۔" وہ بیڈ پر ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"شرافت [illegible] رہا ہے اور یہ کام کرتے ہوئے [illegible] اچھی لگتی ہیں۔" اس نے کچھ لاڈ سے اپنا سر ان کے کندھے پر ٹکا دیا۔

"[illegible] لیکن اب مجھے اپنی بیٹی کے بغیر زندگی گزارنے کی عادت ڈالنی ہو گی۔ بیٹیاں سدا تھوڑی پاس رہتی ہیں' ایک نہ ایک دن انہیں جانا ہی ہوتا ہے۔"

"کہاں؟" بات سمجھ میں آ گئی تھی مگر پھر بھی زارا نے عادت سے مجبور ہو کر تجاہل عارفانہ رویہ دکھایا۔

"اپنے گھر۔ سسرال۔" چوہدری صاحب مسکرا کر بولے۔ زارا بدک سی گئی۔

"میں کہیں نہیں جانے والی۔" اس نے منہ بسورا۔ چوہدری حشمت کو اور زیادہ دل کے قریب محسوس ہوئی وہ۔

"جانا تو ہے۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں' یہ تو دستور ہے زمانے کا۔" اس موضوع پر پہلی بار ان کے بیچ بات ہو رہی تھی۔ زارا سے زیادہ چوہدری حشمت کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

"میں کسی دستور وستور کو نہیں مانتی۔" وہ سختی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ ساتھ ہی آس پاس بکھری تصویروں کا معائنہ بھی جاری تھا۔ کچھ دیر چپ رہی پھر سر اٹھا کر نہایت سنجیدگی سے بولی۔

"میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر جانے والی نہیں۔" اس کی ضد کا چوہدری سے زیادہ اور کس کو پتا تھا؟ وہ دھیمے سے ہنس دیے۔

"وہ جھلی نہ ہو تو۔" ہلکی سی چپت اس کے سر پہ لگائی۔ اور پیار بھری نظریں مرحومہ بیوی کے فوٹو پر گاڑ دیں' جسے دیکھ کر واضح اندازہ ہوا تیور بگڑے ہوئے ہیں۔

"میرے ساتھ تمہاری اماں ہیں نا۔" لہجہ جذبوں سے گندھا ہوا تھا۔ مرحومہ بیوی کے تاثرات کچھ اور کرخت ہوئے۔ زارا نے جھنجلا کر پہلے باپ کو دیکھا پھر مرحومہ ماں کی تصویر کو۔ اماں اسے انتہائی نظر آئیں کہ لوہا گرم ہے' کوشش جاری رکھو۔

"ٹھیک اللہ تو ان کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔" اس نے تیز لہجے میں کہا تصویریں پھر سے اٹھالی تھیں۔

"اور یہ نمونے کون ہیں؟"

"اپنے بچے ہیں۔" چوہدری حشمت نے جس پیار سے کہا زارا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"آپ کے؟"

"اپنے خاندان کے۔" چوہدری کو گڑبڑانا پڑا۔

"تو یہاں کیا کررہے ہیں؟" اس نے ترت پوچھا۔

چوہدری نے سوال سرے سے نظر انداز کرکے تصویریں دکھانا شروع کردیں۔

"یہ تمہاری بڑی پھپھو کا بیٹا ہے' یہ چھوٹی کا' یہ میرے چاچے کا سالا ہے' بس یوں سمجھو یہ جو سارے صحت مند سرخ و سفید ہیں یہ میرے خاندان کے ہیں اور یہ جو سوکھی نلکیوں جیسے ہیں... یہ تمہارے ناکوں سے ہیں۔" ایسا بتاتے ہوئے چوہدری نے دانستہ مرحومہ بیوی کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ اندازہ تھا وہاں رنگوں میں شعلے پھوٹ پڑے ہوں گے۔

"تو آپ ان کا پوسٹ مارٹم کیوں کررہے ہیں؟" زارا نے بمشکل جماہی روکی۔

"اس لیے کہ اس کے خاندان والے تمہیں اپنی بہو بنانے کے خواہش مند ہیں۔" ابا تصویروں کو ترتیب دیتے ہوئے عام سے انداز میں بتانے لگے۔

"تو میں نے ان لڑکوں کو بلایا ہے' چھوٹا موٹا انٹرویو لینا ہے۔"

"انٹرویو؟" زارا کو پتا تھا یہ موقع آنے پر کچھ ایسے ہی سین ہوتے ہیں۔

"اباجی میں نے نہیں شادی کرنی' آپ اس انٹرویو کا تردد رہنے دیں۔" بے حد برا مناتے ہوئے وہ بیڈ سے اتر آئی۔

"اب تو کچھ نہیں ہوسکتا' سب کو انٹرویو کے لیے کال لیٹرز مل چکے ہیں۔"

"کیا..." مرحومہ ماں کی تصویر کی طرف بڑھتے قدم ساکت ہوگئے۔ تڑپ کر چوہدری کی جانب پلٹی۔

"آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ اماں روز میرے خواب میں آکر کہتی ہیں' ابا کو اکیلے چھوڑ کر مت جانا۔" سخت اشتعال میں وہ دروازے سے نکلتے ہوئے بولتی گئی۔

"اس لیے پہلے اپنا بندوبست کرلیں۔" دروازے سے نکلتے نکلتے وہ چوہدری کے حواس بھی چھین گئی تھی۔ کتنی دیر تک وہ لفظ "بندوبست" کی چبھن محسوس کرتے رہے۔ پھر آہ کھینچ کر بیوی کی تصویر کی طرف دیکھا۔ بیوی بڑے شاہانہ موڈ میں نظر آئیں مگر چوہدری جلے بھنے بیٹھے تھے۔

"سازباز کرنے والی عادت تم نے ابھی بھی نہیں چھوڑی۔" وہ با آواز بلند بڑبڑائے۔

☆ ☆ ☆

زین اسے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے گراؤنڈ میں ہی نظر آگیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس تک گئی۔

"نکمی... پیریڈ چھوڑ کر آگئیں؟" اس کا طنز نظر انداز کیے وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتی یقیناً "تنہا گوشے" میں لے گئی۔

"کیا کررہی ہو' شریف لڑکا ہوں' کچھ خیال کرو۔"

"زین بکواس مت کرو میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" یہ تو اس کی شکل پہ بھی لکھا تھا' زین اطمینان کی سانس لیتا بینچ پر بیٹھ گیا۔

"یہ نئی اطلاع ہے' کیونکہ تم پریشان کرتی ہو' ہوتی نہیں ہو۔" وہ معصومیت [illegible]

"تمہیں پتا ہے ابا میرے رشتے کے لیے انٹرویو [illegible]" زارا نے گویا بم پھوڑنا چاہا۔

"ماشاءاللہ دل کررہا ہے ان کا منہ چوم آؤں۔" اس [illegible] نکل گیا۔

"[illegible] انٹرویو میں پاس ہوجاؤ' پھر بے شک ایسا کر بھی لینا۔"

"میرا تو کوئی انٹرویو نہیں ہے' تمہیں کیا خواب میں آیا؟" اور تب زارا نے انٹرویو کی بابت ساری شرائط و تفصیلات بتائیں۔

"کیا کہا... انٹرویو؟" زین نے حلق تو پھاڑا ہی' بیٹھے سے کھڑا بھی ہوگیا۔

"آہستہ... اپنا خون کنٹرول میں رکھو' سب کو کیوں سنا رہے ہو؟"

"دل کررہا ہے ایک عالم کو اس بے تکے انٹرویو کے بارے میں سرفراز کردوں... کوئی محروم نہ رہے' سب مستفید ہوں۔"

"تم مذاق اڑا رہے ہو؟" زارا کے تیور بگڑنے لگے یہ ناراضی کا پہلا سگنل تھا' زین کچھ سنبھلا۔

"دیکھو بات ہی ایسی کی ہے تم نے' انٹرویو اور وہ بھی تمہارے ابا کے سامنے' تم جانتی ہو میں تو امتحانوں میں بھی مشکل سے بیٹھتا ہوں' پھر انٹرویو تو آگے کی بات ہے' تجربہ بھی کوئی نہیں۔"

"اگر مجھ سے شادی کے معاملے میں سنجیدہ ہو تو انٹرویو دینا بھی ہوگا اور پاس بھی ہونا ہوگا' سو میں سے سو نمبر لے کر۔" زارا نے منہ کھول کر یہ دوٹوک سفاک فیصلہ سنایا۔

"[illegible] سمجھے۔" اور بلا تامل ہاتھ جھاڑ دیے۔

"[illegible] شادی کے بغیر ہی اچھا۔"

"کیا... کیا کہا؟" زارا آج سے پہلے اتنی طاقت سے شاید ہی چیخی ہو۔

"دیکھو۔" زین کی پچکے خالی جھاگ کی طرح بیٹھی۔

"مم... میرا مطلب ہے یہ کوئی طریقہ ہے داماد ڈھونڈنے کا؟"

"تو تم بتادو... طریقہ۔" زارا غصے میں ہوتی تو زہریلی ہوجایا کرتی۔

"یار میں اپنے گھر والوں کو لے آتا... وہ آتے رشتہ ڈالتے' مٹھائیوں' مسکراہٹوں' مبارک بادوں کا تبادلہ ہوتا... اور..."

"انہیں بھی لے آنا' پہلے خود تو ورزش کرا جاؤ۔" زارا پہ کوفت چھاتے دیر نہیں لگتی تھی۔

"تو یہ بھی مصیبت ہے۔" محبوب صیاد ہوجائے' بلکہ جلاد صفت ہوجائے تو کیا کیا جاسکتا تھا۔ زین کو ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔

"اور سنو تھوڑی باڈی شاڈی بنا کر آنا۔" لاپروائی سے دیا حکم زین کا بھیجا اڑا گیا۔

"ابا کو تم جیسے [illegible] بالکل پسند نہیں۔"

"تو محبت کا [illegible] وقت ابا کی پسند نہیں دیکھ سکتی تھیں؟" [illegible] سارا خون جل جل کر ختم ہونے کو [illegible] زارا نے ترچھی نظروں سے دیکھا تو وہ [illegible]

"تب... وہ دونوں میں تو یہ کار خیر ہونے سے رہا۔"

"تم سے محبت کرنا اتنا مشکل اور بھونڈا مذاق ہوگا' کاش آئی لو یو کہنے سے پہلے الہام ہوجاتا۔" زارا کی گھورتی نظریں بھی اس کی دل جلی بڑبڑاہٹ کو نہ روک سکیں۔

"بی بی یہ چھ گز کی زبان لپیٹ کر آنا' نہیں تو کٹ جائے گی۔"

"ابا نہ ہوا گبر سنگھ ہوگیا۔" کہنے کے بعد وہ سر پاؤں رکھ کر بھاگ بھی گیا۔ ورنہ زارا کی اونچی ہیل کھوپڑی میں سوراخ کردیتی۔

☆ ☆ ☆

کئی ایکڑ تک پھیلے اس شان دار بنگلے نے ویسے ہی سدھ بدھ ختم کردی تھی۔ اوپر سے انٹرویو کے لیے اس طول و عرض پہ پھیلے کمرے کا خالصتاً "دفتری ماحول"۔ زین کا اعتماد بھربھری مٹی بنا ڈھیر ہوگیا۔ دیوار کے ساتھ ترتیب سے رکھی کرسیوں پر سارے ہی "باڈی بلڈرز" براجمان تھے۔

"یاالٰہی... اندر اکھاڑہ تو نہیں بنا رکھا؟" زین کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اوپر سے اس کا حلیہ بھی ماشاءاللہ تھا۔ زارا نے ابا کی پسند و ناپسند کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ اسے لگا شلوار قمیص کو چھوڑ کے کچھ اور پہن کر گیا تو ابا نے پہلے ہی مرحلے پر ناکام امیدوار بنادینا ہے۔ سو اس وقت ایک وہ ہی شلوار قمیص اور جمے ہوئے بالوں کے ساتھ پی ٹی وی کے ابتدائی دور کا انتہائی شریف ہیرو بنا بیٹھا تھا۔ باقی جو بھی تھے سب کے سب گورے چٹے' سونڈ بونڈ اور صحت کے معاملے میں مالا مال... زین کو تو شک گزرا بلیک واٹر کے اہلکار بھیس بدل کر نہ آبیٹھے

ہوں۔ دل میں منکرانہ خواہش بھی جاگی کہ کاش ایسا ہو۔ پھر کہاں کا انٹرویو اور کیسی نوکری۔ ابا اٹھ ہی جائیں اس بلیک واٹر کے ہاتھوں۔ مگر فی الحال فضا اور قسمت گردش میں تھی۔ بڑا گمبھیر ماحول بنا ہوا تھا۔

اسے خواہ مخواہ ٹھنڈ لگنے لگی۔ زارا بھی کسی شرمیلی نیک پروین کی طرح کہیں چھپی بیٹھی تھی۔ ایک آدھ جھلک دکھا جاتی تو اس کے لیے سہارا ہو جاتا۔ تھوڑی سپورٹ مل جاتی۔

"آ وجی۔ اگلا نمبر۔" معاً شرافت نے دروازے سے جھانک کے بے زاری سے کہا تو اس سے پہلے بیٹھا ایک پہلوان گردن اکڑائے، زمین روندتے اندر چلا گیا۔ اگلی باری اس کی تھی۔ یہ سوچتے ہی دانت تک بجنے لگے۔ اپنی سیٹ سے اٹھ کر بیچ کی ایک خالی کرسی پہ جا بیٹھا۔ انٹرویو دے کر پہلوان واپس آیا تو ساروں نے اس پر دھلوا بول دیا۔

"اوئے اوہیں ای۔ چاچا ایڈونچر کے موڈ میں تھا تب ہی اس انٹرویو کا شوشا چھوڑ دیا۔ انٹرویو نہیں بے عزتی ہے۔" وہ بڑا تنگ آیا ہوا تھا، پھپھولے پھوڑ کے گیا۔ زین کا منہ کچھ اور زرد ہوا۔ بیچ والی کرسی سے اٹھ کے سب سے آخر میں جا بیٹھا۔ دل کر رہا تھا اس کی باری کبھی نہ آئے۔ مگر کیا کریں دل تو بچہ ہے جی۔

"اوئے... یاوے۔" شرافت کی پکاریں ضائع گئیں تو اس نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ہڑبڑا اٹھا۔

"جاگو حیدر مراد۔ نمبر آگیا۔"

"ہائیں۔" کیسی بے فکری نیند نے دبوچا تھا۔ پانچ منٹ پورے شرافت کے ہیولے کو دیکھ دیکھ سوچتا رہا میں کہاں اور یہ کون؟ پھر جب حواس لوٹے بس نہیں چلا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ جائے۔

"شمبہ..." شرافت دانت نکوس رہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔ ہال کا خالی پن مزید خوف زدہ کر رہا تھا۔ یا باہر شام پہ رات حاوی ہو چکی تھی۔ دھڑ دھڑ کرتا کر کے انٹرویو والے کمرے میں داخل ہوا...

"و... آ..." جمائیاں روک روک [illegible] داخل ہوا انہیں چیخ پہلے برآمد ہوئی۔ وہ بے ساختہ مڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔

"ادھر... کدھر... بادشاہو۔" چوہدری حشمت کی گرج نے پیر جکڑ لیے۔

"وہ... آ... میں... مم میں یقیناً غلط جگہ آگیا۔" فائل سینے سے لگائے، منہ دروازے کی طرف کیے وہ بس ایک اڑان کا منتظر تھا۔ جس چوہدری پر وہ چار حرف بھیج کر شاپنگ پلازہ سے بھاگا تھا اس کا سامنا ہو گا اور بطور ایک سسر کے ہو گا یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"منہ پھیر... شاباش، ادھر منہ پھیر۔" فی الحال چاروں طرف موت ہی موت تھی۔ اس نے حکم مان کر رخ روشن چوہدری کی طرف کیا۔

"بیٹھ جا۔" ایک اور حکم۔ زین کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چوہدری... اپنی کسی فائل کو دیکھنے لگے۔

"جل تو جلال تو... زارا تمہیں نہیں چھوڑوں گا" تمہاری وجہ سے میں موت کے منہ میں آ بیٹھا ہوں، کاش کہیں سے سن گن مل جاتی تمہارے ابا یہ والے ہیں تو تو..."

"ہوں..." اس کی سوچ کو لگام چوہدری کی [illegible] ہوں نے لگائی۔

"آخری نمبر پہ برکت چوہدری [illegible] وہ ہی ہو؟" چوہدری بڑی تفصیلی [illegible] کے ساتھ اس کا جائزہ لینے لگے۔ [illegible] ہو گئی۔

"نن نہیں..." [illegible] گھڑی تھی قیامت خیز... تھوک بھی [illegible] گیا۔ چوہدری بغور اسے دیکھتے ہوئے [illegible] ہو گئے۔

"[illegible] سے لگ رہے ہو؟" وہ بظاہر خود سے بولے تھے لیکن زین نے سن لیا۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"وہ... وہ... مم میرا ددھیال ساہیوال سائیڈ کا ہے جی۔ شاید آپ جانتے ہوں، شکل مل رہی ہو گی۔" دل میں اس دعا کے ورد کے ساتھ کہ اللہ کرے بڈھے کی یادداشت پر کوئی وائرس حملہ کر دے یا آنکھوں پہ آندھی آجائے" وہ بری طرح بدحواسی سے بول پایا۔

"نہیں نہیں۔" چوہدری کو سخت ناگوار گزرا۔

"میرے جاننے والوں میں کوے کے بچے نہیں ہیں۔" زین نے پہلو بدلا۔

"مجھے کیوں لگ رہا ہے ہم ملے ہیں کہیں۔" چوہدری اب ماتھا سہلا رہے تھے، زین پہ جان کنی چھا گئی۔

"مم میں چلتا ہوں... مجھے دیر..." وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جا شہزادے۔" چوہدری کی دھاڑ پہ وہ کسی روبوٹ کی طرح پھر [illegible]

"ابھی انٹرویو [illegible] بھاگنے جانے کی پہلے سے پڑ گئی۔"

"لعنت ہو اس انٹرویو پہ۔" زین نے دل ہی دل میں لعنت [illegible] بے بسی سی بے بسی تھی۔

"کیا کرتے ہو؟" باضابطہ انٹرویو شروع ہوا۔ مگر چوہدری کی آنکھوں سے کھوج ختم نہیں ہوئی۔

"مم... کچھ نہیں۔"

"پھر آئے کیوں ہو؟" چوہدری یک دم غصے میں آگئے۔

"وہ غلطی سے... قسم لے لیں... بالکل پتا نہیں تھا۔ ابا جی آپ ہیں۔" اس وقت زبان و بیان سب دہشت زدہ تھے۔

"تجھے دیکھا ہے کہیں؟" چوہدری کی بھنویں ایک بار پھر سکڑ گئیں۔ زین نے فائل سینے سے لگائی۔ اب آر یا پار اس نے اٹھ کے لازمی بھاگنا تھا۔

"زارا کے ناکوں سے ہو؟"

"نن... نہیں۔"

"میرے خاندان کے بھی نہیں لگ رہے" ایسے بیٹے میں نے اپنے خاندان کے کبھی پیدا ہوتے نہیں دیکھے۔"

"میں چلتا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"رکو کوئی... تصویر آ تو رہی ہے دماغ میں، کہاں دیکھا ہے؟" زین نے چوہدری کے الفاظ کی تلوار گردن پہ پھرتی محسوس کی۔ جب تک وہ دروازے کی طرف لپکا چوہدری کی یادداشت جاگ گئی۔ شاپنگ مال میں لگے ملاحظہ سب کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"دلاور... او طیفے۔" اگلے لمحوں میں چوہدری کی دھاڑ سے پورے بنگلے کے در و دیوار لرز گئے۔

"نہیں۔" زین نے آنکھیں میچ کر روتی ہوئی آواز میں گویا آیا خطرہ بھگانا چاہا۔

"معاف کر دیں انکل۔" وہ بے ساختہ مڑا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کون ہیں، پلیز معاف کر دیں۔" مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ چوہدری کے "خلائی نشان" دلاور اور طیفا آ چکے تھے۔

"اوئے لے میرا ہی نہیں... میرے پورے خاندان کا تعارف کرواؤ۔" دلاور اور طیفا اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"معاف کر دیں انکل۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے، آپ زارا کے ابا جی ہیں، مجھے آپ کا خاندانی نسب نہیں جاننا، میں کیا کروں گا... بیٹے تو..." مگر تب تک طیفے نے گردن دبوچ لی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ سفید نرم روئی کے گالوں سے بادل آسمان پر تیرتے پھر رہے تھے۔ اس موسم کی دلفریبی سے بے نیاز شرمندہ و رنجیدہ زارا انگلیاں مروڑتی کسی مجرم کے انداز میں بول رہی تھی۔

"مجھے کیا پتا تھا تمہاری اور ابا کی ملاقات پہلے ہو چکی ہے۔ پتا ہوتا تو کیوں بلاتی؟" مگر یہ شرمندگی بس اتنی تھی۔ دوسرے پل وہ لہجہ بدل کر غیرت دلا رہی تھی۔

"اور اتنے عاشق ہو تم۔ دو چار مکوں سے ڈر گئے؟ وہ بھی تھے، جو پہاڑوں سے نہریں نکال کر جسموں پر پتھر کھا کر محبت کی تاریخ میں امر ہو گئے۔" جل کر راکھ ہوتا زین اپنی آنکھ سے ہاتھ ہٹا کر بڑا سا نیل اور سوجن دکھاتے چیخا۔

"ہاں تو میں بھی میدان محبت میں سرخرو ہوا

ہوں۔ یہ۔" آنکھ دکھائی۔

"وہ" "پھر کس نے؟"

"یہ۔" آخر میں گردن دکھاتے ہوئے دہائی سی دی۔

"ہر جگہ تمہاری محبت کی مہر لگوائی ہے' جوڑ جوڑ ہلا ڈالا تمہارے ابا نے۔" زارا کی شکل اتر گئی' واقعی ابا کے چیلوں نے پرانی دشمنی نکالی تھی شاید۔

"ابا نہیں سرکار رو رہے ہیں۔ آدم خوروں کے خاندان سے لگتے ہیں' چاہے کسی سے پوچھ لو۔"

"زین۔۔۔" زارا کی ساری ہمدردی' درشتی میں بدل گئی۔

"جھوٹ تھوڑی کہہ رہا ہوں۔" زارا کے غصے میں دم ہوتا تھا' وہ پھدک کر منمنایا۔

"میری باپ پر گئی ہے' اس لیے تو برداشت کر رہی ہے مجھ سے تو ایک سیکنڈ بھی برداشت نہیں ہوتے ابا جی۔" یہ سب دل میں کہا تھا۔

"تم میرے ابا جی کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔" زارا چیخی۔

"اتنے ڈینٹ لگوانے کے بعد قصیدے تو پڑھنے سے رہا۔" اس نے جانی ہوئی آنکھ دکھا کر بہادری سے کہا۔

"تو۔" زارا کا موروثی غصہ جاگ اٹھا۔ دونوں ہاتھ آگے کرکے اس نے گویا زین کی گردن دبانی چاہی۔ پھر ہاتھ گراتی' دانت پیستی' بیگ اٹھاتی حسب عادت ناراض ہو کر چل دی۔

"میں بھی نہیں جاتا منانے۔" زین بظاہر بے نیاز بنا رہا۔

"اس کی خاطر گدھوں کی طرح ٹھنڈے کھائے۔ بجائے مرہم لگانے کے اور مرچیں ڈال گئی۔" کچھ دیر وہیں بینچ پر بیٹھا رہا۔ مگر زارا کو منائے بغیر چین کہاں آنا تھا۔

"زارا۔۔۔ تیرے عشق نے مارا۔" ایک آہ کے ساتھ وہ اس کے پیچھے گیا کہ محبت میں [illegible] عقل مندی ہے۔

☆ ☆ ☆

آئس کریم بار سے ہنستے مسکراتے نکلتے وہ دونوں سو فیصد زارا اور زین ہی تھے۔ چوہدری حشمت کو اپنی یادداشت پہ مکمل بھروسہ تھا اور اپنی بینائی پہ بھی۔ بار کے سامنے آئس کریم کھاتے کسی بحث میں الجھے زارا اور زین انہیں ساکت کر گئے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے دونوں گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے چلے بھی گئے اور وہ اس صدمے کے زیر اثر ایسے گم سم ہوئے کہ یہ تک بھول گئے انہیں روڈ کراس کرنا ہے' وہ بس سڑک کے عین وسط میں کھڑے ایسے پتھرائے کہ تیز رفتار سے آتی وہ کار بریک مارتے مارتے بھی ان سے ٹکرا گئی۔ جب تک طیفا اور دلاور ان کے سر پہ پہنچے وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔

"مار ڈالا۔۔۔ مار ڈالا ہمارے چوہدری صاحب کو۔۔۔ اوئے لوگو پکڑو۔۔۔ پولیس کیس ہے' ڈرائیور کی غلطی سے ہمارے چوہدری۔۔۔"

"شٹ اپ۔" تیز ناگوار نسوانی آواز نے دلاور کے بین میں رخنہ ڈال دیا۔

"نہیں مرے یہ۔۔۔ انہیں اٹھا کر میری گاڑی میں ڈالو۔" وہ خود گاڑی کی طرف بڑھ بھی گئیں۔

☆ ☆ ☆

مخصوص دواؤں اور جراثیم کش [illegible] کی بو۔۔۔ اور قطعی اجنبی جگہ نے چوہدری کو پریشان کر دیا۔

"یہ میں کدھر آگیا؟"

"زندگی اسپتال میں۔" کسمساتے ہوئے چوہدری نے [illegible] پوری آنکھیں کھول کر دیکھا اور [illegible] تک کہ ڈاکٹر درخشاں کے تیوری چڑھ گئی۔

"تیاری تو اس دنیا میں جانے کی تھی آپ کی۔" درخشاں نے اوپر کی جانب انگلی اٹھا کر طنزاً کہا۔

"مگر شاید منظور خدا نہیں تھا' واپس پلٹ آئے۔" چوہدری کو گویا جادو کے اثر سے گونگا کر دیا گیا ہو۔ یک ٹک درخشاں کی جانب تکتے رہے' جو حسن و خوب

صورتی کے ساتھ وقار و تمکنت میں بھی اپنی مثال آپ لگ رہی تھیں۔

"جسم ذرا تو پھیلا رکھا ہے۔" یہ طنز ان کی صحت پہ تھا' جس پر وہ فخر کرتے تھے۔

"ورنہ اتنا ہی کم۔ ذرا سی ٹکر سے بے ہوش ہو گئے۔" چوہدری کو سمجھ نہیں آئی وہ کیا جواب دیں۔ فی الحال وہ دیکھنے کے موڈ میں تھے یا صرف سننے کے۔

"ہائے والے۔۔۔ آئندہ خودکشی کا ارادہ ہو تو ریلوے ٹریک زیادہ بہتر ہے گا۔ سڑک پر مجھ جیسی بھی ڈرائیور ہوتی ہیں' جنہیں انسانی جانوں کی قدر و قیمت کا احساس باخوبی ہوتا ہے۔" چوہدری کی آنکھیں بالکل بٹن ہو گئی تھیں۔ بالکل ساکت درخشاں کے ہلتے ہونٹوں سے پھسلتے بین پہ کہاں کہاں نہیں آنکھیں [illegible] گئی تھیں۔

"ظاہر ہے پھر ہم جیسے ڈرائیور ٹکر مارنے میں کچھ رعایت کر جاتے ہیں۔"

"اوئے طیفے۔۔۔ یہ اسپتال ہے یا پرستان؟" اور جب وہ بولے درخشاں کا دماغ گھما گئے۔۔۔ آنکھیں سکوڑ کر چوہدری کو دیکھا۔

"لگتا ہے دماغی توازن متاثر ہوا ہے۔" بہت ناگواری سے انہوں نے باآواز بلند بڑبڑانا برا نہیں سمجھا۔

"آپ کے گارڈز باہر آپ کا ویٹ کر رہے ہیں' آپ جا سکتے ہیں۔" درخشاں نے بے حد پیشہ ورانہ انداز میں کہہ کر چوہدری کو چونکایا۔

"ہاں۔۔۔ آں۔" نہ جانے کیوں وہ رکنے کے خواہش مند ہوئے۔ جب ہی بے ساختہ ٹٹول ٹٹول کر جسم جانچنے لگے شاید کہیں کوئی گہری چوٹ موجود ہو۔ مگر۔

"ڈونٹ وری۔۔۔ آپ کے سارے جوڑ سلامت ہیں۔" درخشاں اب پوری طرح سے بے زار ہو چکی تھیں۔ چوہدری کو جانا پڑا۔

☆ ☆ ☆

"وہ دو ٹکے کا۔۔۔ وہ' جس کی شکل پہ فاقے لکھے ہیں' وہ ہے چوہدری حشمت کی بیٹی کے لائق؟" زارا کا سر مزید جھک گیا۔ چوہدری اپنے غیض و غضب میں پہلی بار نظر آرہے تھے۔ آج تک انہوں نے اسے کڑی نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا اور آج اس شدت سے ڈانٹ رہے تھے کہ زارا خوف زدہ ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ابا یوں اس کی اور زین کی دوستی سے واقف ہو جائیں گے۔ زین کی پوزیشن اب کلیئر ہوتی بھی تو کیسے؟

"میں پوچھتا ہوں' میری مرضی کے بغیر اسے اس گھر میں بلایا کیوں؟ وہ یہاں آیا کیوں؟"

"وہ۔ وہ انٹرویو۔" ڈرتے ڈرتے زارا نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ پھر سے گرجے۔

"انٹرویو خاندانی بچوں کا تھا' چور اچکوں' سڑک چھاپوں کا نہیں۔"

"ابا جی۔۔۔ وہ ایسا۔۔۔" تھوک نگل کر ایک اور کمزور دفاع کرنا چاہا مگر چوہدری سننا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔

"بس۔۔۔ مجھے اس لفنگے کی وکالت میں ایک لفظ بھی نہیں سننا۔ وہ بھی اپنی بیٹی کے منہ سے۔" زارا نے پھر سے سر جھکا دیا۔ آنکھیں برسنے کو تیار تھیں' مگر ابا آج آنسو پونچھنے کے روادار نہیں تھے۔

"ایک سے ایک لڑکا خاندان میں موجود ہے' تمہیں پسند بھی آیا تو خاندان سے باہر وہ سوکھے کا مریض' جس کے خاندانی ہونے پہ بھی مجھے شک ہے' پتا نہیں موچیوں کی اولاد ہے یا دھوبیوں کی۔"

"نہیں ابا جی وہ۔" اس بار چوہدری نے صرف ایک گھوری سے کام چلایا۔ زارا نے باقی کے الفاظ نگل لیے۔

"مکار لڑکا۔۔۔ ایک نمبر کا عیار لگتا ہے۔" زارا کی برداشت ہمت سے باہر ہوئی تو وہ زور' زور سے ہچکیاں لیتی کمرے سے بھاگ گئی۔ چوہدری نے ہونٹ بھینچ کر پہلے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر مرحومہ بیوی کی تصویر کو۔ وہ الگ غضب ڈھا رہی تھی۔ آنکھوں سے جلال عیاں تھا۔ چوہدری کے خون میں اور زیادہ ابال اٹھے۔

"تمہارے کیوں تیور بدلے ہوئے ہیں۔" چوہدری نے بھڑک کر سوال کیا۔

☼ ☼ ☼

چوہدری حشمت کا ردعمل گو کہ توقع کے عین مطابق تھا مگر جو بھی تھا بہت تکلیف دہ تھا وہ رات کی کمرے میں بند ہوئی صبح ناشتے کے وقت بھی نہیں نکلی۔ شرافت دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک گیا۔ ابھی بھی دن کے کھانے کا وقت تھا اور وہ بستر پر اوندھی لیٹی غم منا رہی تھی جب شرافت نے دروازہ بجا کر پوچھا۔

"بی بی کھانا لے آؤں یا آپ آ رہی ہیں۔"

"لے آؤ۔ مگر کھانا نہیں زہر۔" روتے روتے وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔

"بی بی جی چوہدری صاحب کہہ رہے ہیں تھوڑا سا کھالیں رات سے بھوکی ہیں۔"

"ہاں جیسے خود چلے آتے ہیں مجھے کھلانے۔" اس کا دل ملال زدہ ہوا۔

"اور تم دفع ہو جاؤ نہیں تو گلا دبا دوں گی۔" اس کے بعد خاموشی چھائی یعنی شرافت دفع ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بیڈ پر رنجور ہوتی سسکیاں بھرتی رہی۔ پھر مرحومہ ماں کی تصویر کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"ماں۔۔۔ آپ نہیں سمجھا سکتیں ابا کو۔" بھرائی آواز میں اس نے یوں کہا جیسے ماں روبرو ہوں جیتی جاگتی۔

"پلیز انہیں سمجھائیں بھلے خواب میں چلی جائیں ان کے۔۔۔ آج کہیں ہر بات ہر رشتہ کو کسی تھی اور کھن میں نہ تولا کریں۔ ضروری تو نہیں ان کا داماد وہی ہو جو دیسی گھی کی چوریاں کھا کر جوان ہوا ہو اسی کلو وزن ہو۔ بیٹھکیں لگاتا ہو۔ پلیز اماں۔" کہتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئی۔

☼ ☼ ☼

زارا دو دن سے سامنے نہیں آئی تھی چوہدری حشمت کے گویا دن بھی اندھیرے ہو گئے بے جا لاڈ پیار کے اثرات اب ظاہر ہونے لگے تھے انہیں اپنی تربیت اور زارا کی ضد بری طرح سے کھٹک رہی تھی۔

"تو یہ ہے آج کی اولاد۔ بڑھاپے میں خاک پھنکوانے تک آ گئی۔" مرحومہ بیوی کے تاثرات ایسے ہو رہے ہیں جیسے بس میں ہو تو چوہدری کو کاٹ پھاڑ دیں۔ چوہدری خاصے دکھی ہو رہے تھے۔

"بچی میری اتنی بڑی ہو گئی کہ اپنے فیصلے خود کرنے لگی۔ باپ کی کوئی اہمیت کوئی حیثیت ہی نہیں۔" پھر یکدم انہوں نے پینترا بدلا۔

"مگر میری بھی سن لو۔ اس لڑکے کو جیل بھجوا دوں گا داماد نہیں بناؤں گا۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ماموں کا بیٹا پسند آگیا ہے۔ تمہارے خاندان کے باقی لڑکوں سے وکھرا ہے۔ لال سرخ' داماد بن کر میرے ساتھ سجے گا بھی۔" چوہدری نے بغور دیکھا تو محسوس ہوا۔ مرحومہ بیوی خاصی درشتی سے آنکھیں نکال کر دیکھ رہی ہیں۔ انہیں جھرجھری آ گئی۔

"میں نہیں اثر لینے والا۔" انہوں نے خود کو جیسے یقین دلانا چاہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اتنے بڑے گھر میں صرف دو فرد رہتے ہوں اور دونوں کے منہ مشرق' مغرب کی جانب ہوں تو لازمی دل خراب ہوتا ہے۔ جو زارا کا تو ہو رہا تھا چوہدری کا ضرور ہوا۔ زارا کی ہٹ دھرمی ان سے کسی طور کم نہیں ہوئی۔ جب چوہدری صاحب گھر میں ہوتے وہ کمرہ بند ہو جاتی۔ پہلے چوہدری کو ملال ہوتا تھا اب ملال ہوتا۔ لاڈلی بیٹی کا یہ رویہ سارا دن دل دکھانے کا باعث بن رہا تھا۔ ایک دن اور یہ سلسلہ رہا تو وہ کمزور پڑ جائیں گے۔ زارا کو سر پہ سوار کرنے والے بھی وہ خود تھے اور اب اس کی اس ضد کا ذمہ دار بھی خود کو سمجھنے لگے۔

"اسے حد میں رکھ کر محبت دیتے تو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ سچ ہے اولاد شر ہوتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

دیدہ زیب' قیمتی پر تعیش سامان سے مزین ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر وہ جونہی اندر داخل ہوا۔ آواز آئی۔

"چند روز منٹ اور پر ہو گئے ہیں۔" زین لڑکھڑا سا گیا۔ چوہدری حشمت اس کے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھے اور کڑی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"اتنی دیر؟" ان کا لہجہ سرد اور قدرے غیریت لیے ہوئے تھا۔ زین کی گھبراہٹ اعتماد کو کھا گئی۔

"وہ۔۔۔ آ۔۔۔ م۔۔۔ میری گاڑی خراب ہو گئی تھی تو۔۔۔"

"دوسری گاڑی نہیں تھی؟" بات کاٹ کر چوہدری نے لہجہ بھی کٹیلا بنایا۔

"دوسری۔" زین نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"دوسری بھی ورکشاپ میں۔" چوہدری نے طنز کیا۔ زین نے بے ساختہ ٹھنڈی آہ کھینچی اسے لگا محبت میں بھی ہے کڑی' جتنی خواری اس کے نصیب میں آ رہی ہے اتنی مجنوں' فرہاد نے بھی نہیں سہی ہو گی۔ چوہدری کے اشارے پر وہ سمت کر بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟" کچھ دیر زین کے جائزے کے بعد سنجیدگی سے سوال ہوا۔

"ابا جی پہیلیاں بڑی بجھواتے ہیں۔" زین نے دل میں سوچا۔

"زارا سے پہلی بار کب ملے تھے؟" چوہدری کو ناچار موضوع کی طرف آنا پڑا۔

"ایک سال ہو گیا۔" کسی شرمیلی لڑکی کی طرح زین نے بتایا۔

"پتہ نہیں کون سے جھانسے کون سے سبز باغ دکھائے میری بچی کو کہ وہ تمہارے چنگل میں پھنس گئی۔"

"جھانسے' سبز گل۔۔۔ چنگل۔" وہ حیران کم پریشان زیادہ ہوا۔ چوہدری کی اردو بھی بھاری بھی لٹن کی طرح۔

"اس کا انجام جانتے ہو۔۔۔؟" بڑا کٹھور اور سنگدلانہ انداز تھا زین کا چہرہ فق ہو گیا۔

"میں حشمت نگر کا چوہدری۔۔۔ کئی مربعوں کا مالک۔"

چوہدری صاحب اب کھڑے ہو گئے۔ باقاعدہ ٹہل ٹہل کر بات کرنے لگے۔ زین کی گردن بھی ان کے ساتھ گھومنے لگی۔ صورت حال خوفناک ہونے لگی تھی۔ چلتے چلتے چوہدری زین کے قریب آکھڑے ہوئے۔

"مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا ہے یا میں اتنا سٹھیا گیا ہوں کہ تم کو اپنی نازوں پلی بچی دے دوں۔"

"مجھ جیسے کو۔" زین بے ساختہ بڑبڑایا۔

"میں حیران ہوں میری بچی نے تم میں دیکھا کیا؟"

"بچی نے بتایا نہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں حساب برابر کر رہا تھا۔

"تمیز' تہذیب تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ بزرگوں کی عزت کا سلیقہ نہیں شکل و صورت سے بھی بھیکی پھیکی ہے۔ اور چلے ہو چوہدری حشمت کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے۔" چوہدری حشمت نے تمسخرانہ کہہ کر زین کو ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پہلے تو سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"آپ کو آپ کی سسرال نے۔" کچھ قریب ہو کر وہ رازدارانہ کہتا گیا۔

"یہ منہ ہوتے ہوئے بھی بیٹی دے دی تھی تو۔۔۔" اس نے چوہدری کے منہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"مجھے بھی رشتہ مل جائے گا وہ بھی اس گھر سے۔" وہ نہایت پرسکون نظر آ رہا تھا چوہدری کی سانس تیز ہو گئی۔

"او ئے میں تیرا۔"

"میری بات سن لیں۔ ابا جی۔"

"ابا جی۔" چوہدری کی تیز چلتی سانس اٹک گئی یہ سن کر۔

"شکل تو میری اور آپ کی اللہ نے بنائی ہے۔ اس پہ کیا اعتراض باقی سلیقے سکھانے کے لیے آپ ہیں نا۔" وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔ چوہدری مٹھیاں کھولنے بھینچنے میں لگے رہے۔

"رہی بات زمینوں کی تو میرے دادا کے بھی ساہیوال سائیڈ پہ کئی گاؤں ملکیت ہیں۔"

"کئی گاؤں۔" چوہدری کی آواز پھنس گئی۔

"ساہیوال میں ہی۔ مبارک نائی کا خاندان بستا ہے۔ ہمارے سارے مردانگی سے تجامتیں بنواتے تھے۔"

"مبارک نائی۔" چوہدری کی رنگت بگڑنے لگی۔

"ہوئے اسے میری خاندانی تاریخ کا کیسے پتا۔" انہوں نے رخ پھیر کر خود کلامی کی زین سے منہ چھپانے کو ول کر رہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں انہیں۔" چوہدری کی حالت سے محظوظ ہوتا وہ قریب آکر بھولپن سے پوچھنے لگا۔

چوہدری اچھل پڑے۔

"ہوئے حرام مغزے۔ طیفا اور دلاور۔"

"کیوں زحمت دیتے ہیں انہیں۔ میں خود جا رہا ہوں۔" دروازے تک جا کر پھر سے پلٹا۔

"ویسے سوچیے گا ضرور میرے بارے میں؟" اور چلا گیا۔ چوہدری کی نیند سکون سب اڑا کے۔

☼ ☼ ☼

اس شام "زندگی ہسپتال" سے گزرتے ان کے پاؤں خود بخود بریک پہ جا پڑے۔ ایک شاندار اور باوقار چہرہ نظروں کے سامنے کیا آیا۔ وہ کشاں کشاں ہسپتال کے اندر چلے گئے۔ ڈاکٹر درخشاں اپنے روم میں ہیں یا نہیں۔ بنا کسی سے پوچھے وہ منہ اٹھائے ان کے روم میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر درخشاں کسی میڈیکل کی کتاب میں گم تھیں۔

"السلام علیکم۔" گلا کھنکار کر چوہدری صاحب نے اونچی آواز میں کہا تو درخشاں ان کی جانب متوجہ ہوئیں۔ اپنے کمرے میں ایک بالکل اجنبی کی موجودگی بغیر کسی اجازت کے ان کو مشتعل کر گئی۔

"آپ کیسے آئے؟" غالباً وہ کہنا چاہ رہی تھیں بغیر دستک کیسے آئے۔ مگر چوہدری کو معنی سمجھنے کا شوق نہیں تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" ان کی مسکراہٹ ہونٹوں پہ ٹھہر سی گئی تھی۔

"کیا مطلب کیسی ہیں؟" درخشاں نے بے پناہ غصے سے تیز آواز میں پوچھا۔

"کیسی ہیں مطلب کیسی ہیں؟" چوہدری صاحب نے مذاق کا رنگ دکھانا چاہا مگر درخشاں قطعی اس موڈ میں نہیں تھیں۔

"لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں چوہدری حشمت۔ وہ جس کی ٹکر۔" درخشاں کے چہرے پر شناسائی کی رمق جھلکتے دیکھ کر انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"دروازہ ناک کر کے آیا کرتے ہیں۔" دانت پیس کر درخشاں نے تھوڑے سے اخلاق سکھانے چاہے۔

"کیسے آگئے آپ۔ اپائنٹمنٹ لیا تھا آپ نے؟" درخشاں کے ماتھے پر بے شمار بل تھے۔

"نہیں جی۔ تاحال تو نہیں لیا۔" چوہدری کو خجل ہونا پڑا۔ درخشاں نے ہونٹ بھینچ لیے اول روز سے اس بندے سے انہیں عجیب قسم کی چڑ ہو گئی تھی۔

"دل نے پریشان کر رکھا ہے۔ سنبھل ہی نہیں رہا۔" چوہدری خالص عاشقوں کے انداز میں ذو معنی زبان بولے۔

"میں سمجھی نہیں۔" درخشاں نے ناگواری سے پوچھا۔

"مطلب۔ درد ہی درد ہے۔"

"تو آپ اپنے کارڈیالوجسٹ سے رجوع کریں۔ میرا یہ کام نہیں۔" درخشاں ابھی کسی لحاظ مروت کے حق میں نہیں تھیں۔

"وہ خود بے چارہ دل کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔ مم مطلب دل کا دورہ۔"

"دیکھیے میری اوور ختم ہو رہے ہیں آئی ہیو تو گو۔ آپ ڈاکٹر مظفر کو دکھا سکتے ہیں۔"

اپنا سامان موبائل، بیگ سمیٹتے انہوں نے چوہدری پر ایک کے بعد دوسری نگاہ تک ڈالنا گوارا نہیں کی اور بے چارہ چاچا چوہدری بالوں پہ ہاتھ پھیر کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

آج کل زارا گھبروں بی جی کے دوپاٹوں میں پس رہی تھی۔ ابا کو زین کے حق میں رام کرنے کا سوال ہی نہیں تھا اور زین بھی کم ناک میں دم نہیں کر رہا تھا۔ اسے باقاعدہ سلفاکر بھیجتی کہ ابا کے سامنے یوں بیٹھنا، یوں بولنا، یوں چلنا، اور وہ زین ہی کیا جو اس کے کہے پر چلے۔ صورت حال سدھرنے کی فی الحال کہیں سے امید نہیں تھی۔

"یقین نہیں آتا ابا ایسے ہو سکتے ہیں۔ پتا نہیں بی جی نے ایسا ابا کہاں سے لبا (ڈھونڈا)۔" کبھی کبھی وہ چڑچڑی چھوڑتا زارا زچ ہو جاتی۔

"میں اس لیے پوچھ رہا ہوں تمہارے اصلی والے ابا ہیں نا کہ مجھ پہ کیے۔"

"زین میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" وہ روہانسی ہو جاتی۔

"سپ سوزرا کہتے ہیں ایسا داماد چاہیے جو میرے ساتھ ہو کے ہو جاؤ بیٹی کا چاہے باپ لگے۔"

"تو بس ختم کرو یہ محبت کے ڈھکوسلے، چھوڑ دو مجھے بھی سکون مل جائے گا اور تمہیں بھی بار بار آکر میرے سامنے دکھڑے مت رویا کرو۔"

"یار دکھڑے جتنے رو دوں شادی تو میں تم سے ہی کروں گا۔ میری محبت میں ضد آگئی ہے اور ضد میں منوا لیتا ہوں۔"

یہاں آکر زارا کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے، جانتی تھی جتنا بھی لاپروا سہی، زین اس سے پیار بہت کرتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رات کی بانہوں میں چاند سجا تھا۔ مگر گزشتہ کئی راتوں سے ان کی نیند غائب تھی۔ کھڑکی سے خوابیدہ چاند کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں دھندلائیں۔ تو وہ بیڈ پر آلیٹے، سامنے سارے وجود میں اضمحلال و تھکن رچ گئی تھی۔ وہ لپنے کے عہد سے ہار رہے تھے مگر ہارنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہ الگ بات تھی، وہ کمزور پڑ رہے تھے۔ اور اس پل اگر وہ مرحومہ بیوی کی تصویر دیکھ لیتے تو شاید نظریں چرا لیتے۔ یوں محسوس کرتے جیسے [illegible] چوہدری لطف لے رہی ہوں، ان کی اس پسپائی پہ [illegible] کر کے مسکرانا چاہ رہی ہوں۔

آپ چپ بیٹھے ہو ضرور کوئی بات ہے
پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے

اور شاید دماغ پر سوار کرنے کا اثر تھا کہ اگلی رات انہیں کسی واقف کار کے ہمراہ ہوٹل کے انٹرنس سے داخل ہوتے وقت نظر غیر ارادتاً سامنے گئی اور پلٹنا بھول گئی۔ درخشاں اپنی فرینڈز کے ہمراہ ڈنر کرنے آئی تھیں، سج سج کر چلتے چوہدری ایسی جگہ جا بیٹھے جہاں سے درخشاں کو دیکھنا مشکل نہیں تھا اور اس چند منٹوں کے دیکھنے میں چوہدری نے درخشاں کا ایک ایک نقش ازبر کر لیا۔ ڈنر سے فراغت کے بعد جب بل ادا کرنے کا وقت آیا تو درخشاں یہ جان کر اچنبھے میں گھر گئیں ان کا بل ادا ہو گیا تھا۔

"بل پے ہو گیا؟ کس نے کیا؟"

"ان صاحب نے۔" ویٹر کی نشاندہی پر درخشاں نے دیکھا اور خاصے برداشت کا مظاہرہ کرتے اندر کے ابال پہ قابو پایا۔ ساتھ بیٹھی خواتین سے "ابھی آتی ہوں" کہہ کر وہ اٹھ کر چوہدری تک پہنچی تھیں۔ چوہدری صاحب اب اکیلے تھے، قریب آتی درخشاں پر پڑتی ان مسکراتی نظروں میں تب تشویش اور دوسے بھر گئے جب وہ ٹیبل تک پہنچ گئیں۔

"کیا سوچ کر آپ نے پھر بل پے کیا؟" دونوں ہاتھ ٹیبل پہ رکھے وہ حتی المقدور غصہ دبا کر غرائیں۔

چوہدری حواس باختہ ہو گئے۔

"وہ۔ میں نے ایسے۔" گھبراہٹ میں جملہ بھی پورا نہیں ہو سکا۔

"عجیب چیکو انسان ہیں آپ ایک بار نرمی سے بات کیا کر لی آپ پیچھے ہی پڑ گئے۔" چوہدری کی بوکھلاہٹ میں خفت بھی شامل ہو گئی۔

"مجھے دانہ ڈال رہے ہیں؟ اپنی اور میری عمر تو دیکھ لیں پہلے۔ میں وہ نہیں جو آپ سمجھے۔" درخشاں صرف دیکھنے کی نازک تھیں۔ وہ کٹھن سخت اور کٹھور، یہ چوہدری کو ابھی ابھی پتا لگا۔

"آئندہ میرے راستے میں آنے کی یا مجھ پر ایسی مہربانیاں کرنے کی کوشش کی تو پھر نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے' تماشا بنوا دوں گی۔" انگلی سے میز ٹھوک کر عزائم بتانے کے بعد وہ چلی بھی گئیں۔ ایک طرح سے چوہدری کی جان نکال گئیں۔ ان کے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

چار دن سے وہ نہ کیمپس جا رہی تھی اور نہ فون پہ دستیاب تھی۔ اس رات شرافت کے سیل فون میں اپنی کوئی پرانی سم ڈال کے وہ زین کا نمبر ملا چکی تھی۔ ابا جی آج کل گھر ہوتے تو اپنے کمرے میں ہی رہتے۔ زارا کو وہ ان دنوں کچھ چپ چپ اور گم سم سے نظر آئے۔

زین نے چھوٹتے ہی فون ریسیو کیا تھا۔ اور ایک ساتھ کئی گلے کر ڈالے۔ کیمپس نہ آنے سے رابطہ نہ کرنے تک۔ "ہوا کیا؟" اس نے ابا جی کے سیل قبضہ کرنے اور نئے حکم کی بابت سب کچھ کہہ سنایا۔ زین کے قہقہے ابل پڑے۔

"تم ہنس رہے ہو؟" زارا کے زخموں پر نمک چھڑکا۔

"بات ہی ایسی بتائی ہے تم نے۔" وہ ہنسی کے بیچ بدقت بول پایا۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں بند کر رہی ہوں فون۔"

"ارے ارے۔ فون بند مت کرنا۔ لو میں نے ہنسی بند کرلی۔" اور اس نے واقعی ہنسنا بند کر دیا۔

"وہ کیمپس نہ آنے کی وجہ بھی یہ ہی تھی؟" زارا کی خاموشی محسوس کر کے اسے کہنا پڑا۔

"ظاہر ہے۔" زارا نے منہ بسورا۔

"دو' دو گن مینوں کے ساتھ آ کر میں نے اپنا مذاق نہیں اڑوانا۔" وہ حد درجہ رو کھی ہوئی۔

"ارے کوئی مذاق وذاق نہیں بنے گا۔ الٹا رعب بیٹھ جائے گی' سب ہمیں کے کسی وزیر [illegible] ہے۔"

"میری دھاک پہلے سے بیٹھی ہوئی ہے۔" زارا کو اکلوتا مذاق اڑ رہا ہے تب ہی منہ بنایا۔

"میرے ابا کسی وزیر سے کم نہیں۔"

"بات یاد آیا' ان سے کہو کیوں کیدو بن رہے ہیں' خود کیا کم تھے جو اپنے بیٹے بھی چھوڑ دیے میرے پیچھے۔"

"تم پٹڑی سے اتر رہے ہو' حد میں رہو۔" زارا حسب عادت غیرت میں آگئی تھی۔

ادھر ابا اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہے تھے۔ گاہے بہ گاہے مرحومہ بیگم کی تصویر بھی دیکھ لیتے۔

"کیا خیال ہے میں کچھ زیادہ موٹا نہیں ہو گیا؟" مرحومہ بیوی کے چہرے پہ مستی خیزی نظر آ رہی تھی۔ چوہدری اب اپنے بالوں پر نظر ڈالتے ہوئے بولے

"یہ بال بھی ایک دم سے سفید ہو گئے۔ اتنا بڈھا تو نہیں ہوا' پچاس سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔" اچٹتی نظر مرحومہ بیوی پر بھی ڈالی' اب کے وہ تمسخرانہ مسکرائی رہیں۔

"زارا ٹھیک کہتی ہے' میں بالکل ہی ملنگ ہو گیا ہوں۔" اس دفعہ تصویر دیکھنے سے گریز کیا۔

"صحیح ہے دنیا میں رہتے ہوئے دنیا والوں کے طور طریقے سیکھنے پڑ جاتے ہیں۔ چاہے دل [illegible] ہو۔" ابھی بھی تصویر کی جانب [illegible] رکھی۔ مگر یوں لگا جیسے زارا کی [illegible] رہی ہوں۔

☼ ☼ ☼

صبح جب [illegible] بیدار ہوتے ہی وہ چچا کے پائی کے [illegible] لاؤنج میں جیسے ہی داخل ہوئی۔ عین [illegible] چوہدری صاحب نے بھی لاؤنج میں قدم رکھا' شرافت [illegible] صفائی کر رہا تھا۔

"ہوں۔" چوہدری پہ نظر پڑنے کی دیر تھی۔ وہ اتنی زور سے چیخا کہ چوہدری بھی ڈر گئے۔ زارا کی مندی آنکھیں الگ پھٹ سی گئیں۔

"انسان بن انسان۔" اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر چوہدری بلا وجہ شرافت پر دھاڑے۔

"جا منہ دھو کے آ' نیند بھگا۔" پھر زارا کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ چوہدری نے نظریں چرا لیں۔ ہمیشہ کلف والی شلوار قمیص میں رہنے والے چوہدری کا آج حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ کوٹ پتلون ہی نہیں بال بھی رنگے ہوئے تھے' بالکل سیاہ۔

"ابا جی۔" ابا جی سے بیٹی کی طرف [illegible] گیا۔

"تم گئی نہیں۔" موضوع بدل کر انہوں نے رعب دکھانا چاہا پر ناکامی ہوئی۔ زارا نے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں [illegible] بولا نہ گیا تو صرف نفی میں سر ہلایا۔

"[illegible] میں طیفے اور دلاور کو لے جا رہا ہوں [illegible] چوہدری صاحب کھسکے' وہاں وہ شرافت کے سیل پر زین کا نمبر ملا کر چلائی۔

"زین۔ میرے ابا جی۔"

"گزر گئے؟" زارا کے جوش سے وہ یہی سمجھا۔

"شٹ اپ۔ وہ آج بالکل نئے ابا بن گئے۔" وہ پہلے بتائی پھر جوش سے چہکی۔

"یعنی راضی ہو گئے۔" زین نے باچھیں پھیلا لیں۔ اس کے خیال میں وہ نئے ابا تب ہی بن سکتے تھے جب تھوڑا جھک جاتے۔

"نہیں الو۔" زارا نے دانت کچکچائے۔

"پھر کہاں سے نئے ابا ہے؟" زین کا سارا تجسس ہوا ہو گیا۔

"مجھے لگتا ہے انہوں نے اپنا انتظام کر لیا ہے۔" زارا کی چنگاری الگ تھی۔

"کہیں کوچ کر رہے ہیں؟ اتنے ناراض ہیں کیا؟ الگ گھر میں رہیں گے تم کو اکیلا چھوڑ کر۔"

"کوعت۔" وہ سامنے نہیں تھا' ورنہ وہ کس کے لگا کے سمجھاتی۔

"میں آ رہی ہوں' طیفا اور دلاور کو ابا لے گئے۔ میں آ کر سمجھاتی ہوں۔" وہ جھوٹی اشتعالی تیار ہونے چل دی۔

☼ ☼ ☼

[illegible] کی اس چمک دار محفل میں چوہدری نے ابھی لطف لینا شروع کیا ہی تھا کہ وہ نظر [illegible] جہاں زارا کے چھکے چھوٹے وہاں ان کی آنکھیں [illegible] لگیں۔

"یہ یہ یہ۔" شدت اشتعال نے ان کی زبان گنگ کر دی۔ زارا نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ "بیل مجھے مار" کے مصداق وہ ابا جی کو لے تو آئی تھی' اب ان کے عتاب کو سر جھکا کر سہنا بھی تھا۔

"تمہاری سہیلی نے اس لپے لفنگے کو بھی بلا لیا؟" ابا جی غرائے تھے۔ اب وہ کیا بتاتی۔ سہیلی بھی وہ ہی تھا۔ پر سوں جب اس نے کہا تھا کہ آج کے فنکشن میں ابا جی کو ضرور لانا تو زارا نے دو ٹوک انکار کیا تھا۔

"تم کیوں اپنی زندگی سے اتنا عاجز ہو' ابا جی مجھے تمہیں وہاں بھرے مجمعے کا لحاظ کیے بغیر قتل کر دیں گے۔" مگر زین نے ایک نہ مانی۔

"کیا کچھ نہیں ہو گا' تم ایک بار انہیں میرے گھر آنے تو دو' میری شان و شوکت دیکھ کے انسان نہ بنیں تو کہنا۔" دونوں طرف سے 'نہ' 'ہاں' کی طویل تکرار کے بعد ناچار زارا کو قائل ہونا پڑا اور ابا کو قائل کرنے کے لیے یقیناً "لمبی تقریر چاہیے" تھی مگر پہلا دھچکا پہلی مرحلے لگا۔

"ٹھیک ہے' بچے چلتے ہیں' جانے میں کوئی حرج نہیں' تمہاری سہیلی خوش ہو جائے گی' میری بیٹی کا بھی دل بہل جائے گا۔" بیٹی کو نادر سکتہ طاری رہا۔ چوہدری صاحب ایسے ہمدرد نرم گفتار کبھی نہیں تھے' اب زارا کو کون بتاتا یہ کایا پلٹ ایک رات پہلے کا نتیجہ تھی۔ جب چوہدری صاحب گوجرانوالہ سے واپس آ رہے تھے کہ دل کے حالات و اثرات بدلنے والی بھی اسی راستے پر مل گئی۔ مگر انتہائی فکرمند اور ہراساں کی۔

"مجھے آپ کی مدد نہیں چاہیے۔" مگر جب وہ ان

کی گاڑی چیک کرنے کے لیے لپکے' درخشاں چنگھاڑ کر رہ گئی تھیں۔

"کیوں آپ کا یہاں رات گزارنے کا پروگرام ہے؟" چوہدری صاحب کو بھی غصہ آگیا تھا' مگر غصہ دبا کر طنز اچھالا۔

"جو بھی ہو مجھے آپ سے مدد نہیں لینی۔" درخشاں کو نا معلوم ان سے کیا پرخاش ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے' آپ ایڈونچر کی شوقین ہیں تو یوں ہی سہی' لیکن اتنا بتا دوں اس سڑک سے گزرنے والا ہر بندہ چوہدری حشمت جیسا شریف نہیں ہوگا۔ یہاں سے انسان کم بھیڑیے زیادہ گزریں گے۔" چند اور خوف ناک جملے بولنے کے بعد وہ جب ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھے۔ درخشاں طوعاً" و کرہاً" ان کی گاڑی کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ چوہدری صاحب نے مبہم مسکراہٹ کے ساتھ فرنٹ ڈور کھولا تھا۔

"میں پیچھے بیٹھوں گی۔" درخشاں نے دانت پیسے تھے۔ چوہدری صاحب کو قطعی متامل نہ ہوئے اتنا بہت تھا وہ راضی تو ہوئیں' ان کے ہمراہ رہنے والے طیفا اور دلاور اس وقت بھی ساتھ تھے۔ دونوں درخشاں کی گاڑی کے ساتھ وہیں رہ گئے اور چوہدری صاحب اٹکھیلیاں کرتے دل کو جھڑکتے درخشاں کی ہمراہی پہ خوش ہوتے رہے۔ درخشاں اسپتال کے سامنے اتری تھیں' شکریہ یا اس جیسا ایک لفظ بھی کہے بغیر۔ اور اس ملاقات کو چاہے ایک رات ایک دن بیت چکا ہو' پر وہ کیفیت تو باقی تھی نا۔ انعام زارا کو بھی مل گیا۔

اور آج وہ صحیح معنوں میں جان ہتھیلی پہ رکھ کر ابا کو ساتھ لائی تھی۔ ابا نے اب وہی جان نکالنی بھی تھی۔ مہمانوں کو بڑھ بڑھ کے ویلکم کہتے زین کو دیکھ کر زارا کو غش آرہے تھے' جس نے اپنی رونمائی اتنی جلدی کردی' کچھ دیر اور سامنے نہ آتا تو کیا تھا' اس [illegible] دانت بھی بڑے نکل رہے تھے۔

"پچو ابھی یہ ہی دانت جھڑنے [illegible] کر اس لو۔" زارا غصے سے بڑبڑائی تھی۔ [illegible] حیران کن تھا۔ اب غش کے دورے چوہدری صاحب کو پڑتے تھے۔ بالکل اچانک سے وہ ظاہر ہوئیں۔ زین نے ان کی کلائی پکڑ کر زارا کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور اب ان کا ہاتھ پکڑے چوہدری صاحب اور زارا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"یہ... یہ... یہ۔" ایک بار پھر چوہدری کی زبان گنگ ہوئی۔ زین اور درخشاں قریب آرہے تھے۔ چوہدری کا بس نہیں چل رہا تھا زمین کو چیر کر اس میں گھس جائیں۔ مگر اس وقت درخشاں ان کے قریب آ بھی گئیں۔

"تم آگئیں۔" زین چہکا تھا' زارا مرا مرا سا مسکرائی۔

"حالانکہ مجھے بالکل یقین نہیں تھا تم آؤ گی۔" پھر وہ درخشاں کی جانب پلٹا۔

"پھوپھو یہ زارا ہے۔" درخشاں نے بڑے پیار سے زارا کے گرد بازو حمائل کیا۔

"ماشاء اللہ زارا تو بہت پیاری ہے۔" زارا خوش کیا ہوتی اس سے تو مسکرایا بھی نہ گیا اور جس کی وجہ سے یہ گھمبیر حالات ہوئی تھی' وہ خود اس کی اوٹ میں ہوتے تھک نہیں رہے تھے۔

"ارے ابا جی۔" معاً" زین کی نگاہ ان پہ پڑی تو مصنوعی حیرانی سے چلایا۔

"زہے نصیب... آپ بھی [illegible] یقین نہیں آرہا۔" ابا جی کو چھپنے کی [illegible] کے سامنے آنا پڑا۔ درخشاں کا چہرہ [illegible]

"پھوپھو یہ زارا کے ابا جی ہیں۔" پھوپھو کے دل کی حالت سے [illegible] سے بولا۔

"[illegible]" چوہدری حشمت شرمسار مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ کسی شرمیلی محبوبہ کی طرح [illegible] نہیں باقاعدہ نظریں چرانا پڑ رہی تھیں۔ درخشاں جو پنجابی فلموں کا ہیروئن متواتر گھورے جارہی تھیں۔

"آپ زارا کے ابا جی ہیں؟" بے انتہا اکھڑے لہجے میں درخشاں نے گویا تائید چاہی' چوہدری صاحب سے بدقت سرہلایا گیا۔

"زارا... یہ تمہارے ابا جی ہیں؟" درخشاں نے جیسے ایک آخری کوشش کرنا چاہی۔ کہیں امید تھی شاید زارا کہہ دے نہیں۔

"جی۔" مگر زارا کے لہجے ہی نہیں آنکھوں میں بھی فخر سٹ آیا۔ چوہدری صاحب مجھینپے سے کھڑے تھے۔ گویا ابا جی ہونے میں ان کا کوئی قصور نہ ہو۔

"اور یہ میری بہت پیاری سی پھوپھو جانی۔" اس بار تعارف کی رسم زین نے نبھائی۔

"جو میری ماں بھی [illegible] باپ بھی' اور بہت پکی سہیلی بھی۔" زین [illegible] لفظ لفظ میں عقیدت تھی۔ چوہدری صاحب [illegible] پیدہ و رنجیدہ نظروں سے پہلے زین اور [illegible] درخشاں کو دیکھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہتے تھے۔

"یہ میرے ساتھ کس نے کیا۔ قسمت نے یا زین نے یا میں نے خود نے... کیوں کیا؟" مگر لفظ سلب ہو چکے تھے۔

"ممی ڈیڈی کے گزرنے کے بعد ہم دونوں ہیں ایک دوسرے کا سب کچھ... ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم۔"

"اچھا بس۔" اچانک ہی درخشاں نے زین کا بازو کندھے سے ہٹا کر ناگواری دکھائی۔

"مجھے مسز انصار بلا رہی ہیں۔ تم انہیں کمپنی دو۔" انہوں نے زارا پہ ایک کے بعد دوسری نگاہ بھی ڈالنا ضروری نہیں سمجھی۔ اور وہاں سے چل دیں۔ چوہدری صاحب کی نظروں نے وہاں وہاں تک ان کا تعاقب کیا جہاں جہاں وہ گئیں۔

گھر واپسی کے دوران چوہدری صاحب پورا راستہ خاموش رہے۔ زارا ان کے چہرے پہ کیا کچھ نہیں تلاشتی رہی۔ غصہ' قہر' اشتعال' جلال... مگر وہاں ایسا کچھ نہیں تھا جو تھا وہ سمجھنے سے زارا قاصر تھی۔ زارا کا محتاط و کھوجتے انداز سے دیکھنا ان سے چھپا نہیں تھا۔ اب وہ کیا بتاتے کہ اسے "اونٹ پہاڑ تلے آگیا" یا "آپ اپنے ہی دام میں صیاد آگیا" کچھ ایسا ہی آج قسمت نے جال پھینکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کو زارا پسند نہیں آئی۔" پارٹی کے اختتام پہ ضروری کاموں سے فراغت کے بعد جب وہ کمرے میں جا رہی تھیں کہ زین نے آلیا۔ انہوں نے گہرا سانس لے کر دانستہ زین کو دیکھنے سے گریز کیا۔ جانتی تھیں جلد یا بدیر زین یہ پوچھ گچھ کرنے والا ہے۔ ان کا اکھڑا اکھڑا رویہ زین کو ہی نہیں۔ زارا اور ابا جی کو بھی محسوس ہوا ہوگا۔

"زارا تو ٹھیک ہے۔ لیکن۔" وہ صوفہ پر بیٹھ گئیں۔

"زارا کے ابا جی۔" انہوں نے دانت پہ دانت جما کر باقی الفاظ اندر پابند کیے' بیچ بیچ کوئی نازیبا لفظ نکلنے لگا تھا۔

"پھوپھو... مجھے شادی زارا سے کرنی ہے' زارا کے ابا جی سے نہیں۔" پھوپھو کے تیور نئے اور خطرناک لگ رہے تھے۔ زین نے خوامخواہ ہنس کر بات کو مزاح کا رنگ دینا چاہا۔

"شادی ایک فرد کی دوسرے فرد سے نہیں' ایک خاندان کی دوسرے خاندان سے کا نام ہے۔" درخشاں ماتش کا آتا بنی ہوئی تھیں' اینٹھی ہوئی۔

"اور میں نہیں چاہتی میرے خاندان کا لنک چوہدری حشمت سے ہو۔"

"پھوپھو میں زارا سے..." زین فریادی بنا کھڑا ہو گیا۔

"آئی نو... بہت بار کہہ چکے ہو۔" درخشاں نے بیزاری سے بات کاٹی۔

"یہ پیار' محبت عارضی' جذبہ ہوتا ہے' آج یہ زارا تمہیں زندگی کا حصہ لگ رہی ہے۔ کل یہ ہی زارا بوجھ بن کر تمہاری آنکھوں میں چبھے گی۔"

"آپ مجھے کسی فلم کی اسٹوری سنا رہی ہیں؟"

"حقیقت بتا رہی ہوں۔" درخشاں نے تیز لہجے میں کہا' زین کے چہرے پہ بے بسی پھیلنے لگی۔

"اور دنیا میں ایک زارا نہیں رہ گئی' اس سے خوب صورت لڑکیاں مل جائیں گی' بلکہ میں نے تمہیں بتایا نہیں' ڈاکٹر اسماء اپنی بھانجی کے لیے تم میں انٹرسٹڈ ہیں۔"

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟" زین بے یقینی و بے بسی سے کراہا' درخشاں چپ رہیں۔

"آپ اس کے ابا جی کی وجہ سے زارا کو ریجیکٹ کر رہی ہیں؟"

"جو بھی سمجھو' ویسے مجھے اس بندے سے خاص چڑ ہے۔"

"مجھے بھی ہے۔" اس وقت وہ خود چڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "لیکن میں اس چڑ پر زارا کو تو قربان کرنے سے رہا۔" وہ ٹوک انداز میں کہتا وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ درخشاں اندر ہی اندر کھولتی رہیں' یہ صورت حال ان کے تصور سے بھی بڑھ کر پیچیدہ ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زارا نے کمرے میں جھانکا' چودھری صاحب بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم تھے۔

"ابا جی۔" وہ ہاتھ میں ٹیبلٹس کا پیکٹ لیے اندر آئی۔

"ٹیبلٹس مل گئیں' تھینک گاڈ۔ شرافت لے آیا۔" وہ مصروف سے انداز میں بولتی گئی۔ چودھری صاحب کے سکتے میں سر مو فرق نہ آیا۔ معاً زارا کی نظر سائیڈ ٹیبل پر گئی۔ دودھ کا بھرا گلاس جوں کا توں موجود تھا۔

"ہا... آپ نے دودھ بھی نہیں پیا۔" اس کی تیوری چڑھ گئی۔

"چلیں اب ٹیبلٹس دودھ کے ساتھ لیں۔" دودھ کا گلاس اٹھا کر وہ ان کی جانب بڑھی۔

"شاباش... میرے سامنے ختم کریں۔" وہ ان سے قریب آ کر حکمیہ بولی۔ مگر چودھری صاحب وہاں ہوتے تو تعمیل بجالاتے۔ وہ تو ابھی بھی اسی پارک میں تھے' جہاں یہاں وہاں چلتی پھرتی ہنستی درخشاں تھیں اور ان کی سحرزدہ نظریں۔

"ابا جی۔" زارا کا چہرہ فق ہوا۔ ابا جی ہوش میں نہیں لگ رہے تھے' اس نے تیزی سے ان کا کندھا جھنجوڑا۔ چودھری نے آہستہ روی سے گردن گھما کر اسے دیکھا خاصی اجنبی نگاہوں سے۔

"تم زین کو بلالو۔" مگر اگلے ہی پل اسے خود کو سکتہ ہو گیا۔ یہ ابا جی نے کیا کہا تھا۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی' چودھری صاحب نے نظریں پھیر لیں۔ فی الحال سامنا کرنا مشکل تر ہو رہا تھا۔

"تم اسے... اسی ہفتے کھانے پہ بلالو۔" یہ اچانک ہونے والا حملہ تھا۔ زارا سے تو رد عمل ظاہر کرنا مشکل ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا خوش ہو یا بے ہوش ہو۔

"او... او... اس کی وہ..." اب کے چودھری بے طرح جھجکے۔

"وہ کیا لگتی ہیں؟"

"پھوپھو۔" زارا کے ہونٹ میکانکی طور پر ہلے۔

"ہاں... انہیں بھی۔" بات ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے جھٹ سے ٹیبلٹ اور دودھ کا گلاس لیا۔ اور آدھا منہ گلاس میں چھپا لیا۔ لال لال شکل کچھ تو چھپ گئی تھی۔ زارا سے بھی اور زارا کی مرحومہ ماں سے بھی۔

☼ ☼ ☼

زین پیٹ پکڑ پکڑ کر دہرا ہوا جا رہا تھا۔ زارا نے "بریکنگ نیوز" انتہائی خوشی سے سنائی تھی۔ اور پھر نہایت اشتیاق سے اس کا رد عمل دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر خود بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دیا' لگ بھگ پانچ منٹوں تک بھی اس کے قہقہے نہ رکے تو اس کی ساری خوشی ناگواری میں بدل گئی۔

"اتنا بڑا سا منہ کھول کر تم یہ جتاتی قہقہے لگا کر کیا سمجھ رہے ہو میں تمہاری تعریف کروں' بہت پیارے لگ رہے ہو تو... نہیں... تم ایک نمبر کے غنڈے لگ رہے ہو اور تمہیں دیکھ کر میرا بس نہیں چل رہا میں تم سے شادی کا فیصلہ بدل دوں۔"

"تم کیا بدلو گی۔" بالکل اچانک ہی قہقہے رک گئے اور زین نے خالصتاً "زنانہ اسٹائل" میں کہا۔

"وہ تو میں بدلوں گا۔" یہ جملہ اس نے باقاعدہ سسک کر کہا۔ زارا کا منہ کھل گیا۔ مرد کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی' کہاں تو وہ اس کی خاطر ابا کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا' اور کہاں اب ہاتھ جھاڑ رہا تھا۔

"تم ہوش میں ہو؟" زارا کا دماغ بھول کر رہ گیا تھا۔ "میں تم سے کہہ رہی ہوں ابا راضی ہو گئے ہیں' وہ تمہیں اور تمہاری پھوپھو کو ڈنر پہ انوائیٹ کر رہے ہیں اور تم..."

"ان سے کہو' بہت دیر کر دی مہرباں ہوتے ہوتے۔" زین نے دل گرفتگی بھری۔

"کیا بکواس ہے..." اور بند کرو یہ مینا کماری والی ہچکیاں۔"

"کیا مصیبت ہے۔" رونا بھول کر وہ جھنجلایا۔

"نہ ہنستا دیکھ سکتی ہو' نہ روتا برداشت ہوتا ہوں' تم شادی کیسے کرو گی مجھ سے؟؟؟" زارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ بند کیے بیٹھی رہی۔ اسے لگ رہا تھا زین کریک ہو گیا ہے۔

"اچھا بتاؤ' یہ انقلاب کیسے؟" زین کو سنجیدگی اختیار کرنی پڑی کہ زارا پریشان ہوئی بیٹھی تھی۔

"مجھے لگتا ہے میرے ابا نا..." انگلیاں موڑ موڑ کر زارا نے کہنا شروع کیا۔ جیسے ابا کا نہیں اپنا حال دل بتا رہی ہو' زین کبھی اس کی انگلیوں کو دیکھتا تو کبھی لال انار ہوتی شکل کو۔

"میرے ابا تمہاری پھوپھو کو لائیک کرتے ہیں۔" اور زین پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اتنا شدید کہ آخر میں اسے اپنی آنکھیں پونچھنی پڑیں۔

"یہ ہی... یہ ہی گل کھلا کر تمہارے ابا نے میرا بیڑہ غرق کیا... قسم سے۔" زین نے قسم سے کے بعد بڑی بے چاری سی شکل بنائی۔

"وہ تمہارے ابا نہ ہوتے تو میرے ہاتھوں قتل ہو جاتے۔"

"زین..." زارا نے اس سے بھی زیادہ رونی شکل بنائی۔

"ہاں... میری پھوپھو کو امپریس کرنے کے لیے میرے ہتھیار استعمال کیے ہیں' پھوپھو میرا رشتہ بھی لے کر آنے سے مکر گئیں۔"

"کیا؟؟" زارا کی صدا کی چیخ بلند ہوئی اور اگلے پل وہ لڑھک کر بینچ سے نیچے تھی۔

☼ ☼ ☼

حالات و واقعات اس نہج پر آ گئے تھے کہ ایک دوسرے سے تو کیا اپنے آپ سے بھی نظریں چرائی پڑ رہی تھیں۔ درخشاں کا قطعی فیصلہ برقرار تھا۔ زارا کی راتیں تکیے بھگوتے گزرنے لگی تھیں۔ چودھری صاحب کا وہ طنطنہ... وہ دبدبہ کسی پچھلے زمانے کی یادگار ہوتا جا رہا تھا۔ آج کل وہ کسی چپ کے زیر اثر رہنے لگے تھے۔ سب کے بیچ بیٹھتے تو بھی چپ... جو اپنے کمرے میں ہوتے تو بھی مہر بہ لب... کتنے دن ہو گئے تھے انہوں نے مرحومہ بیوی کی تصویر دیکھنا بھی ترک کر رکھا تھا' جو کبھی غیر ارادتاً نظر پڑ جاتی تو جیسے ان دیکھا جرم جکڑ لیتا۔ احساس ندامت کے مارے پیشانی پہ قطرے چمک اٹھتے۔

ساری ساری رات بیوی کی تصویر سے منہ پھیرے دوسری کروٹ پہ لیٹے رہتے۔ اگر وہ اپنی اس ندامت و احساس جرم سے نکل کر بالکل پہلے کی طرح مرحومہ بیوی کی تصویر دیکھتے تو واضح محسوس کرتے مرحومہ بیوی کی جھلملاتی آنکھوں میں اب جا کے سکون اطمینان ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ ان کے اس کارنامے پر ناخوش نہیں ہیں۔ بلکہ الجھن کا شکار ہیں کہ چودھری صاحب ایسے بھی ہو سکتے ہیں؟ چھپے رستم... مگر چودھری صاحب تصویر دیکھتے تو ہی ان کے تاثرات کو پہچان پاتے۔ کسی اور کی سمجھ میں کہاں یہ زبان و بیان آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"واٹ..." درخشاں کی دھاڑ اتنی اچانک اور تیز تھی کہ زین حقیقت میں دہل گیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" لیکن ابھی بھی انہوں نے خود پہ قابو کر رکھا تھا۔ ورنہ جس قسم کے وہ جلال میں آ گئی تھیں غالب گمان تھا زین کو تین چار کرارے تھپڑ پڑ جاتے تھے۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ سوائے تھوڑی اور شہ مل گئی۔

"آپ۔۔ یا۔۔۔ وہ۔۔ پھوپھو۔" کتنا مشکل ہو رہا تھا۔ اپنی کہی بات میں وزن اور دلیل پیدا کرنا۔ چوہدری صاحب نے ضرور اس سے پرانی دشمنی نبھائی تھی یہ اسے یقین تھا۔

"حرج کیا ہے آخر۔ جہاں پکی بیر ہو وہاں پتھر تو آتے ہیں۔"

"زین۔" اس دھاڑ سے درخشاں کے گلے میں لازمی خراش پڑی تھی۔ زین سہما تو مگر اب جب اوکھلی میں منہ دے دیا تھا پھر موسلوں سے کیا ڈر۔

"آپ۔۔ آپ پلیز ٹھنڈے دماغ سے سوچیں، چوہدری حشمت لائف پارٹنر کے طور پر بہترین انسان ہیں۔ یقین مانیے وہ جیسے دکھتے ہیں ویسے ہیں نہیں جیسے ہیں ویسے دکھتے نہیں۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، ہو جاتا ہے، کچھ لوگوں کے ساتھ ایسا۔ ان کی خوبیاں ان کی ذات سے کسی زنبیل کی طرح نکالنی بلکہ ڈھونڈنی پڑتی ہیں، مگر بہر حال وہ مل ضرور جاتی ہیں۔ تو مجھے بھی اب جا کے پتا چلا ہے کہ چوہدری صاحب ون اینڈ اونلی ہیں۔" کسی رٹے ہوئے سبق کی طرح اس نے یہ سب کہہ تو دیا لیکن نہ جانے کیوں لگ رہا تھا۔ بات بنی کم بگڑی زیادہ۔ درخشاں اس دوران تمسخرانہ گھورتی رہیں۔

"خالہ" یہ زارا کے وہ ہی ابا جی ہیں جنہیں تم فرعون، ابلیس اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے رہے ہو؟" زین سے جواب نہیں بنا تو بغلیں جھانکنے لگا۔

"پھوپھو آپ کو ان جیسا دوسرا نہیں مل سکتا۔"

"مجھے وہ ایک بھی نہیں چاہیے تم دوسرے کی بات کرتے ہو۔ اور تم اس انسان کی کیسے تعریفیں کر رہے ہو جو کل تک تمہارے نزدیک کسی بھی قابل نہیں تھا۔"

"خیالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔" زین پچھتاتے ہوئے مزید بولا۔

"اور بطور سسران کے لیے میرے خیالات وہی ہیں لیکن بطور پھوپھا۔۔ وہ۔۔"

"زین۔ شٹ اپ۔" اس بار درخشاں کا ہاتھ واقعی اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہیں گھر میں قید کر کے باہر جایا کروں۔" یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ وہ ایسا کر بھی سکتی تھیں۔

"اور میں نے اتنے سال اس لیے شادی نہیں۔ کی کہ چوہدری حشمت یا اس جیسا کوئی آ کر مجھے پروپوز کرے۔۔ اور میں خوشی خوشی مان بھی جاؤں جیسے ترس ہی تو رہی تھی۔" اس کے بعد وہ تو سونے کے لیے چل دیں۔ وہ خود ترسی کا شکار ہوا وہیں بیٹھا سوگ مناتا رہا۔ محبت ہونی ہی تھی تو کیا ضروری تھا چوہدری حشمت کی بیٹی سے ہوتی۔۔!!!

☼ ☼ ☼

زین کے منہ سے درخشاں کا صاف انکار سن کر وہ صدمے کا شکار تو بہت ہوئے مگر ہمت نہیں ہاری اچانک ہی درخشاں کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تیار ہونے کے بعد جونہی کمرے سے نکلنے لگے مرحومہ بیوی کی نظروں سے چار ہو گئیں وہاں الگ ہی تاثرات جھانکتے ملے۔ شوخ شریر۔ اور حوصلہ افزا۔ چوہدری ایک دم سے کھل گئے۔

"اب تم یہ مت سمجھنا کہ یہ میری کسی خواہش یا خوشی کا دخل ہے۔ میں سب زارا کے لیے کر رہا ہوں۔ تم جانتی ہو اس کی ضد ہے پہلے میں شادی کروں پھر وہ۔۔ کروں۔" اب بیگم کی تصویر چیخ چیخ کر۔۔

"تم بھی یقین نہ کرنا جانتی نہیں۔" چوہدری سمجھ کر کچھ بد مزا ہوئے۔

"مانا نہ کبھی۔۔ ہمیشہ میری نیت پر شک کرنا۔" منہ بنا کر کہنے کے بعد منزل مقصود کی جانب رواں ہو گئے۔

"زندگی ہسپتال" آج بڑا اپنا اپنا لگ رہا تھا۔ طیفے اور دلاور کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر وہ اکیلے ہی آ گئے تھے۔ انٹرنس سے گزر کر جا ادھر ادھر دیکھے سیدھے ڈاکٹر درخشاں کے روم کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ یہ غیر اخلاقی حرکت بھی اس لیے سرزد ہوئی کہ درخشاں ان کا تعارف سن کر کہاں انہیں اندر بلانے والی تھیں جیسے تیسے ہی سہی اب ان سے کچھ کہہ سن تو آئے۔

"آپ؟" حسب توقع انہیں اپنے سامنے پا کر درخشاں کے نقوش تن گئے۔ وہ اپنے پرانے حلیے میں تھے اور خاصے گوارہ تک لگ رہے تھے۔

"آپ کو معلوم ہے میں اپائنٹمنٹ کے بغیر نہیں دیکھتی۔" انتہائی ضبط کے ساتھ دانت پیس پیس کر وہ بولیں۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا گارڈ بلوا کر باہر پھنکوا دیں اس شخص کو جس کی وجہ سے ان کے اور زین کے بیچ تلخیاں بڑھ گئی تھیں۔

"مجھے آپ کی زندگی میں بغیر اپائنٹمنٹ کے آنا چاہتا ہوں۔" ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کے کسی نوجوان لڑکے کی طرح انہوں نے حال دل کہنے کی ٹھانی۔ یہ ذو معنی جملہ درخشاں کے طبق روشن کر گیا۔

"مجھے آپ کسی بھی صورت قبول نہیں۔" درخشاں نے اس بار اتنی زور سے دانت رگڑے جیسے لفظ نہ چبا رہی ہوں چوہدری حشمت کو چبا رہی ہوں۔

"اس درجہ ناپسندیدگی کی کوئی ایک معقول وجہ ہی بتا دیں۔" گھر سے بڑا حوصلہ مند ہو کر نکلے تھے مگر یہاں درخشاں کی آنکھوں سے پھوٹتی چنگاریاں سب ختم کرنے پر تلی تھیں۔ حوصلہ ہی نہیں۔۔ امید اور آس بھی۔

"میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں۔" درخشاں نے خاصے تنفر سے کہا اور سامنے رکھی فائل میں گم ہو گئیں۔ یہ بھی نہ دیکھا۔ چوہدری صاحب کا چہرہ کتنا دھواں دھواں ہو رہا ہے۔

"آپ جا سکتے ہیں۔" ستم بالائے ستم۔ بد لحاظی سے یہ کہنا تابوت میں آخری کیل کی طرح گڑھا۔ چوہدری کندھے ڈھلکائے پلٹ آئے۔

☼ ☼ ☼

عین اسی ٹائم ایک اور ملاقات بھی جاری تھی۔ زارا اور زین کافی عرصے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔

"زارا! پھوپھو اگر مان جاتی ہیں تو ہم پہلے ابا اور پھوپھو کی شادی کریں گے۔" گرچہ دل بھاری ہو رہے تھے ایسے آثار دور دور تک نہیں نظر آ رہے تھے مگر کہنے میں کیا جاتا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" زین بھڑک کر سیدھا ہوا۔

"پہلے ہماری ہو گی۔"

"نہیں۔ پہلے ابا اور پھپھو کی۔"

"پہلے ہماری۔"

"کیوں تمہیں میرا اعتبار نہیں ہے کیا۔؟" تھک کر زارا جھنجلائی۔

"تمہارے ابا کا نہیں ہے۔" زین نے ترت کہا۔ زارا کا موڈ بگڑنے لگا۔

"عادت بدلتی ہے فطرت نہیں کیا خبر اپنی شادی کے بعد اپنا مطلب پورا ہوتے ہی مکر جائیں۔" زارا کو ناراض کرنے کے لیے اتنا کہنا کافی تھا۔ کچھ دیر تک وہ منہ پھلائے رہی۔ پھر یاد آنے پر جوش سے بولی۔

"پتا کیا ہے ابا تمہاری پھپھو کے ہسپتال گئے ہیں ان سے ملنے۔"

"اوہ نو۔" زین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"انہی حرکتوں کی وجہ سے تمہارے ابا کے نمبر کٹتے ہیں۔ لو بتاؤ ایسی بھی کیا بے صبری۔۔ آج پھر پھپھو کا لیکچر سننا پڑے گا۔" زارا بھی پریشان ہو بیٹھی۔ یہ تو سوچا نہ تھا۔

اور پھپھو نے صرف لیکچر پر اکتفا نہیں کیا۔ دھمکیاں بھی بے حساب دیں۔ اور اپنی چہیتی پروین (ملازمہ) اور ڈرائیور کے سامنے دیں۔ یوں یہ ڈانٹ اور زیادہ بری لگی۔ وہ بہت بھرے دل کے ساتھ کمرہ بند ہو گیا اور رات کے کھانے کے لیے بھی باہر نہیں آیا۔

"ایسا کر کے تم کس کو دکھانا چاہ رہے ہو۔" پروین کے مارچ پاسٹ کے باوجود بھی وہ نہ اٹھا تو درخشاں دروازے پہ آ کھڑی ہوئیں۔

"وہ جس کو آپ نے سنوایا۔" وہ ناراض لہجے میں بولا۔ اشارہ یقیناً دین اور ڈرائیور کی طرف تھا جن کے سامنے ڈانٹ پڑی تھی۔

"بد تمیزی مت کرو اور باہر آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور میں بھی تمہاری وجہ سے بھوکی ہوں۔"

"آپ کھالیں۔"

"تمہارے بغیر۔؟" وہ غصہ دبا کر بولیں۔

"عادت ڈال لیں۔ کیونکہ میں اب تب تک کچھ نہیں کھاؤں گا جب تک آپ میری بات نہیں مانیں گی۔"

"sorry to say میں ان اموشنل ہتھیاروں سے ڈیپ ہونے والی نہیں۔ اور سنو آج کی رات میں کچن کے دروازے پہ کرسی رکھ کے پہرہ دوں گی۔ دیکھتی ہوں تم کب تک بھوکے رہتے ہو اپنی زارا اور اس چوہدری کے لیے۔" نہ کوئی قسمیں نہ ترلے سیدھا سیدھا "جاؤ مرو" میں لپٹے الفاظ مار کر وہ چلی بھی گئیں۔ دھمکیوں پہ دھمکیاں وہ بھی بھوکے پیٹ سہنا زین کی حالت قابل رحم تھی۔

☼ ☼ ☼

چوہدری صاحب کے کمرے میں صرف دو نفوس تھے۔ ایک تو خود چوہدری صاحب ــــ دوسرا زین۔ معاملہ اب نئے رخ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے درخشاں کو منانے کے لیے زین نے سارا کچھ چوہدری پہ ڈال رکھا تھا۔ جیسے بھی سہی درخشاں کو رام کرنا صرف چوہدری کی ذمہ داری تھا۔ زین کی ساری کوششیں صرف اپنی اور زارا کے رشتے کے لیے تھیں۔ کہیں نہ کہیں اس میں انتقامی عنصر بھی آجاتا تھا۔ چوہدری کا ماضی قریب میں اس کے ساتھ روا رکھا سلوک۔ ان کے ہاتھوں ہوئی بے عزتی تو اب ان کا منمناتا تذرے، بچھ بچھ جانا ــــ بڑا تسکین کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن درخشاں کے ظالم اور کٹھور روپ نے اسے چوہدری کے شانہ بہ شانہ لاکھڑا کیا۔ آج کا اجلاس اسی فیصلے کا نتیجہ تھا۔

"اوئے تو جانتا نہیں میں کون ہوں؟" مونچھوں کو تاؤ دیتے۔ مصطفیٰ قریشی اسٹائل میں بولتے چوہدری آج اپنی پرانی جون میں خاصے بھلے لگ رہے تھے۔

"میں تو نہیں جانتا مگر ــــ" یہاں تک زین منمنایا۔ پھر یکدم لہجہ بدل کر چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

"لگتا ہے میری پھپھو جان گئی ہیں۔" چوہدری پر ڈائریکٹ حملہ تھا وہ بری طرح کھنکارنے لگے۔

"زبان تو تیری بہت چلتی ہے۔" چوہدری نے مصنوعی ستائش طنز میں لپیٹ کر سنائی۔

"کچھ اپنا ذہن بھی چلا۔" بڑی امید سے انہوں نے کہا تھا۔

"کچھ کر۔ کچھ سوچ کہ یہ سزا ختم ہو۔"

"ہاہاہا۔" زین نے ایک فلمی قہقہہ لگایا۔

"ہاں میرے کورٹ میں آگئی۔" چوہدری صاحب تلملا گئے۔

"اوئے طیفے ـــ دلاور۔" یکایک انہوں نے حلق پھاڑا۔ زین نے فی الفور فلمی چولا اتار کر توبہ کی۔

"بس کریں ابا جی آپ بھی ذرا ذرا سی بات پہ جوش میں آجاتے ہیں۔ سونے دیں ان معصوموں کو [illegible] کرتا ہوں کچھ۔" وہ باقاعدہ سر دھننے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی ٹیبل پر درخشاں [illegible] کے بعد خوشگوار موڈ میں نظر [illegible] ایک بار پھر رشتے کی بات چھیڑ دی۔ [illegible] میں تو نہیں آئیں۔ لیکن انہیں [illegible]

"ایک [illegible] بار دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں ہر بار انکار ہی کروں گی۔" گہرا سانس بھر کے وہ سنجیدگی سے بولی تھیں۔ زین کے چہرے پہ بغاوت اور خود سری چھانے لگی۔

"کیوں پھپھو کیوں۔ کوئی لوجک کوئی وجہ کچھ تو کہیں۔"

"مجھے کوئی وجہ نہیں بتانی سمجھے تم" انہیں غصہ آگیا۔ زین کا یوں بدتمیزی سے بات کرنا بے حد کھلا۔ زین بے ساختہ مسکرایا۔ درخشاں ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھنے ہی لگیں کہ زین کی اگلی بات نے قدم جکڑ لیے۔

"ان فیکٹ۔ اس انکار والے ڈرامے کے پیچھے آپ کی ساکھ آجاتی ہے۔"

"مطلب؟" ان کے لہجے میں الجھن تھی۔

"آپ کی وہ ساکھ جو آپ نے مجھے پال پوس کر دنیا والوں کے سامنے بنائی۔" زین نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے بڑی بے رحمی سے ان کے حواس سلب کیے تھے۔ یوں کہ وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہیں۔

"سچ تو یہ ہے آپ [illegible] اس واہ واہ کی اتنی عادی ہوگئی ہیں [illegible] مجھ یتیم کو پال پوس کر دنیا والوں سے [illegible] اب آپ اس واہ واہ کے بغیر جینے کا تصور [illegible] کرسکتیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتی جارہی تھیں۔ دھواں دھواں ہوتے چہرے سے التجا [illegible] کہ زین بس اتنا ہی۔ اس سے آگے نہیں۔ اس سے زیادہ نہیں مگر زبان ساتھ دینے سے انکاری تھی۔ اور زین تھا کہ ہر تعلق بالواسطہ بھلائے سنگ باری کرتا رہا۔

"مجھے کہنے دیں۔ مجھے کہنے دیں۔ کہ آپ کو ایک یتیم کو پالنے کا گولڈ میڈل لے کر اونچے منصب پر رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔" سنگدلی اور بے رحمی کی کوئی انتہا تھی تو وہ آج پار ہوگئی تھی۔ درخشاں بیٹھ نہ جاتیں تو یقیناً گر جاتیں۔

"میں جو یہ سمجھتا تھا کہ میرا اسہارا بن کر ــــ میرے لیے اپنی زندگی کے بہترین قیمتی سال قربان کرکے آپ نے مجھ پہ احسان کیا تو غلط سوچتا تھا میں۔ اصل میں تو اس میں بھی آپ کا مطلب چھپا ہوا تھا۔ آپ کو دنیا والوں سے کریڈٹ لینا تھا جو آپ کو مل گیا۔"

"زین ــــ" پہلی بار ان کی زبان سے پھسلا مگر زین نے سنا ہی نہیں۔

"اور اب شادی کرکے آپ نے اس کریڈٹ سے ہاتھ تو نہیں دھونے آخر محنت لگی ہے اسے پانے

ہیں۔"
"پلیز چپ ہو جاؤ۔" وہ بری طرح سے رو رہی تھیں۔
"لیکن آپ جانتی ہیں میں بھی آپ کا بھتیجا ہوں۔ آپ یہ احسان نہ کرتیں تو بھی جی ہی لیتا کہ پالنے والی ذات صرف اوپر ہے۔" وہ کیوں اتنا سفاک اتنا خود غرض ہو گیا تھا۔ اسے کیوں اپنی ماں جیسی پھپھو کی وہ تکلیف نہیں نظر آرہی تھی جو اس کے الفاظ ان کو پہنچا رہے تھے۔

"اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ زارا تو کیا کسی بھی لڑکی سے شادی کرکے میں بھی پرسکون نہیں رہ سکوں گا۔ دنیا والوں سے کریڈٹ لے کر اپنے اونچے ہوئے سر کو چوہدری حشمت تو کیا کسی سے بھی شادی کرکے جھکانا آپ کو گوارہ نہیں تو میں کیسے شادی کرکے لوگوں کو تھو تھو کرنے کا موقع دوں کہ دیکھو۔ پھپھو نے اس کی خاطر اپنی جوانی تیاگ دی۔ اور یہ احسان فراموش۔" اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ درخشاں بے آواز روتی رہیں زین کا ایک ایک لفظ دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

"میں بھی کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ مجھے شادی کرکے آپ کے اونچے ہوئے سر کو دیکھ کر سر جھکا کر نہیں رہنا۔"
وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ بے وجہ طنزیہ ہنسی کے بعد آگے بولا۔
"اچھا ہے نا۔ ہم دونوں پھپھو بھتیجا ایک دوسرے کے لیے کنوارے رہ کر زندگی گزار دیں۔ اور دنیا والوں سے اچھائی کا سرٹیفکیٹ لیتے رہیں۔" پوری طرح سے درخشاں کے گرد آگ لگا کر وہ یوں چلا گیا جیسے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ پیچھے درخشاں کا کیا حال ہوا۔ اس کی اسے پروا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

تو یہ تھا میری بے لوث محبت کا انجام۔ زہر میں ڈوبے نشتر۔ جنہوں نے چھلنی [illegible] میں پھر بھی پہنچ گئی۔ ہارٹ اٹیک ہوا نہ کوئی نروس بریک ڈاؤن۔ بعض اوقات بہت زیادہ دلیر ہونا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ انسان بے حس اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے کوئی بھی آفت آئے۔ اپنے اپنے ہونے کا فائدہ اٹھا کر کچھوں میں ٹس سے مس کرو پیں اثر نہیں ہوتا۔ مگر اثر ہوا تو تھا۔ اندر بہت زور سے ٹیسیں اٹھی تھیں۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھیں میری بے لوث محبت پل بھر میں بے وقعت ہو کر رہ گئی۔ ایسی ریاضت جس میں کسی صلے کی خواہش تھی نہ بدلے کی چاہ۔ رائیگاں گئی۔

پیچھے مڑ کر دیکھوں تو لگتا ہے کل کی بات ہے جب گھر میں صف ماتم بچھی تھی بھیا اور بھابھی حج پر گئے اور واپس نہ لوٹے۔ وہاں خیموں میں لگنے والی آگ کی خوراک بن گئے۔

زین چھوٹا تھا تو میں بھی کون سی بہت بڑی تھی۔ مگر ایک دم سے بڑی ہو گئی۔ صرف زین کے لیے نہیں اپنے لیے بھی۔ تب میرے ابا حیات تھے۔ مگر ایک عرصے سے وہیل چیئر کے محتاج تھے۔ ان کی دونوں ٹانگیں ایک حادثے کی نذر ہو گئی تھیں۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں۔ مزید مایوس اور کم حوصلہ کر دیا تھا۔ ایسے میں 'میں' ہی تھی جسے گھر کا ہی نہیں زین اور ابا کا بھی سہارا بننا تھا۔ ہاں تب مجھے بہت ساری لڑکیوں کی طرح یہ مسئلہ نہیں تھا کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ یا شادی میرے لیے [illegible] کیونکہ میری منگنی تین سال سے [illegible] دو پیار کے رشتے داروں میں اور [illegible] منگیتر پر مکمل بھروسہ تھا۔ مگر منگیتر کے امتحان [illegible] فیل ہونے سے پہلے زندگی میرے [illegible] اور [illegible] کا راستہ کھول چکی تھی۔ [illegible] کی چپ چاپ ہمیں چھوڑ کے چلے گئے۔ ابھی بھیا اور بھابھی کو گئے پورے تین ماہ بھی نہیں ہوئے تھے میرے لیے دنیا اب اندھیر ہو گئی۔ ابا بھلے ہی ناکارہ انسان تھے۔ مگر ہماری چھت تھے۔ ان کا ہونا کتنا ضروری تھا یہ ان کے نہ ہونے کے بعد پتا چلا۔ یہاں بھی مجھے خود کو خود ہی سمجھانا پڑا۔ روپیٹ کر تھک ہار کر زندگی نہیں تھمتی۔ مجھے زین کو کچھ بنانا تھا۔ اس کے لیے مجھے خود کسی لائق ہونا تھا۔ تب میں نے بہت سی زبانوں بہت سی نظروں کا تن تنہا مقابلہ کر کے عمل میدان میں قدم رکھا۔ میرے لیے مالی مسائل نہیں تھے کہ اس لحاظ سے ابا اور بھیا دونوں جائیداد کے نام پر بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔ خوشی میں نے ایف ایس سی امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ میری سسرال کے چکر ہماری طرف لگنا شروع ہو گئے۔

"اب جبکہ تمہاری شادی ہو جائے گی تو زین کا کیا کرو گی۔" میرے منگیتر توصیف کے وہ جملے آج بھی میرے ذہن پر نقش تھے۔
"کیا مطلب؟" میں حقیقتاً نہیں سمجھی تھی۔
"ہم سب تو یہ چاہ رہے ہیں [illegible] اسے ہوسٹل بھیج دو۔"
"کیوں۔" مجھے اپنی آواز بمشکل سنائی دی تھی۔
"ظاہر ہے ہماری زندگی تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ اسے تھوڑا اپنے اندر اعتماد پیدا کرنے [illegible]"

"[illegible] کے لیے میں اسے خود سے دور کروں؟"
"میرا مشورہ تو یہی ہے۔"
"اس کے ماں باپ زندہ ہوتے تو کیا وہ ایسا کرتے۔"
"پتا نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں تم اس کی ماں ہو نہ باپ۔" فیصلہ ہو گیا تھا۔ توصیف ایک تنگ نظر مرد کی طرح زین کے وجود سے تنگ ہو رہا تھا۔ مجھے الٹی سیدھی توجیہات دے رہا تھا۔ میں نے بڑے آرام سے انگوٹھی اتار کر اسے تھما دی تھی۔

اس کے بعد پیچھے مڑ کے دیکھنا گناہ تصور کرتے ہوئے اپنی توجہ صرف اور صرف زین پر مرکوز کر دی تھی۔ ایک لمبا عرصہ بیتا۔ میں ڈاکٹر بن گئی۔ زین ایم بی اے تک آ گیا۔ میرے لیے اتنی مصروفیت ہو گئی کہ شادی "لفظ" بھی ذہن سے نکل گیا۔ کچھ عرصہ پہلے زین نے مجھے اس لفظ کی بازگشت سنائی تو زارا کا نام لے کر۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ اتنا بڑا ہو گیا۔ اور واقعی اتنا بڑا ہو گیا کہ اپنی ہی نہیں میری بھی شادی کا سوچنے لگا۔ میری نیت میری محبت سب کو ملاوٹ زدہ قرار دے کر مجھے نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ اور میں سب سہہ گئی۔ کیوں [illegible] اس لیے تو نہیں کہ جو کچھ اس نے کہا ہوا [illegible] میں واقعی کسی واہ واہ کسی ستائش کی [illegible] تھی؟ کیا واقعی مجھے دنیا کی نظروں میں [ایک] مقام بنانا تھا۔۔۔؟ کیا واقعی زین صحیح ہے اور میں غلط؟"

☼ ☼ ☼

دل تو یہ کر رہا تھا نیم تاریک ماحول میں کینڈل لائٹ ڈنر ہو۔ چہار اطراف فسوں پھونکتا ہوا ہو۔ بس پردہ موسیقی میں
دو دل مل رہے ہیں۔۔۔ مگر چپکے چپکے
لگا ہوا ہو۔ مگر دل کی کرنے میں ابھی شاید وقت تھا۔

آج "محبوب" کی ماننی پڑی۔ سو وہ دل کی خواہش کا گلا گھونٹ کر اسپتال چلے آئے جہاں آنے کا حکم تھا۔ ماتھا شکن آلود۔ ہونٹ بھینچے ہوئے اور خوبصورت نقوش پر چھائی کرختگی۔ سب کچھ وہی تھا تو دل کیوں کر خوش فہم ہوتا آج کے بلاوے پر۔

☼ ☼ ☼

اور یہاں پوری طرح سے کینڈل لائٹ ڈنر کا اہتمام تھا۔ کسی مشہور انگلش دھن سے کان ہٹا کر زارا نے زین کو دیکھا۔
"تمہیں پتا ہے۔۔۔ ابھی ابا زندگی ہسپتال گئے ہیں۔ تمہاری پھپھو نے بلایا ہے۔"
"او ہو۔۔۔ تم نے ان پر کچھ پڑھ کر پھونکا تھا۔" حسب معمول زین نے غیر سنجیدگی دکھائی۔

☼ ☼ ☼

"آپ۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔" چوہدری حشمت پہ شادی مرگ طاری ہو گیا۔ وہی تیکھے چتون سجائے درخشاں انہیں شادی کے لیے مثبت جواب دیں گی؟ دل بلیوں اچھلنے لگا۔
"میری کچھ شرائط بھی ہیں؟" چوہدری کے کھلے

چاہیے تھے۔ بے پروا اور درخشاں ابھی کچھ بم پھوڑنے کے موڈ میں تھیں۔

"اچھا۔" زین نے پھنسی پھنسی آواز نکالی۔

"وہ کون سی؟"

"زارا اور زین کی شادی پہلے ہوگی۔" درخشاں نے خاصی سنجیدگی سے شرط نمبر ایک بتائی۔

"مجھے منظور ہے۔" چوہدری نے چہک کر کہا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے منظور نہیں۔" زین فوراً بدکا یہ کیسی شرط تھی۔

"کیوں؟" زارا چیخی۔

"تمہارے ابا کا امیج کوئی اتنا اچھا نہیں میرے سامنے۔"

☼ ☼ ☼

اور میں نہیں۔۔ آپ رخصت ہو کر میرے گھر آئیں گے۔" درخشاں کا لہجہ بے تاثر تھا۔ چوہدری پہلی بار چونکے۔

☼ ☼ ☼

"یو مین۔۔ میں گھر داماد بنوں گا میں۔" زین سے جتنا ہو سکا چیخا۔

"ہاں۔ ایسا کرنے سے ہم سب مل کر رہیں گے نا۔" زارا اپنے ازلی اطمینان کے ساتھ بولی۔

"مل کر رہیں گے نا۔" زین کی ساری جان جل کر راکھ ہوئی۔

"جتنا تمہارے ابا سے دور جانا چاہوں تم اتنا مجھے ان سے گانٹھو۔"

☼ ☼ ☼

"یہ میں سوچ کر بتاؤں گا۔" چوہدری نے ابھی بھی سوچ کر سنجیدگی سے کہا۔ درخشاں ہونٹ بھینچے بیٹھی رہیں۔

"شادی بے شک زارا اور زین کی پہلے ہوگی۔ لیکن منگنیاں ہم ایک ہی دن کریں گے۔" چوہدری نے درخشاں کی خاموشی سے شہ پا کر اپنی خواہش بھی بتا دی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ایک دن میں منگنیاں رکھنے سے۔" زارا نے بے نیازی دکھائی۔

"بڑی وہ ہو۔" زین قدرے خفا تھا۔

"ساری شرطیں اپنی منوائیں۔ میں بھی شادی کے بعد گن گن کر بدلے لوں گا۔" منہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے دھمکی بھی دے ڈالی۔ ادھر پروا کسے تھی۔

☼ ☼ ☼

"پھپھو پلیز دروازہ کھولیں۔ دیکھیں میں اپنے سارے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ ہاتھ جوڑے کھڑا ہوں۔ پاؤں بھی پڑ جاؤں گا۔ پلیز دروازہ کھولیں۔" منگنی کا خاص سوٹ زیب تن کیے وہ کتنی دیر سے درخشاں کے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ مگر اندر خاموشی ہی خاموشی تھی۔

"یقین مانیں وہ سب ڈرامہ تھا۔ اسکرپٹ تھا آپ کو راضی کرنے کی سازش۔ میں معصوم ایسا کچھ آپ کو کہہ سکتا تھا بھلا۔" مگر خاموشی۔

"اچھا مجھے دیکھ تو لیں ایسا لگ رہا ہوں۔ آج اتنا اہم دن ہے ہماری لائف کا اور آپ سے وہی خاموشی" زین کو رونا آنے لگا۔ اتنے دنوں سے درخشاں نے بات نہیں کی تھی۔ سوچا تھا۔ منگنی کے دن مان جائیں گی۔ مگر وہ تو آج بھی ناراض تھیں۔

☼ ☼ ☼

چوہدری صاحب نے منگنی کا انتظام بھی ایسے کیا جیسے کہ شادی ہو۔ حالانکہ زین نے بہت کہا۔

"کچھ خیال کریں۔ اپنی عمر دیکھیں اور یہ چونچلے دیکھیں۔ لوگ کیا سمجھیں گے اتنا چاؤ چڑھا تھا شادی

کا۔"

"یہ میں اپنی نہیں اپنی بیٹی کی منگنی کا انتظام کر رہا ہوں۔" ان کے پاس ہر اعتراض کا جواب تھا۔ ان ہی کی محنت اور محبت کا ثبوت آج کا فنکشن تھا۔ چیدہ چیدہ لوگوں کو بلایا گیا۔ زارا ہی نہیں درخشاں بھی سجی ہوئی تھیں۔ اور بے حد مطمئن نظر آرہی تھیں۔ چوہدری کے دونوں کن مین بھی سوٹڈ بوٹڈ تھے۔

"بالکل انشورنس والے لگ رہے ہو۔" کب سے زارا کے گرد منڈلاتے زین کو سرگوشی کرنے کا موقع مل گیا۔

"مجھے نہیں پسند وہ۔" زارا نے معصوم سی شکل بنائی۔

یکا یک شور ہوا۔

"چھنا چھن پائل والی" گانا بجنے لگا۔ چوہدری نے جلالی نظروں سے درخشاں کو دیکھا تھا خلاف توقع وہ مسکرا دیں۔ اسی گانے کی گونج میں چوہدری نے زین کو اور درخشاں نے زارا کو انگوٹھی پہنائی۔ چہار اطراف تالیاں بجنے لگیں۔ مبارکبادیں دی جانے لگیں۔ مارے خوشی کے زارا چوہدری کے گلے جا لگی۔ کچھ ایسا ہی کرنے زین درخشاں کے قریب ہوا۔ درخشاں فوراً چوہدری کی طرف بھاگیں۔

"بات سنیں۔ اسے مجھ سے دور رکھیں۔"

چوہدری ہی نہیں زین بھی ساکت ہوا۔ پر چوہدری ہی سکتہ توڑ کر مسکرائے۔

"پھپھو بلیو می وہ سب ان کا اسکرپٹ تھا۔ میں بے چارہ تو۔"

"عزت پیاری ہے تو دور ہٹ۔ سالہ بن کے۔" چوہدری درخشاں اور زین کے بیچ میں آکر مصطفیٰ قریشی بے اسٹائل مارنے لگے۔

"اچھا مطلب نکلتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ احسان فراموش۔ پھپھو کو منانے کے لیے میں نے کیسے پاپڑ بیلے۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو۔" محفل اور جگہ کا لحاظ کیے بغیر زین طعنوں پر اتر آیا۔

"ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔" چوہدری کا جی دل جلاتا انداز زین کی آنکھیں چمکا گیا۔

"میں دیکھتا ہوں شادی کیسے ہوگی۔ میں اپنی پھپھو کی منگنی توڑنے۔"

"اوئے طیفے۔ دلاور۔" بیشتر اس کے وہ منگنی توڑنے کا اعلان کرتا۔ چوہدری کی گرج دار پھنکار پر طیفا اور دلاور بندوقیں لٹکائے اطراف سے آتے نظر آئے تو وہ بھیگی بلی بنا زارا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"دیکھو۔ ویسے تو میری کوئی ڈیمانڈ نہیں۔ لیکن جہیز میں یہ طیفا اور دلاور ضرور لیتی آنا۔" وہ کافی غصے میں تھا۔ مگر زارا کان لپیٹے سامنے متوجہ تھی۔ جہاں ابا اور پھپھو مسکراتے کھڑے تھے۔

"مجھے بھی ان کا سسر بننا پڑے گا۔" زین نے دانت پیسے تھے۔

فیملی فوٹو کھنچوانے تک اس کا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ کیونکہ پھپھو اپنا غصہ تھوک کر اسے گلے لگا چکی تھیں۔

☼ ☼

کوئی رات ہے تیری چاہتیں

سمیرا حمید

"میری عمر اکیس سال ہے اور میں فورتھ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مجھ سے چھوٹی ندا سیکنڈ ایئر اور حمزہ ناتھنتھ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ چونکہ میں بڑی ہوں اور میں اس سال بی اے بھی کرلوں گی اس لیے میرے لیے بہت کچھ کیا جارہا ہے گھر میں گونجنے والی بازگشت مجھے ایسی لگتی ہیں جیسے جلد یا بدیر مجھے کمرہ عدالت میں بلایا جائے گا اور کچھ کہے سنے بغیر مجھے میرا جرم سنا دیا جائے گا اور سزا ہوگی۔ "قید۔"

کسی کو فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا سوچتی ہوں' مجھے کیا چاہیے۔ میں کیا ہوں مجھے کیا ہونا چاہیے۔ دن رات کے گزر جانے کو میری زندگی بنادیا اور عشروں کو میری عقل کے درجات "میں اب بڑی ہوگئی ہوں" دو عشرے "مجھے اب ذمہ داری سنبھالنی چاہیے۔" آنے والے عشرے۔ اور میری زندگی۔"

کون جانتا ہے کہ زندگی کہاں ملتی ہے' کیسے ملتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"بینک میں جاب کررہا ہے ساتھ پڑھائی بھی کررہا ہے دو بھائی شادی شدہ ہیں' بہن کی منگنی ہوچکی ہے بڑا گھر ہے گاڑی ہے۔ بہت خوش ہیں تمہارے ابو کہہ رہے تھے بہت شریف لوگ ہیں ہر طرح سے تسلی کی ہے پھر گھر بلایا ہے۔"

"گھر بلایا ہے۔ یعنی ابو سب طے کرچکے ہیں ورنہ تو اجنبی لوگوں کو گھر آنے نہیں دیتے۔"

"ہاں۔ تم یہی سمجھ لو۔"

"اور آپ ملی ہیں؟"

"نہیں اب ہم سب مل لیں گے نا۔ تم تیار رہنا۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جن کے میرے پاس بہت سے معنی ہیں "تم تیار رہنا۔" ذہنی تیاری' جسمانی' روحانی' نظریاتی' خیالاتی اور پتا نہیں کیا کیا۔

"کیسے تیار رہوں" آپ کی طرح۔"

وہ سمجھنے سے قاصر تھی مگر سوال ان کے چہرے پر لکھا تھا۔ ویسے بھی انہیں پوچھنے کی نہیں صرف سننے کی عادت تھی۔

"آپ چاہتی ہیں میں تیار ہوجاؤں؟ بڑے سے ڈبے میں بند ہوجانے کے لیے گالیاں کھانے کے لیے' الزامات اور طعنے سننے کے لیے۔" امی میری طرف حیرت سے دیکھنے لگیں۔

"روا پاگل ہوگئی ہو کیا۔ تم کیسی باتیں کررہی ہو کیا کیا سوچتی رہتی ہو تم؟ میں تمہیں کیا بتارہی ہوں اور تم کیا پوچھ رہی ہو۔"

"آپ مجھے یہ بتارہی ہیں کہ آپ میری شادی طے کرچکی ہیں جو کچھ آپ مجھے بتارہی ہیں وہ سب دیکھ کر آپ سب کچھ طے کرچکی ہیں۔"

"وہ مہذب ہے پڑھا لکھا ہے۔ تمہارے ابو مل چکے ہیں۔"

"ابو ملے ہیں؟ کیا میں ملی ہوں؟ جو کچھ آپ نے بتایا ابو نے یہ نہیں بتایا کہ وہ سوچتا کیا ہے۔ اس کے نظریات کیسے ہیں' اس کے لیے عورت' بیوی کیا حیثیت رکھتی ہیں' پڑھے لکھے تو ابو بھی ہیں۔ عالم فاضل ہیں' مہذب ہیں' آپ کو اس سے ملنا چاہیے۔ اس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ مجھے مارے گا تو نہیں مجھے اندر قید تو نہیں کرے گا گھر کو میرے لیے پنجرہ تو نہیں بنائے گا۔"

"چپ کرو پاگل۔" امی کی آواز رندھ گئی۔

"تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟"

"میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں؟ آپ یہ پوچھیں کہ مجھے ایسا سوچنے پر کیوں مجبور کیا گیا' آپ یہ پوچھیں کہ میں ایسا کب سے سوچ رہی ہوں۔ میں ایسا تب سے سوچ رہی ہوں جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ بھی کسی کی بیوی ہیں اور مجھے بھی کسی کی بیوی بننا ہے مجھے بھی آپ کی طرح زندگی گزارنی پڑسکتی ہے میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں اور میرا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔"

"تم یہ فیصلہ خود کرنا چاہتی ہو۔"

"ابھی تک تو نہیں۔"

"تو پھر تمہیں کیا چاہیے۔"

"یہی کہ آپ میرے لیے وہی فیصلہ کریں جو میرے لیے کیا جانا چاہیے۔ آپ میری شادی کرنے جارہی ہیں ایک شخص کے ساتھ آپ کے کہنے پر مجھے ساری زندگی گزارنی ہے' چند ملاقاتوں میں آپ یہ سب کیسے کرسکتے ہیں۔"

"پھر مجھ سے کیوں اپنے ابو سے پوچھو جن کے پاس یہ اختیارات ہیں۔"

"اختیارات انہی کے پاس ہیں آپ کے بھی اور ہمارے بھی' اختیارات ذمہ داری کو بڑھادیتے ہیں انہیں کچل دینا اختیارات کی تباہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

میں روا ہوں۔ میں اکیس سال کی نہیں۔ میں اکیس ماہ کی بھی نہیں ہوں جس میں ایک خوفزدہ سی بچی ہوں یا میں بہت بوڑھی ہوں۔ یا میں بہت چھوٹی ہوں شاید میں صرف ایک لڑکی نہیں ہوں اور شاید میں ایک مکمل انسان بننا چاہتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں بولتی ہوں' چیزوں کا رویوں کا بغور جائزہ لیتی ہوں۔ رات دن ان کا مشاہدہ کرتی ہوں۔ غلط یا درست پر میری ایک اپنی رائے ہے۔ میں رویوں کو پرکھتی ہوں اور ان کے نتائج اخذ کرتی ہوں۔ میں جذبات کو جانچتی ہوں اور ان پر کڑی نظر رکھتی ہوں۔

میں اتنی حساس ہوں کہ دردناک انہونی کا سوچ کر ہی رونے لگتی ہوں۔ بے چین رہتی ہوں اور بہت روتی ہوں' بہت خوفزدہ ہوجاتی ہوں اور نڈر بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں صبر کرتی ہوں پر شاید میں صبر کی قائل نہیں ہوں' صبر مجھے جبر سا لگتا ہے صبر شاید آنسوؤں سے سروڑتا ہے اور جبر آہوں سے' تکلیف دہ دونوں ہی ہیں اور میں تکلیف سے بھی خوفزدہ ہوں۔

مجھے دوسروں کے غم لاحق ہوجاتے ہیں اور میں ان کے کرب میں مبتلا ہوجاتی ہوں۔

کتابیں پڑھتے ہوئے اکثر ایسا لگتا تھا جیسے کرداروں کا آغاز و انجام صرف کتابوں کے کرداروں کے ساتھ ہی ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔ کرداروں کی کہانیاں صرف کتابوں میں ہی ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ جب شعور بڑھنے لگا تو وہ کردار مجھے اپنے آس پاس نظر آنے لگے۔ پھر وہ میرے اور قریب آگئے کہ میں ان کی دبی دبی سسکیاں' گھٹی گھٹی آہیں' بے آواز آنسو اور روحانی کرب کی چیخیں سننے لگی۔ گھر کا کام کرتے' کھانا پکاتے' گھر کے کونوں میں اسٹور روم میں' بلاوجہ کوئی کام کرتے ہوئے۔ اور شاید لحافوں میں' رات کے اندھیرے میں' بظاہر سوتے ہوئے' مجھے تھوڑا تھوڑا' بہت زیادہ سنائی دینے لگا۔

ابو کے آتے ہی امی منہ ہاتھ دھو کر پہلے جیسی ہوجاتیں۔ اگر کبھی ہم ان کے رونے کی وجہ پوچھ لیتے تو وہ نفی میں سرہلا کر ہمیں جاکر کھیلنے کے لیے کہتیں۔ آہستہ آہستہ ہم نے پوچھنا چھوڑ دیا۔ ہم نے سمجھ لیا تھا کہ رونا بھی شاید امی کا ایک کام ہے۔ شاید سب امیاں روتی ہیں۔ ہر موقعے پر روتی ہیں ہر بات کے لیے روتی ہیں۔

خالہ کی بالیوں پر نہ جاسکنے پر بھی وہ روتی رہیں' ماموں کی منگنی پر' ان کے ولیمہ پر جب وہ اپنے خالہ زاد سے بات کررہی تھیں۔ اس وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ امی کو اپنے خالہ زاد سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ اچھی عورتیں یہ کام نہیں کرتیں۔ اچھی عورتیں ایسے منہ اٹھائے ہر کسی کی سلام دعا کا جواب نہیں دیا کرتیں۔ شریف عورتیں گھروں میں ہی رہتی ہیں وہ گھروں میں بیٹھ کر روتی ہیں تاکہ انہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ امی عید پر روتیں اور عید کے بعد آنے والے ہر تہوار پر روتیں تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔

شروع شروع میں تہواروں پر امی ابو کی تکرار ہوتی پھر ہم سمجھ گئے کہ کسی بھی تہوار پر کہیں جانا اور کسی کے کام آنا ضروری نہیں۔ رشتے داروں سے ملنا۔ دور و نزدیک کی تقریبات میں شرکت کرنا یہ سب وقت کا ضیاع ہے امن و امان تو صرف گھر کی چار دیواری میں ہے باہر تو صرف فساد ہے۔

مجھے میری فرینڈز کی ممّی بہت مختلف لگیں۔ بہت تروتازہ' کھلکھلاتی ہوئی' چمکتی آنکھوں والی' اور میری امی۔ ایسے لگتا ابھی رو پڑیں گی۔

ایک بار میں نے اپنی فرینڈ سے پوچھا۔

"تمہاری امی روتی ہیں۔"

"ہاں بہت... بہت زیادہ۔ ان کا ہاتھ جل گیا تو بہت روئیں۔ ہم سب ہنسنے لگے اور پاپا بھی... کہتے دیکھو تمہاری ماما بچوں کی طرح رو رہی ہیں۔"

"اوہ۔" جو اطمینان مجھے رونے کا سن کر ہوا تھا وہ جاتا رہا۔

"تو کیا ہر بار امی کا ہاتھ جل جاتا ہے۔"

"پہلی بار وہ شاید ابو کے سامنے رو رہی تھیں۔ نانا ابو کی وفات پر۔"

"میں آخری بار ان سے مل بھی نہ سکی۔" ایک ہی جملہ' ایک ہی شکوہ' ایک ہی رونا۔

ان دنوں ایسے لگتا تھا جیسے امی مخبوط الحواس ہوگئی ہوں' حالانکہ اس عمر میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ مخبوط الحواس کسے کہتے ہیں۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ جو انسان وہ کرے جو اسے نہیں کرنا چاہیے وہ پاگل ہوتا ہے۔ نہ وہ ہمارے ساتھ بیٹھے بھاگتیں کہ ابو کے آنے سے پہلے ہم اپنا اسکول کا کام ختم کرلیں اور کھانا کھا کر سوجائیں۔ ہم چھت پر کھیلتے رہتے یا گھر کے کمروں میں چور سپاہی انہیں خبر نہ ہوتی۔ وہ کھانا کھلادیتیں اور ہمیں امی جلے ہوئے کھانے کو کھانے کا کہتیں۔

ان دنوں مجھے معلوم ہوا کہ "امی منحوس ہیں" ابو نے کہا کہ امی کی سوگوار شکل اور رات دن کے رونے نے سب کچھ برباد کردیا ہے اور ان کی نحوست سے کاروبار ختم ہوتا جارہا ہے' مجھے لگا کہ شاید ابو کا مطلب ہے کہ امی بھی دوسروں کی طرح نہیں' مسکرائیں' لیکن شاید ساری امیاں ایسی ہی ہوتی ہیں' ڈری ڈری' سہمی ہوئی' افسردہ اور سوگوار۔

☼ ☼ ☼

"ابھی صرف نکاح ہوگا' تم آرام سے اپنا بی اے کرو۔" بات کیسے بھی ابو تک پہنچی وہ بات کرنے کے لیے مجھ تک آگئے۔

"میں نکاح نہیں کروں گی۔"

"نہیں؟ کیوں؟" وہ دھاڑے' یہ وہی دھاڑ تھی جسے سنتے سنتے ہم بڑے ہوئے تھے' وہ امی کو گھور رہے تھے' میری سمجھ میں نہیں آیا انہیں ان پر غصہ آرہا تھا۔ "معلوم کرنا چاہتی ہے کہ وہ لڑکا اس کے باپ جیسا تو نہیں۔" امی نے اپنے ماضی کے حساب کتاب کا حاصل شدہ ابو کو سنا دیا' گزرے زمانے کی ہربات کے لیے ایک ہی بات شاید وہ مجھ سے زیادہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کو اس کے باپ جیسا کوئی نہ مل جائے' ابو پہلے سمجھے ہی نہیں۔

"تمہارے باپ میں کیا کمی ہے۔"

"میرے باپ میں میرے لیے کوئی کمی نہیں ہے۔"

"اتنا پڑھ لکھ کر بھی تم جاہل ہی رہی ہو' مسلمان ہو' اسلامی کتب پڑھتی ہو' کیا چاہتی ہو؟ بے لگام آزادی چاہتی ہو' تمہیں آزاد چھوڑ دیا جائے' بازاروں میں' گلیوں میں سرعام گھومو' کوئی تمہیں پوچھے نہ' تمہیں روکے' یہ سب چاہیے؟ باپ ظالم ہے' جس نے پالا' پڑھایا' لکھایا' ہر آسائش دی۔" ابو اپنی بیٹی سے نہیں دنیا کی ہر عورت سے ہم کلام تھے' وہ ہر عورت سے پوچھ رہے تھے۔

"تمہیں کیا چاہیے؟ آزادی' بے لگام آزادی' پچھلے وقتوں میں جب تم لونڈیاں تھیں تب ہی ٹھیک تھیں نا تم۔"

"میں مسلمان ہی ہوں' بہت سی کتب پڑھتی ہوں' چادر اوڑھ کر بازار جاتی ہوں' غیر مردوں کو غیر ہی سمجھتی ہوں' اپنے نفس پر کنٹرول کرتی ہوں' بے لگام آزادی کی قائل نہیں ہوں۔"

"پھر تمہیں کیا چاہیے' اچھا کماتا ہے' اچھا دکھتا ہے' اچھا گھر ہے' اچھا خاندان ہے۔"

"اچھا گھر تو ہمارا بھی ہے' اچھا خاندان تو آپ کا بھی ہے' اچھا تو آپ بھی کماتے ہیں۔"

"تو کیا خوش نہیں رکھا تم سب کو' جو کمایا تم سب کو کھلایا' کس چیز کی کمی رہنے دی میں نے' اتنا کرنے پر

بھی ایسی اولاد؟ لیے سوال جواب' باپ کو باپ نہیں سمجھتی' جب حال ہی ٹھیک نہ ہو تو من و سلویٰ کھا کے بھی اولاد نافرمانی ہی کرے گی' باپ میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں' اس عورت نے اپنے جیسا کر دیا میری اولاد کو۔" امی نے تاسف سے میری طرف دیکھا' اپنی ذات' اپنے خاندان کے بعد اب انہیں اولاد کے گناہوں کا بھی حساب دینا ہو گا۔

"کیا جاننا ہے تمہیں؟ پوچھو مجھ سے' کس بات کی بے چینی ہے انی' فرشتے نہیں ہیں اس زمین پر جو تمہارے لیے ڈھونڈیں' انسان بستے ہیں اور انسان میں سو برائیاں سو نقص ہوتے ہیں۔"

"افسوس کہ فرشتے ہی تو نہیں بستے زمین پر۔۔۔ یہی وہ خوف ہے جو مجھے لاحق ہے کہ آخر فرشتے ہی کیوں نہیں بستے زمین پر' اگر فرشتے نہیں بستے یہاں تو میرا کیا ہو گا' ہمارا کیا ہو گا۔" امی مجھے وہاں سے زبردستی لے آئیں' ابو مسلسل امی کو گھور رہے تھے۔

"حکم عدولی کرو گی تو شوہر مار بھی سکتا ہے' اتنی زبان اس کے سامنے چلاؤ گی تو کون برداشت کرے گا' باپ نہیں ہو گا وہ تمہارا جو برداشت کرلے۔" ابو بولتے جا رہے تھے۔

✲ ✲ ✲

"یہ میری قسمت تھی ردا۔۔۔ لڑائی جھگڑا کہاں نہیں ہوتا۔۔۔ کیا کمی ہے ہمارے گھر میں ہم سب میں۔۔۔ دنیا کی ہر نعمت تمہارے ابو نے لا کر دی' نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"ان نعمتوں کو جو آپ کو' آپ کے امی' ابو' بہن بھائیوں کو ملتی تھیں' نعمت کہتی ہیں آپ یا قسمت' اپنی سہیلی سے آپ نے کیوں کہا کہ وہ بہت خوش قسمت ہے جو اسے اتنا خیال رکھنے والا شوہر ملا' خود کو کیوں نہیں خوش قسمت کہا آپ نے؟ شکر بجا لانا چاہیے تھا آپ کو ہنستی' خوش رہتیں اس سے بہتر شکر کی ادائیگی اور کیسے ہو سکتی تھی؟ اپنی عمر سے کیوں اتنی بڑی لگتی ہیں آپ؟"

"تم اپنی ماں سے گزرے ہوئے وقت کا حساب لے رہی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں آپ کی طرح صابر نہیں ہوں' میں آپ کی طرح کے وقت میں ایک پل بھی نہیں رہ سکوں گی۔"

"قسمت اچھی ہو تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"قسمت شادی پر ہی آکر کیوں خراب ہوتی ہے؟ میں اور ندا بازار سے کچھ الٹا سیدھا لے آئیں تو اس وقت تو آپ نہیں کہتیں کہ ہماری قسمت خراب تھی جو ہمیں خراب چیز ملی' آپ تو ہمیشہ کہتی ہیں تاکہ سوچ سمجھ کر لانا تھا۔"

"ہاں شاید۔۔۔ زمانہ بدل چکا ہے' وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں' سوچ بدل گئی ہے اب لوگوں کی۔"

"زمانہ بدل چکا ہے' لوگ بدل چکے ہیں' کب؟"

"کھڑکیاں اور چوبارے بدل گئے ہیں' گھونگھٹ الٹ دیے گئے ہیں' گجوان بدل گئے ہیں' مدرسوں کی جگہ اسکول آگئے ہیں' تختی کی جگہ لیپ ٹاپ' بس اتنا ہی ہوا ہے' انسان وہ ہی ہے' بدنیت' بدنیت ہی رہنا ہے' چاہے زمانہ کوئی سا بھی ہو' زمانہ کب کسی کو نیک بناتا ہے' نیکی تو حاصل کی جاتی ہے۔"

"ردا تم اتنی بڑی بڑی باتیں کب سے کرنے لگی ہو۔۔۔ تم۔"

"جب سے بڑی بڑی باتیں سنی ہیں۔۔۔ بدذات' بے غیرت' بے لگام' [illegible] منحوس' تیرے یار۔۔۔ اتنی بڑی بڑی باتیں [illegible] کے مطلب کھوجتے کھوجتے میں اتنی [illegible] ہو گئی کہ چپ سی لگ گئی' آس پاس [illegible] کیا میرے۔۔۔ آپ تو سنتی رہی ہیں [illegible]۔۔۔ آپ نے سوچا نہیں کہ ہم سب نے [illegible] بھی یہ باتیں۔۔۔ بہت بار۔"

امی کے چہرے سے وہ ہی دکھ جھلکنے لگا جو اکثر روتے ہوئے جھلکتا تھا۔

"تمہارے ابو نے ہمیشہ تم سب سے بہت پیار کیا ہے' بہت خیال رکھا ہے تم سب کا۔"

"کاش وہ آپ کا بھی رکھ لیتے۔ نانا ابو کی وفات پر

آپ کتنا روتی رہی ہیں۔۔۔ ایک بار آپ کو تسلی دے دیتے' آپ کو ان سے ملوا لے جاتے۔۔۔ نانی کی وفات پر وہ آپ کے آنسو پونچھ دیتے' آپ کو جتاتے کہ وہ آپ کے ساتھ ہیں' آپ کا خیال رکھنے کے لیے کتنے کتنے دن آپ بیمار رہتی تھیں۔۔۔ اگر وہ آپ کا حال ہی پوچھ لیتے تو آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا۔"

"قسمت خراب ہو تو اچھے لوگ بھی برے بن جاتے ہیں۔"

"اگر یہ سب قسمت نے ہی کرنا ہے تو مجھے کبھی بھی شادی نہیں کرنی' مجھے اپنے راستے پر سفر کا آغاز نہیں کرنا جس کی منزل گہری [illegible] ہیں یا سائبان' اس کا فیصلہ قسمت نے کرنا ہے۔"

"میں اپنے [illegible] کے درد پہ صبر کر سکتی ہوں' میں [illegible] اپنے دل کے درد' اپنی روح کے زخموں [illegible] نہیں کر سکتی تھیں' آپ نہیں بن سکتی' مجھے آپ بننے سے خوف آتا ہے' مجھے ابو جیسا ملنے سے خوف آتا ہے' میں اپنے باپ سے پیار کرتی ہوں مگر ان جیسے سے نہیں کر سکتی۔" میرے بجائے امی رونے لگیں' وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے کرب میں ان سے زیادہ ان کی بیٹی مبتلا رہی ہے۔ میں خوف زدہ ہوں' مگر میں کمزور نہیں ہونا چاہتی' قسمت ایک حقیقت ہے اور تقدیر دوسری۔

✲ ✲ ✲

ابو کے ناراض ہونے اور پھر آگ بگولا ہونے کے باوجود بھی میں نے باقاعدہ منگنی یا نکاح نہیں کیا' پھر بھی دونوں گھروں کے لیے بات طے ہی تھی۔ مجھے ایسی بات طے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' میں فرحان سے بات کر سکتی تھی اور وہ مجھ سے اور میں نے اس کی اجازت لی تھی۔

فرحان اچھا انسان ہے' بہت سلیقے سے بات کرتا ہے' وہ ہمیشہ مجھے آپ سے مخاطب کرتا' وہ اپنی جاب کے قصے سناتا اور میں اپنے کالج کے' پھر آہستہ آہستہ اس کی باتوں سے زیادہ اس کے سوال بڑھنے لگے۔

فرینڈ کی برتھ ڈے پر کون کون تھا؟ تم نے کچھ ہوائی؟ کیا پہنا تھا؟ پھر کون بتاتا تھا؟ فرینڈ کی فیملی میں کون کون [illegible] کس کلاس میں پڑھتا ہے' چھوٹا ہے یا [illegible] کون گروپ کا ہے؟ کتنے کزنز آئے [illegible] تھا' میں نے کس کس سے بات کی' [illegible] ساتھ آئی' کس کے ساتھ گئی' کون کون مجھے [illegible] کے میں دیکھ رہی تھی۔

فرحان جو کچھ پوچھتا میں سچ سچ بتا دیتی' جھوٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' ہاں میں یہ ضرور چاہتی تھی کہ وہ اور سوال پوچھے' وہ ہر وہ سوال پوچھے جو اس کے ذہن میں آتا ہے میرے لیے۔

مجھے کالج کون چھوڑنے جاتا ہے' میں کالج سے کس کے ساتھ آتی ہوں' بازار کس کے ساتھ جاتی ہوں' شام کو چھت پر کیا کر رہی تھی' اس کا فون فوراً کیوں نہیں ریسیو کیا' میرا فون بزی کیوں تھا' پیپرز کی تیاری کے لیے مجھے اکیڈمی جانے کی کیا ضرورت ہے' اکیڈمی کا ماحول کیسا ہے' سر کیسے ہیں' میں کسی فی میل ٹیچر سے کیوں نہیں پڑھتی۔

پہلے مجھے وہم ہوا' پھر شک ہونے لگا' پھر یقین آنے لگا کہ اس کے ذہن میں مجھے لے کر خاصی بے چینی ہے' وہ کئی بار کالج آیا' مجھے بتائے بغیر' یہ سمجھتے ہوئے کہ میں نے اسے نہیں دیکھا' وہ ایک بار میں نے دیکھا اور جب نہیں دیکھ سکی تب کتنی بار آیا ہو گا' اگر اسے مجھ سے ملنا ہوتا تو وہ ضرور مجھ سے ملتا' میں اس سے پوچھ سکتی تھی مگر میرا خیال تھا کہ یا وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے یا میرا بے حد خیال رکھتا ہے۔

اکیڈمی کے باہر میں نے اسماء کے بھائی کو وہ نوٹس دیے جن کلاس پچھلے ہفتے تھا' اسماء بیمار تھی اور وہ اکیڈمی نہیں آرہی تھی' اس نے نوٹس کے لیے اپنے بھائی کو بھیج دیا اور میں نے اکیڈمی کے باہر وہ نوٹس اسے دے کر صرف اتنا کہا کہ وہ ان کی کاپی کروا کر کل مجھے واپس یہاں ہی دے جائے۔ یہ صرف اتنا سا ہی قصہ تھا اور یہ ہی سچ ہے وہ اسماء کا بھائی ہی تھا۔ میں نے فرحان کے پوچھنے پر اسے یہ ہی سب بتا دیا۔

"آپ میری اکیڈمی آئے تھے۔" میرا خیال ہے کہ مجھے بھی کچھ پوچھنا چاہیے۔

"میں وہاں سے گزر رہا تھا۔"

"آپ وہاں سے گزر رہے تھے یا وہاں کھڑے ہو کر میرے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔"

"تم الٹے سیدھے سوال مت کرو' اپنا آپ چھپانے کے لیے۔" وہ آپ سے تم پر آگیا۔

"کیا چھپانے کے لیے۔ کیا ہے جو میں چھپاؤں گی۔ آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔"

"مجھے شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا بہت تیز ہے۔"

"آپ صاف صاف مجھ سے پوچھیں آپ کے دل میں جو ہے۔"

"میرے دل میں کچھ نہیں ہے' میرا خیال ہے تمہیں اکیڈمی جانے کی ضرورت نہیں ہے' تم گھر میں بھی تیاری کر سکتی ہو۔"

"میں گھر میں تیاری کر سکتی تو اکیڈمی کیوں جاتی؟"

"ہاں۔ تم لوگوں کو تو بہانے چاہیے ہوتے ہیں باہر نکلنے کے۔ میں تو سمجھا تھا انکل بہت مذہبی ہیں۔"

"ابو کے مذہبی ہونے اور میرے اکیڈمی جانے کا کیا تعلق ہے؟"

"تم اتنے سوال کیوں کرتی ہو؟"

"میں نے تو کبھی سوال نہیں کیے۔ ہر سوال کا جواب ضرور دیا ہے۔"

"میں پاگل ہوں' نا جو سوال کرتا ہوں' تم بھی کر لو تمہیں کس نے روکا ہے۔"

"آپ میرے کالج آئے تھے؟"

"میں تمہارے کالج کبھی نہیں آیا۔"

"میں نے کئی بار آپ کو دیکھا ہے؟"

"جھوٹ مت بولو۔ میں کبھی نہیں آیا۔ مجھے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"آپ کو آنے کی ضرورت تھی اسی لیے تو آپ آئے۔"

"تم نے سنا نہیں' میں کبھی نہیں آیا' تمہارے کالج۔"

"تم نے آپ کو کئی بار دیکھا ہے' وہ سمجھتی تھی میں نے آپ کو وہاں بلایا ہے۔"

"جیسی تم ویسی ندا۔"

"پھر آپ میری اکیڈمی بھی آئے' ایک چھوٹا سا واقعہ بھی آپ کی نظر سے نہیں بچ سکا یقیناً" آپ اکثر آتے ہیں۔"

"اپنی چوری چھپا رہی ہو۔ مجھ پر الٹے سیدھے الزام لگا رہی ہو۔"

"چوری۔ کون سی چوری۔"

"ہو مت۔ میں سب جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہیں۔"

"وہ ہی جو آج کل ہو رہا ہے' بے غیرتی' بے حیائی' معلوم ہے مجھے کالج کے نام پر کیا کچھ ہوتا ہے' پڑھائی کے نام پر کیا کچھ کیا جاتا ہے۔"

"جو۔ آج کل ہو رہا ہے وہ مجھے مت بتائیں' مجھے وہ بتائیں جو میں کر رہی ہوں' جو آپ کے دل میں ہے جو آپ کے ذہن میں ہے' پڑھتے تو آپ بھی ہیں تو کیا آپ بھی پڑھائی کے نام پر یہ ہی کچھ کرتے ہیں جو مجھے سنا رہے ہیں۔"

"شٹ اپ۔ اتنا پڑھ لکھ کر تم نے یہ سیکھا ہے تم مجھ سے بات کیسے کر رہی ہو' تمہارے ابو ... لگا تھا کہ ان کی بیٹیوں کو بولنا بھی ... اتنا مذہب کا پرچار کرتے ہیں' لگتا ہے ... والوں پر زور نہیں چلتا۔" آغاز ... اپنے نانا ابو کے بارے میں بھی ... اپنے باپ کے بارے میں بھی سن رہی ...

"فرحان صاحب۔ آپ ذہنی طور پر ایک ناکارہ انسان ہیں ... آپ کی ہر بات اور سوال کے لیے میرے پاس یہی جواب ہے۔"

☼ ☼ ☼

مجھے اپنوں سے بے لوث محبت کرنا اچھا لگتا ہے' اگر میں کر نہیں سکتی تو میں اس کی جانچ ضرور کرتی

ہوں' میں کوشش کرتی ہوں کہ میری محبت میں سچائی ہو' میں ناراض ہوتی ہوں مگر ناراضی کو جلد دور کر لیتی ہوں' ورنہ یہ محبت کو کھا جاتی ہے۔

میں کسی نتیجے کے انتظار میں نہیں تھی' لیکن اگر ہم حقیقت کو بدل نہیں سکتے تو ہمیں اس کے ساتھ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وقت زندگی بناتا ہے اور زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے' رشتہ توڑ دیا گیا' گھر کا ماحول ایسا تھا جیسے میں کسی گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوئی ہوں اور اب مجھے برداشت نہیں کیا جائے گا' ابو مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

"اگر دوسرا بھی ایسا ہوا تو؟" تیسرا' چوتھا' اگر ہر آدمی ایسا ہوا تو بھی ... کے تاسف سے میری طرف دیکھا' وہ ... تھیں' اچھا لڑکا' اچھا خاندان' اچھی جاب ... تھیں اس رشتے میں' وہ فیصلہ نہیں ... کہ میں غلط ہوں یا درست۔

"ہر انسان مکمل نہیں ہوتا۔"

"میں مکمل انسان کی تلاش میں بھی نہیں ہوں' ... کی تلاش وقت کا ضیاع ہے۔"

"دنیا میں ایسے ہی لوگ بستے ہیں۔" وہ ابھی بھی بہت دکھی تھیں' وہ ابو سے ہی ملی تھیں اور ان کے لیے ساری دنیا میں ان ہی جیسے لوگ تھے۔

"اگر ایسے لوگ بستے ہیں تو انہیں اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ ہی اپنی دنیا بسالی چاہیے' میں اپنی زندگی کسی کرب میں نہیں گزار سکتی۔"

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کا ماحول اس سے تو بہت مختلف تھا' جس ماحول میں' میں ایک عرصے سے رہتی رہی تھی یا جو میرے اردگرد بنا دیا گیا تھا' سوچوں کا ایک کھنڈر تھا میرے آس پاس۔

میری کلاس فیلو انفال رخصتی سے پہلے خلع لے چکی تھی' اسے فخر تھا کہ اس کے پاپا نے بروقت فیصلہ کیا۔

"رشتہ ہونے تک سب کچھ ٹھیک تھا' گھر' بزنس'

نکاح ہوتے ہی انہیں بزنس میں نقصان ہونے لگا، لالچی لوگ۔ مشکر ندا کا کوئی بل بل کا چکر نہیں تھا، ابا نے کہا برا خواب سمجھ کر بھول جاؤ، غلطی میری تھی جو میں چوک گیا، تم بل لگا کر دھو۔"

شاید ابو مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی، مجھے وہ کبھی برے نہیں لگے، ہاں جب جب میں انہیں کسی کے شوہر کی حیثیت سے دیکھتی ہوں تو میرے احساسات بدل جاتے ہیں، مجھ سے اختلاف اور ناراضی کے باوجود میرا بی اے کلیئر ہوتے ہی انہوں نے دوسری جگہ میرے لیے رشتہ فائنل کر دیا، انہوں نے مجھے بتا یہ جتا دیا کہ میں کسی بھی معاملے میں بولنے کی جرات نہ کروں، وہ سب مجھ سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، امی ان سے ملتی رہیں، حمزہ اور ندا کو وہاں لے جایا گیا، میل جول بڑھنے لگا مجھے سب اچھا ہے کی رپورٹ دی جاتی۔

امی، ابو سے زیادہ چوکنا تھیں، وہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کی بیٹی کے لیے کون ٹھیک رہے گا، کم از کم وہ اتنا ضرور سمجھ گئی تھیں کہ میں کس بات کے لیے خوف زدہ ہوں، شاید وہ بھی ویسے ہی سوچ رہی تھیں، جیسے میں سوچتی ہوں، نقص نکالنا ٹھیک نہیں پر جو نقائص زندگیاں تباہ کر دیں اور ارمانوں کو جلا ڈالیں ان کی پیش بندی کرنی چاہیے۔ ابو میرے لیے انہیں قریب سے جانچ رہے تھے، میرے لیے اتنا ہی کافی تھا، ندا اکثر صائم سے فون پر بات کرتی اور مجھے اس کی باتیں سناتی، ابو نے مجھے بات کرنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کچھ دن پہلے صائم آ کر مجھے یونیورسٹی مل چکا ہے۔ لوگ ابو کے احکامات پر نہیں چلتے، ان کے لیے اپنے بھی کچھ خیالات ہیں اور فرماں برداری ہر ایک پر واجب نہیں ہوتی۔

صائم کے گھر والوں نے ندا کے لیے رشتہ مانگ لیا تھا۔ ابو نے سنتے ہی انکار کر دیا، جبکہ امی کا خیال تھا کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابو کا موقف تھا کہ اس نے اپنی سالی کو اس نظر سے دیکھا ہی کیوں، رشتوں کا احترام اس پر لازم تھا۔ ابو مطمئن تھے، انہیں اپنے [illegible] اچھی فیملی چھوڑ دینے پر دکھ نہیں تھا، صائم ان کی نظر میں بہت گر چکا تھا، وہ ان کے لیے وہ لڑکا تھا جو سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے، شاید جب وہ مجھ سے ملا اسے لگا کہ میری بجائے ندا اس کے لیے پرفیکٹ ہے۔ یقیناً اس کے لیے میں اور ندا ایک جیسے نہیں تھے۔

اختلاف رائے اکثر رشتوں میں، احساسات میں دراڑ ڈال دیتا ہے، اختلاف رائے ابو کے لیے وہ عمل تھا جو تعلق ختم کر دیتا ہے، پھوپھا جی سے، تایا جی، چچا جان، سب سے، وجہ اختلاف کچھ بھی رہا ہو، انجام لاتعلقی تھا۔ ہم سب بڑے ہو گئے، لیکن وہ کسی بھی وجہ، کسی بھی تعلق کے لیے ان سے روابط بڑھانا نہیں چاہتے تھے، امی کا خاندان وہ شجر تھا جسے عرصہ پہلے کاٹ کر پھینک دیا گیا تھا۔ مزاج کی برہمی، نظریات کا تصادم، حاکمیت کا شوق اور "میں، میں"۔ بہت سے رشتے اور تعلق نگل گئی، ابو شاید تنہا نہیں تھے، پر ہم سب ضرور تھے۔ ہم سب ہی یہ چاہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی ہو ہمارے پاس، جو کچھ بگڑی باتوں کو سلجھا سکے، کوئی تو ہو۔

✿ ✿ ✿

ایم اے فائنل میں، میری رضا اور خوشی سے کامران کے ساتھ میری بات طے کر دی گئی، میں خوش تھی، امی بھی بہت خوش تھیں اور ابو بھی، انہوں نے خود کو اس مقام پر کھڑا کر لیا تھا جہاں دوسروں کو غلط کہنا فطرت بن جاتا ہے۔

"یہ ہی سب چاہتی تھیں، یہ ہی کرنا چاہتی تھیں تم [illegible] اپنی من مانی۔" یہ وہ تکرار تھی جو وہ ہمیشہ سے کرنا چاہتے تھے۔

"[illegible] نہیں ہے، اگر ہے تو میں چاہتی تھی کہ یہ من مانی آپ میرے لیے کریں۔"

"یہ ہی تعلیم کا مقصد ہے یونیورسٹیوں میں جانا، تعلیم کا بہانہ کرنا، اسی لیے تم اتنا تڑپ رہی تھیں یونیورسٹی جانے کے لیے۔"

"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا، میری کبھی بھی کسی

کام کے لیے نیت دور تک نہیں رہی۔"

"تم ہی لیے گھر سے باہر نکلنے کی آزادی چاہیے تھی کہ تم لوگ اپنی پسند کے رشتے ڈھونڈو۔" وہ پھر دنیا کی ہر عورت سے مخاطب تھے۔

"میں اس لیے باہر نکلی ہوں، نہ ہی میں نے اپنے لیے کسی کو ڈھونڈا ہے، برے لوگوں کی طرح زندگی میں اچھے لوگ بھی ملتے ہیں، میں نے کامران سے آپ کو ملوایا ہے، اگر وہ برا ہے تو آپ کے پاس انکار کا حق ہے، میں ہاں کے لیے ضد نہیں کروں گی۔"

"اپنی پسند سے تمہیں کتنا بھی اچھا لگے گا، اسی سب کے لیے تم نے ہر اچھے خاندان کے لیے انکار کیا، ہر اچھے لڑکے کے لیے۔"

"اگر آپ فرحان کو اچھا کہہ رہے ہیں تو مجھے حیرت نہیں، لیکن [illegible] آپ نے خود وقاص کے لیے انکار کیا تھا۔ صرف ذات کے فرق سے کوئی برا نہیں بن جاتا۔"

"ہاں وہ تب برا ہو گا جب وہ تمہیں برا بن کے دکھائے گا، جب وہ اپنی چھوٹی ذات پر اترے گا، جب وہ تمہیں گالی گلوچ کرے گا۔ تب بھی وہ تمہارے لیے اچھا ہی ہو گا۔"

"اگر وہ ایسا کرے گا تو واقعی بہت برا ہو گا، یا وہ اپنی ذات کی نام نہاد خوبیاں دکھائے گا یا اسے اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت دینا ہو گا۔ اگر وہ برا ہو گا تو میں چھپاؤں گی نہیں، ظلم پر صبر کا کوئی ثواب نہیں ہے۔"

"یہ دنیا ہے کپڑوں کی دکان نہیں جہاں تم اپنی پسند کے کپڑے خرید لو۔" ان کے لہجے سے نفرت جھلکنے لگی۔

"خریدنے والی چیز ہی پسند کی جا سکتی ہے، جس کا کوئی مول نہیں ہوتا اسے ڈھونڈا جاتا ہے۔

آپ مجھے ناپسند کرتے ہیں، نفرت نہیں اور میں یہ دونوں ہی نہیں کر سکتی، میرے لیے آپ بھی اہم ہیں اور میں خود کے لیے بھی اہم ہوں، اگر صرف مسئلہ کامران کی ذات ہے تو میں آپ کو انکار نہیں کرنے دوں گی اور اگر میرا فیصلہ غلط ہے تو آپ کو مجھے بتانا ہو گا کہ میں کہاں غلط ہوں۔"

✿ ✿ ✿

"[illegible] کہ کامران میں نقائص نہیں ہیں، [illegible] نقائص ہیں وہ زندگی تباہ کر دینے والے ارمان جلا دینے والے نہیں ہیں۔

ہماری اکثر لڑائیاں ہوتی ہیں، اسے اکثر میری جاب پر غصہ آتا ہے، جس کی وجہ سے مجھے صبح گھر سے جلدی نکلنا پڑتا ہے اور اسے کام والی سے گھر کا کام کروانا پڑتا ہے، میرے بد مزہ کھانوں پر اکثر اس کا موڈ آف رہتا ہے، وہ مجھے پھوہڑ اور بد سلیقہ بھی کہہ دیتا ہے۔

لیکن وہ میرے ساتھ بازار بھی جاتا ہے اور شاپنگ بیگز بھی اٹھاتا ہے، وہ میرے سر چکرانے پر میرا B.P چیک کرتا ہے اور کھانا گرم کر کے ٹیبل بھی لگا دیتا ہے، مجھے اس کے اونچا بولنے پر غصہ آتا ہے اور مجھے اس کی اکثر باتوں سے شدید اختلاف ہے۔ لیکن یہ سب ہمارے گھر میں ہوتا ہے، میرے اور اس کے گھر میں۔ اس گھر میں، جس گھر میں بڑی کھڑکیاں ہیں، جنہیں کھول کر میں تازہ ہوا لے سکتی ہوں۔

شادی نے مجھ پر تازہ ہوا کے دروازے بند نہیں کیے۔

✿ ✿

انیلہ کرن

من کا ساتھ تو اچھا ہے

ناولٹ

قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹتے ہوئے اس کی نظر یونہی وال کلاک کی جانب اٹھی تھی جو شام کے ساڑھے چھ بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔

"اف اتنی دیر ہو گئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

الماری میں قرآن پاک کا نسخہ رکھتے ہوئے اس نے سوچا اور فوراً" ہی کچن کی طرف بھاگی۔

اگرچہ گھر میں وہ کل دو ہی افراد تھے' خود نائلہ اور اس کا شوہر عدنان' مگر عدنان چونکہ اچھا کھانے کا شوقین تھا اور نائلہ کو نت نئے کھانے پکانے میں بہت دلچسپی تھی' اس لیے وہ ہمیشہ ہی بہت اہتمام سے کھانا پکایا کرتی تھی۔ خصوصاً" رات کا کھانا وہ بہت توجہ اور لگن سے پکاتی تھی۔ کیونکہ لنچ میں عدنان کبھی کبھار ہی گھر آیا کرتا تھا۔

وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ انہیں اپنے کام سے بہت لگاؤ تھا۔ اس لیے آفس گھر سے زیادہ دور نہ ہونے کے باوجود وہ اکثر کسی نہ کسی مصروفیت میں الجھ کر گھر آ کر لنچ نہیں کر پاتا تھا۔ اس لیے نائلہ رات کو ہی زیادہ اہتمام کرتی تھی۔

اس وقت بھی دیر ہو جانے کے باوجود وہ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی' تاکہ وقت پر سب کچھ تیار کر لے۔

چٹنی بناتے ہوئے اس نے عدنان کو فون کرنے کا سوچا ہی تھا' جب کال بیل بج اٹھی۔ وہ سارا کام چھوڑ کر تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

"آج آپ نے بہت دیر لگا دی۔" عدنان سے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"بس یار! کچھ کام آ پڑا تھا۔ ورنہ میں تو پانچ بجے ہی نکل رہا تھا۔"

"آپ منہ ہاتھ دھو کر کے آ جائیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

بیڈ روم میں جا کر اس کا بریف کیس الماری میں رکھنے اور اسے استری شدہ شلوار قمیص تھمانے کے بعد وہ گنگناتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ جتنی دیر میں عدنان لباس تبدیل کر کے ڈائننگ ٹیبل تک پہنچا۔ وہ ہر چیز قرینے سے سجا چکی تھی۔ ہر روز کی طرح مختلف چیزیں کھاتے ہوئے ان کی تعریفوں میں مشغول ہو گیا تھا' نائلہ مسکراتے ہوئے تعریفیں وصول کرتی رہی۔

"ویسے یار! مجھے شادی سے پہلے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی اچھی کوکنگ کرتی ہو گی۔" نہایت رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا' نائلہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ یہ فقرہ وہ اکثر ہی کہا کرتا تھا اور نائلہ اس پر کبھی تبصرہ نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ شادی سے پہلے کوکنگ کا شوق ہونے کے باوجود وہ بہت کم کچن میں جاتی تھی۔ خصوصاً" جن دنوں میں عدنان سے اس کی منگنی ہوئی اور اس نے کبھی کبھار نائلہ کے گھر جانا شروع کیا۔ ان دنوں تو وہ کچن سمیت دنیا کے ہر کام سے بے زار رہا کرتی تھی۔

عدنان اس کے بابا کے دور پرے کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ اور ان کا ایک دوسرے کے گھر شاذ و نادر ہی آنا جانا تھا۔ مگر خاندان کی شادی کی ایک تقریب میں نائلہ کو دیکھ کر اس نے پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا۔

اس نے ابھی کچھ ماہ پہلے ہی اسلام آباد میں جاب

شروع کی تھی۔ اس لیے اس کے گھر والے اتنی جلدی اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر عدنان کی ضد پر انہیں نائلہ کے گھر رشتہ لے کر جانا ہی پڑا۔ جسے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیا تھا۔ نائلہ باٹنی میں ایم ایس سی کر کے فارغ تھی۔ اور سارا وقت گھر پر ہی ہوتی تھی۔

عمر میں وہ عدنان سے صرف چھ ماہ چھوٹی تھی، جس پر عدنان کی بڑی بہن نے تھوڑا سا اعتراض بھی کیا تھا۔ مگر عدنان کو خاموش اور الگ تھلگ نظر آنے والی نائلہ اتنی پسند آئی تھی کہ اگر وہ اس سے چھ ماہ چھوٹی ہونے کی بجائے چھ ماہ بلکہ چھ سال بھی بڑی ہوتی تو وہ اسی سے شادی کرتا۔ اس لیے اس کی بہن کے اعتراض کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور عدنان کی فوراً ہی منگنی کر دی گئی۔ اور ٹھیک ایک سال بعد شادی ہو گئی۔ تب تک وہ اپنی جاب میں خاصا سیٹ ہو چکا تھا۔ اس لیے شادی کے کچھ ماہ بعد ہی اس نے اسلام آباد میں ایک بنگلے کا چھوٹا سا خوبصورت پورشن کرائے پر لیا اور نائلہ کو اپنے ساتھ لے آیا۔

ابتدا میں وہ بہت کم گو اور گم سم سی لگا کرتی تھی۔ عدنان کی باتوں کے جواب میں وہ کوئی ایک بات کرتی۔ حالانکہ وہ دل سے چاہتا تھا کہ نائلہ خوب بولے۔ مگر اس نے نائلہ سے کبھی یہ کہا نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ وہ خود ہی بدلنے لگی۔ اور گھر میں دلچسپی لینے لگی۔ عدنان بہت کیئرنگ اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ اس لیے کچھ عرصوں کے اندر اندر وہ بالکل بدل گئی۔ اور کسی مینا کی طرح چہکنے لگی تھی۔ اور اس کا یہ روپ عدنان کو بہت اچھا لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آج پھر آپا کا فون آیا تھا۔"

رات کے کھانے کے بعد عدنان کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے اس نے بتایا۔

"چھوں کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ اسپائیڈر کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس لیے سرسری انداز سے پوچھا۔ نائلہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ عدنان کو کمپیوٹر سے متعلق لٹریچر پڑھنے کا جنون تھا۔ اور پڑھتے ہوئے وہ کسی اور طرف توجہ مشکل ہی سے دے پاتا تھا۔

"پوچھ رہی تھیں فیصل آباد کب آنا ہے۔ دراصل ان کی سیٹ اوکے ہو گئی ہے۔ پندرہ دن بعد وہ واپس یو کے چلی جائیں گی۔"

عدنان کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے تفصیل سے بتایا۔ اس بار وہ تھوڑا سا چونکا اور اس نے میگزین بند کر دیا۔

"یار! میں تو ان دنوں بہت اہم پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ اور دس دن سے پہلے میرا فارغ ہونا ممکن نہیں۔"

"اس کا مطلب آپا سے بس سرسری ملاقات ہی ہو گی۔" وہ کچھ مایوس ہوئی تھی۔ عدنان نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ پھر ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

"اس مسئلے کا ایک دوسرا حل بھی تو ہے۔" ایک لمحے کے لیے چپ ہوا نائلہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"کل تم اپنی پیکنگ کر لو۔ اور پرسوں صبح میں تمہیں یہاں سے کوچ میں بٹھا دوں گا۔ فیصل آباد میں تمہارے بھائی تمہیں لینے آ جائیں گے۔ میرے آنے تک تم اپنے میکے میں گزار لینا۔ اس طرح تمہاری آپا بھی خوش ہو جائیں گی اور تم بھی۔"

عدنان نے جو حل پیش کیا تھا وہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ مگر نائلہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی۔ اسے عدنان کی فکر تھی۔

"اور آپ۔ آپ کیسے اکیلے رہیں گے؟"

"ارے یار! تم میری فکر نہ کرو۔ بس دو تین قسم کے سالن بنا کر فریز کر جانا۔ روٹی میں باہر سے لے آؤں گا۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے۔"

"مگر پھر بھی۔"

"اگر مگر چھوڑو۔ اور اپنی پیکنگ کرو۔ میں پہلے بھی تو اکیلا رہتا ہی رہا ہوں۔ اور ویسے بھی آپا دوبارہ پتا نہیں کب آئیں۔"

عدنان نے دانستہ اپنا لہجہ ہلکا پھلکا رکھا تھا۔ تاکہ وہ الجھن سے نکل آئے۔ نائلہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عدنان کی طرف سے فکرمند ہونے کے باوجود اکلوتی بہن کے ساتھ کچھ دن گزارنے کا خیال اسے اندر سے بے حد خوش کر رہا تھا۔

اگلا سارا دن اس نے اپنی پیکنگ کرنے اور کوکنگ میں گزارا۔ وہ عدنان کے لیے زیادہ سے زیادہ کھانے فریز کر کے جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عدنان کو گھر سے باہر کا کھانا بھی پسند نہیں آتا۔

☼ ☼ ☼

"اپنا خیال رکھنا۔ اور مجھے فون کرتی رہنا۔ میں بھی رابطہ رکھوں گا۔ اور گھبرانا بالکل نہیں۔"

یہ ساری نصیحتیں وہ کتنی ہی بار اسے کر چکا تھا۔ مگر ابھی بھی اسے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ نائلہ اس کی پریشانی پر ہلکے سے ہنس دی۔

"عدنان! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں اپنا بہت خیال رکھوں گی۔"

اس نے پچھلی ہر بار کی طرح یقین دہانی کروائی تھی۔ بس اب چلنے ہی والی تھی۔ اور عدنان اسے اس کی سیٹ پر بٹھا کر اب نیچے اترنے لگا تھا۔ مگر جاتے جاتے بھی اسے ہدایات دیے جا رہا تھا۔

"یار! کیا کروں۔ مجھے واقعی بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ آخر تم میری اکلوتی بیوی ہو۔ میرا بس چلتا تو میں تمہیں خود چھوڑ کر آتا۔ اب جب تک تم گھر نہیں پہنچ جاؤ گی۔ میں ڈھنگ سے کوئی کام تو نہیں کر سکوں گا۔"

ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اور اب گردن موڑے اپنے سے محض چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے عدنان کی پشت دیکھتے ہوئے اس کے ڈائلاگ سن کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ آخر عدنان نائلہ کو اللہ حافظ کہہ کر نیچے اترا تو اس نے کوچ اسٹارٹ کی۔

نائلہ کھڑکی سے عدنان کو اپنی کار کی طرف جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تو اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر پردہ چھوڑ دیا۔ اس لمحے اس کی نظر سامنے کی جانب کوچ کے ڈرائیور کی طرف اٹھی تھی۔ اور پلٹنا بھول گئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوچ کے ڈرائیور کو دیکھے جا رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ ڈرائیور بے حد خوبصورت تھا۔ اور اس کی بے تحاشا خوبصورتی کسی کو بھی اپنا اسیر کر سکتی تھی۔ مگر نائلہ کو اس وقت اس کی خوبصورتی نے نہیں جکڑا تھا۔ وہ چہرہ اس نے پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ اس چہرے کا تو ایک ایک نقش اسے ازبر تھا۔

اس کے اندر تو کوئی اور ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ طوفان سا برپا تھا۔ جس نے اس کے اندر حشر کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ دل میں کہیں بہت اندر بہت گہرائی میں لہو سا رسنے لگا تھا۔ جیسے کسی رفو کیے ہوئے زخم کے

سارے ٹانکے ایک جھٹکے سے ادھڑ گئے ہوں۔ اور تازہ ہو جانے والے زخم کی تکلیف انسان کو نڈھال کر دے۔ نائلہ بھی اس وقت ایسی ہی اذیت سے گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی اس کے اندرونی کرب کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

نہ جانے کتنی ہی دیر تک وہ ساکت بیٹھی ڈرائیور کے چہرے پر نظریں جمائے رہی۔ پھر اس نے بہت کوشش کر کے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے چھڑائی تھیں۔ اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اسی لمحے ڈرائیور نے گردن کو ہلکا سا موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سنگل سیٹ پر سب سے آگے بیٹھی تھی۔ شاید اسی لیے اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے بہتے آنسو کسی کو نظر نہیں آئے تھے۔ اسے لگا کہ جیسے اس کا سانس رک رہا ہے۔ وہ لڑکی اس دنیا کی واحد ہستی تھی۔ جس کی آنکھوں میں وہ کبھی بھی آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی کسی تکلیف میں مبتلا ہونے کا صرف تصور کرنے سے ہی اس کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ بہت بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ اپنی توجہ ڈرائیونگ کی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

نائلہ نے پہلی بار اس چہرے کو کب دیکھا تھا؟ اور اس نے اسے آخری بار کب دیکھا؟ اس بیچ میں صرف آٹھ ماہ کا وقفہ تھا۔ صرف آٹھ ماہ تک۔ وہ شخص صرف آٹھ ماہ کے لیے اس کی زندگی میں آیا تھا۔ اور اس کی زندگی کی کتاب پر اپنا انمٹ گہرا نقش چھوڑ کر گیا تھا جو چار سال میں بھی مٹ نہیں پایا تھا۔

اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ وہ زرعی یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمیشن لینے کے لیے گئی تھی۔ اس روز ان کا رٹن ٹیسٹ ہونا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بچپن کی دوست عارفہ بھی تھی۔ نو بجے ٹیسٹ شروع ہونا تھا۔ اور یونیورسٹی تک بس میں جانے میں تقریباً پینتالیس منٹ لگتے تھے۔ پھر آگے یونیورسٹی گیٹ سے ڈیپارٹمنٹ تک طویل راستہ تھا جسے پیدل طے کرنا تھا۔ اس لیے وہ دونوں سوا سات بجے ہی اسٹاپ پر آ گئیں۔ اور جو پہلی میٹرو بس ملی اس میں بیٹھ گئیں۔

وقت کا حساب لگا کر وہ مطمئن تھیں کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی ڈیپارٹمنٹ پہنچ جائیں گی۔ مگر اکبر آباد موڑ پر بس میں اچانک ہی کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ چند منٹ تو وہ انتظار کرتی رہیں کہ شاید انجن میں پیدا ہونے والی خرابی دور ہو جائے گی۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو پریشان ہو گئیں۔ کیونکہ ٹیسٹ تو وہ مس نہیں کر سکتی تھیں۔

"عارفہ! میرا خیال ہے۔ یہاں سے رکشا لے کر یونیورسٹی چلتے ہیں۔ کہیں زیادہ ہی دیر نہ ہو جائے۔"

دونوں میں سے نائلہ ہی زیادہ بے صبری تھی۔ اس لیے وہی پہلے بولی۔ عارفہ اس کے برعکس متحمل مزاج تھی۔ اس وقت بھی اس نے ___ تحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ اور متانت سے کہنے لگی۔

"تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ کیا پتا خرابی ٹھیک ہو ہی جائے۔"

مگر وہ اس کی بات کو ان سنی کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ڈرائیور سے پوچھتی ہوں۔ [illegible] اندازہ ہو گا کہ کتنی دیر لگ سکتی ہے۔"

اس بار عارفہ نے کچھ نہیں کہا۔ نائلہ تھوڑا سا آگے جا کر ڈرائیونگ سیٹ کے قریب پہنچی۔ تو ڈرائیور کھڑکی سے سر باہر نکالے کھڑے بس کے کنڈیکٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ نسوانی آواز سن کر اس نے اپنا سر اندر کیا اور اس کی طرف دیکھا۔

ایک لمحے کے لیے نائلہ کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ وہ خطرناک حد تک خوبصورت تھا۔ کم از کم نائلہ نے اپنی پوری زندگی میں آج سے پہلے اتنا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ مبہوت سی رہ گئی۔ اور ڈرائیور کی کشادہ بھوری آنکھیں اور مڑی ہوئی پلکوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں فوراً" ہی خیال آیا کہ اتنے خوبصورت شخص کو کم از کم ڈرائیور تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"جی؟ مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟" اسے خاموش کھڑا دیکھ کر ڈرائیور نے سوال کیا تھا۔

اس کی شخصیت کی طرح اس کی آواز بھی بہت دلکش تھی اور لہجہ عام ڈرائیوروں کے برعکس بہت مہذب اور شائستہ تھا۔ اس کے لہجے نے نائلہ کو دوسری بار حیران کیا تھا۔

"ابھی کتنی دیر اور لگے گی؟"

بمشکل اس نے اپنا سوال پورا کیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ [illegible] حسن کس کو کہتے ہیں۔ اس کا سوال سن کر [illegible] مسکرایا، پھر پہلے جیسی شائستگی سے [illegible]

"انجن میں کوئی خرابی ہے۔ پتا نہیں کتنی دیر مزید لگے۔" [illegible] کچھ کہے بغیر نیچے اتر آئی۔ اسے اترتے دیکھ کر عارفہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ آئی تھی۔

روڈ کراس کر کے انہوں نے رکشا لیا۔ اور جب رکشا بس کے سامنے سے گزرا تو نائلہ نے بے اختیار ہی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب دیکھا تھا۔ وہ وہاں موجود تھا۔ مگر اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک بار پھر کنڈیکٹر سے باتوں میں مشغول ہو چکا تھا۔ نائلہ کو عجیب سے احساسات نے گھیر لیا۔ بے اختیار ہی اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ڈرائیور بھی اسی کی طرح مڑ کر اسے دیکھتا۔

بعض اوقات دل بہت انوکھی سی خواہشیں کرنے لگتا ہے نا۔

☼ ☼ ☼

اگلے کچھ دنوں تک اسے اس بے حد خوبصورت اور مہذب لب و لہجہ رکھنے والے ڈرائیور کا خیال آتا رہا۔ پھر وہ اسے فراموش کر گئی۔ دوسری بار اسے وہ تب نظر آیا۔ جب وہ ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمیشن ہو جانے کے بعد باقاعدہ کلاسز اٹینڈ کرنا شروع کر چکی تھی۔ عارفہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں اکٹھی گھر سے

جاتیں اور اکٹھی ہی واپس آجاتیں' دونوں کے گھر نشاط آباد میں قریب قریب ہی تھے۔ اس لیے یونیورسٹی اور گھر دونوں جگہوں میں ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔

اس روز بھی صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ عارفہ کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی۔ جب اسے اپنے چہرے پر کسی کی نظریں محسوس ہوئیں۔ بس اس وقت الائیڈ اسپتال کے قریب ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی تھی۔ پہلے تو اس نے اس احساس کو اپنا وہم جانا' پھر جب مستقل اسے یہی محسوس ہوتا رہا تو اس نے پچھلے پورشن کی طرف سرسری نظر ڈالی۔ وہاں کئی مرد اور لڑکے جالی کے قریب کھڑے تھے۔ اور ان میں سے کچھ عورتوں والے حصے میں جھانک بھی رہے تھے۔ مگر نائلہ کو ان میں سے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ جو باقاعدہ طور پر اسے دیکھ رہا ہو۔ اس لیے وہ سر جھٹک کر دوبارہ سے عارفہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مگر فوراً" ہی پھر سے اسے احساس ہونے لگا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ اس بار اس نے سر اٹھایا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ کی جانب اٹھ گئی۔ اور یہ دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ناصرف یہ کہ اس دن والا خوبرو اور مہذب ڈرائیور موجود تھا۔ بلکہ وہ بہت توجہ سے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں اتنی نرمی تھی کہ نائلہ کو بے اختیار ہی اس کا خود کو دیکھنا اچھا لگنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس ڈرائیور کی چمکتی ہوئی بھوری آنکھوں اور ان آنکھوں کے نرم تاثر نے اس کے اردگرد کوئی روشنی کا حصار سا قائم کر دیا ہے۔ اور اسے اس حصار میں قید ہونا اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر اپنے دل کی شور مچاتی دھڑکنوں پر بے تحاشا حیرت ہو رہی تھی۔

"ضروری تو نہیں وہ مجھے ہی دیکھ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔" چند لمحوں کے بعد خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سوچا اور ایسا سوچتے ہوئے بھی اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس کا باغی ہوتا ہوا دل اس سوچ کو ماننے والے خیال کی شدت سے نفی کرنے پر تلا ہوا ہے۔

چور نظروں سے اس نے دوبارہ ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اور نائلہ کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر بھی اس نے اپنی آنکھوں کا زاویہ بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نائلہ کو خوبصورتی اور تہذیب کے بعد اس کی جس تیسری خوبی نے متاثر کیا وہ یہی اعتماد تھا۔ وہ عارفہ سے باتیں کرنا یکسر بھول گئی تھی۔ اور اس وقت اپنی شور مچاتی دھڑکنوں کو شمار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو آج کسی انوکھی اور بہت دلکش لے پر دھڑک رہی تھیں۔

✲ ✲ ✲

آنے والے دنوں میں وہ بس ڈرائیور اس کی زندگی میں ہر چیز سے بڑھ کر اہم ہو گیا۔ بعض اوقات اسے خود پر حیرت ہوتی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

"کیا میں ایک بس ڈرائیور سے محبت افورڈ کر سکتی ہوں۔"

وہ تنہائی میں خود سے بار بار سوال کرتی۔ اور ہر بار اندر سے یہ ہی جواب آتا کہ وہ افورڈ کرے یا نہ کرے مگر سچ یہی ہے کہ وہ اس ڈرائیور سے محبت کرنے لگی ہے۔ اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ اگر اس کو اس کی زندگی سے نکال دیا جائے تو پیچھے کچھ نہیں بچے گا۔

ان دنوں اس کی ہر سوچ اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے سپنے دیکھتی اور اس کا ساتھ پانے کے خواب بنا کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بس کا ڈرائیور تھا۔ اور نائلہ کو صرف اسی کی بس میں بیٹھنا جیسے بھول ہی جاتا تھا۔ وہ ہر روز اسٹاپ پر کھڑے سرخ بورڈ والی بس کا انتظار کرتی اور دل ہی دل میں وہ دعا کرتی کہ اسے وہی بس ملے جسے اس کے دل کا مکین ڈرائیو کر رہا ہو۔

صبح کے وقت بہت مرتبہ اس کی خواہش پوری بھی ہو جاتی تھی۔ البتہ واپسی پر شاذ و نادر ہی اسے اپنی مطلوبہ بس مل پاتی تھی۔ عارفہ اس کے ساتھ جاتی

تھی۔ مگر اب وہ اس کے ساتھ نہ جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگی تھی۔ کیونکہ عارفہ ساتھ ہوتی اور سیون لے سے پہلے سات نمبر بس آجاتی تو اس میں سوار نہ ہونے کے لیے اسے کئی بہانے بنانا پڑتے تھے۔

ان دنوں اس نے اپنے مستقبل کی ہر سوچ کو اس ڈرائیور کے نام کر دیا تھا۔

اس روز نائلہ کو اس کی چوتھی خوبی نے متاثر کیا تھا۔ اور وہ اس کی دلداری اور بہادری تھی۔ جب ہی اس نے اسے جیمز بانڈ کا نام دے دیا تھا اور اپنے خیالوں اور خوابوں میں اسے اسی نام سے پکارنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ بعد میں اسے اس کا اصلی نام امجد خان معلوم بھی ہو گیا۔ مگر وہ اسے جیمز بانڈ ہی کہتی رہی۔

✲ ✲ ✲

جیمز بانڈ کے لیے اس کی محبت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ہر ہر لمحے میں اسی کو سوچا کرتی تھی۔ اور اس کا ساتھ پانے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ یہ بھی عجیب محبت تھی۔ کیونکہ نہ اس نے جیمز بانڈ سے کبھی کچھ کہا اور نہ ہی جیمز بانڈ نے اس سے کوئی بات کی۔ مگر پھر بھی نائلہ کے دل کو جیسے اس کے لیے اپنی محبت پر یقین تھا۔ ویسے ہی اسے اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ وہ بھی اسے چاہتا ہے۔ اس کی آنکھیں نائلہ کو دیکھ کر چمک اٹھتی تھیں۔ اور چہرے سے جیسے روشنی سی پھوٹنے لگتی تھی۔

چند ایک بار ایسا بھی ہوا کہ واپسی پر نائلہ کو اس کی بس ملی اور جیسے ہی وہ اپنے اسٹاپ پر اتر کر روڈ کراس کرنے کے لیے سڑک کے کنارے کھڑی ہوتی تو وہ بالکل سب سے نظر بچا کر نائلہ کے الوداعی انداز سے ہلکا سا ہاتھ ہلا دیتا۔ نائلہ نے جواب میں بھی کوئی ریسپانس نہیں دیا تھا۔ مگر اس کے ایسا کرنے سے اس کا دل خوشی سے بھر جاتا۔

اس آنکھ مچولی میں آٹھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور پھر ایک روز اچانک ہی وہ غائب ہو گیا۔ نائلہ کتنے ہی روز اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ تو یوں گیا تھا۔ جیسے بھی اس کی زندگی میں آیا ہی نہ ہو۔ ان دنوں وہ بالکل دیوانی سی ہوئی تھی۔ سارا دن کسی کام میں اس کا دل نہ لگتا۔

اس کا دل شدت سے آرزو کرتا کہ کہیں سے بس ایک بار جیمز بانڈ آجائے۔ وہ ہر روز اس کے لوٹ آنے کی دعائیں کرتی۔ مگر اس کی کوئی دعا قبول نہ ہوئی اور وہ دوبارہ اپنا من پسند چہرہ دیکھنے سے محروم ہی رہی' حتیٰ کہ ایک شام بہت ہمت کر کے اس نے میٹرو والوں کے آفس فون کر کے ڈرائیور امجد خان کے بارے میں پوچھ لیا۔

"آپ کون بات کر رہی ہیں؟"

اس کے پوچھنے پر دوسری طرف سے سوال کیا گیا تھا' وہ ایک لمحے کے لیے گھبرائی' پھر خود پر قابو پا کر قدرے اعتماد سے بولی۔

"میں ان کی پھوپھی کی بیٹی ہوں۔ اور ہمیں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ وہ کافی دنوں سے ہماری طرف نہیں آئے' اس لیے میں نے سوچا معلوم کر لوں۔ کہیں بیمار ہی نہ ہوں۔" یہ بہانہ اسے بروقت سوجھا تھا۔

"لیکن اسے تو ملازمت چھوڑ کر گئے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا اس نے آپ لوگوں کو بتایا نہیں؟"

دوسری طرف سے کہا گیا تھا۔ اس کے اردگرد جیسے دھماکے سے ہونے لگے کتنے ہی لمحے اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ وہ بس ریسیور تھامے ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ دوسری طرف سے چند ایک بار ہیلو ہیلو کی آوازیں آئیں' پھر شاید ریسیور رکھ دیا گیا۔ مگر وہ تب بھی یونہی بیٹھی رہی' اسے اس وقت کسی بھی چیز پر یقین نہیں رہا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے ہونے پر بھی نہیں۔

"وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟"

بہت دیر کے بعد اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اور اسے جیسے اپنی ہی آواز ہوش میں لے کر آئی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی' یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا ورنہ اس کا یوں رونا سبھی کو متوجہ کر دیتا۔

بہت دیر تک رونے کے بعد بھی اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

اگلے بے شمار دن وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر اسے کسی بھی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سب کچھ برا لگتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی۔ بہت مرتبہ اس کا دل چاہتا کہ وہ خود کو ختم کرلے۔

"آخر اس نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ اگر اسے یونہی مجھے چھوڑ کر جانا تھا تو اس نے میرے دل میں اپنی محبت کا بیج کیوں بویا؟"

وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی اور پاگلوں کی طرح خود سے سوال پر سوال کیے جاتی۔ مگر اس کے کسی سوال کا اندر سے جواب نہیں ملتا تھا۔ ہر طرف ایک گہری چپ تھی۔ ایک جامد سناٹا تھا۔ جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ اکثر مختلف لوگوں کو دیکھ کر وہ الوژنز کا شکار ہونے لگتی تھی۔ بہت سارے چہروں پر اسے امجد خان کے چہرے کا گمان ہوتا تھا۔ راستہ چلتے ہوئے اسے ہر وقت یہی لگتا تھا کہ وہ ابھی کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آجائے گا اور اپنی روشن آنکھوں میں ڈھیر سارا پیار اور نرمی بھر کر اس کی طرف دیکھے گا۔ اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا۔

"میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں؟"

مگر اس کے تمام الوژنز اور تصور ہی رہے۔ وہ شخص اسے دوبارہ نظر نہیں آیا۔ بہت مشکل سے روتے دھوتے اس نے ڈھائی سال میں ایم۔ ایس۔ سی نہایت خراب مارکس کے ساتھ مکمل کیا۔ بیچ میں وہ کئی بار بیمار ہوئی اور دو بار پیپر کرتے کرتے ادھورا چھوڑ کر اٹھ آئی۔ گھر کے سب لوگ اس کے کلاس فیلوز اور اس کی دوستیں اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے کہ اسے آخر کون سی پریشانی ہے۔ مگر اس نے زبان کھول کر نہ دی۔ ویسے بھی وہ انہیں کچھ بتانا چاہتی بھی تو کیا بتاتی۔ اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ اسے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ سننے والے اس کی خاموش محبت کو محبت مانیں گے بھی۔ اس لیے وہ ہر سوال کے جواب میں چپ ہی رہا کرتی۔

✲ ✲ ✲

اس کے لیے عدنان کا رشتہ آیا۔ تو اس نے حسب سابق صاف انکار کر دیا۔ وہ اس سے پہلے اپنے لیے آنے والے چند دوسرے رشتوں سے بھی انکار کرچکی تھی۔ مگر اس بار گھر کے تمام لوگ گویا اس کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ عدنان ان سب کو ہی بے حد پسند آیا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ نائلہ اس کے رشتے سے انکار کرے۔ سب کے شدید اصرار پر اسے ہاں کہنا پڑی۔ مگر اس کا اندر ویسے کا ویسا ہی بنجر رہا تھا۔

حتیٰ کہ منگنی کے بعد ایک سال کا عرصہ اس نے شاذ و نادر ہی عدنان سے ایک دو منٹ کی بات کی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ کامیاب ازدواجی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ اس لیے وہ شادی سے خوفزدہ بھی تھی۔ مگر جب اس کی شادی ہو گئی تو عدنان کا بے لوث پیار اور اس کی توجہ اسے پھر سے زندگی کی طرف لوٹانے لگے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور اسے ایک بار پھر رنگ، پھول اور پرندے اچھے لگنے لگے۔ وہ پھر سے ہنسنے اور بولنے لگی اور شادی کے کچھ ہی مہینوں کے بعد امجد خان سے محبت کرنے سے پہلے والی نائلہ بن گئی۔ البتہ دل کے اندر کہیں بہت گہرائی میں ایک زخم اب بھی موجود تھا۔ جس میں سے کبھی کبھی ٹیسیں اٹھتی تھیں مگر ان کا دورانیہ بہت طویل نہیں ہوتا تھا۔ اور عدنان کے ساتھ رہتے ہوئے اسے یقین ہو چلا تھا کہ ایک دن وہ زخم بھی پورے طور پر بھر جائے گا۔

مگر آج اچانک اتنے سالوں کے بعد امجد خان کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے لگا تھا کہ اس کے رفو کیے ہوئے زخم ایک بار پھر تازہ ہو گئے ہیں۔ ایک عجیب سا درد تھا۔ جس نے اسے بے حال کر دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"کچھ لوگ ہمیں بہت عزیز ہوتے ہیں۔ ہم ان کو خوش رکھنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔ مگر ہم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے کہ ان کو خوش رکھنا ہے تو ہمیں ان کی زندگی سے دور جانا ہوگا۔

بڑی تلخ بات ہے مگر سچ ہے۔"

کسی کی بہت عرصہ پہلے کہی ہوئی باتیں مسلسل اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ اور ان باتوں کو یاد کرتے ہوئے وہ بار بار کن انکھیوں سے اس کی بند آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے آنسو اسے تکلیف پہنچا رہے تھے۔ مگر یہ تکلیف اس لیے قابل برداشت لگ رہی تھی کیونکہ کچھ دیر پہلے وہ اسے اپنے خوبرو اور پیار کرنے والے شوہر کے ساتھ خوش و خرم دیکھ چکا تھا۔

اسے اپنے لیے نائلہ کے پیار پر شک نہیں تھا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ پیار اس معصوم صورت لڑکی کی خوشیوں کو نگل نہیں سکے گا۔ آخر اس کی خوشیوں کی خاطر ہی تو اس نے اپنے دل کو قربان کیا تھا۔ اپنے ان خوابوں کو پھانسی دی تھی۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں ہزاروں کی تعداد میں سج گئے تھے۔

وہ پیاری سی لڑکی اس کی زندگی میں بہار کا جھونکا بن کر داخل ہوئی تھی۔ اور ان کے بیچ لمحوں میں جیسے کوئی اٹوٹ بندھن بندھ گیا تھا۔ لیکن پھر اپنے لہو لہو ہوتے دل کی ہر فریاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے خود ہی اس بندھن کو توڑنا پڑا تھا۔ کیونکہ دل کا کیا ہے وہ تو بعض دفعہ کھیلنے کو چاند بھی مانگنے لگتا ہے۔ مگر زندگی میں سب کچھ مانگنے سے تو نہیں مل جاتا۔

✲ ✲ ✲

اس کا نام امجد خان نیازی تھا۔ پشاور کے ایک نواحی گاؤں میں اس نے آنکھ کھولی۔ اور ابھی بارہ برس کا ہی ہوا تھا۔ جب اس کی اکثر و بیشتر بیمار رہنے والی ماں چل بسی۔ اس کا کوئی اور بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ اور دادا، دادی بھی حیات نہیں تھے۔ اس لیے ماں کی وفات کے بعد وہ شدت سے تنہائی کا شکار ہو گیا۔ باپ مزدور پیشہ آدمی تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ بارہ سالہ امجد خان کو بہلا سکے۔ اس لیے امجد خان دن بدن خاموش اور گم سم ہوتا جارہا تھا۔

جب ماں کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی اس نے سنا کہ اس کا باپ دوسری شادی کررہا ہے۔ تو اس کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ بلکہ اس میں کچھ خوف کا عنصر بھی پیدا ہو گیا۔ [illegible] اور گرد رہنے والوں سے اس نے سوتیلی ماؤں کے جتنے بھی قصے سنے تھے وہ سب اتنے خوفناک تھے کہ اسے اپنا معصوم دل کہیں اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ بہت بار اس نے چاہا کہ وہ اپنے باپ کو اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ مگر عملی طور پر کچھ کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اندر کہیں اسے جیسے پہلے سے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔

اس کا باپ عمر دراز خان محض اس کے خدشات کی بدولت اتنی سخت زندگی نہیں گزار سکتا تھا، جتنی وہ اپنی بیوی کی وفات سے لے کر گزارتا آرہا تھا۔ سارا دن باہر محنت مشقت کرنے کے بعد گھر آکر سارے گھریلو کام خود کرنا اور دن بھر بیٹے اور گھر کی طرف سے فکر مند رہنا، اب اس کی برداشت سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ اس لیے اس نے بہت سادگی کے ساتھ اپنے سے پندرہ برس چھوٹی زرینہ گل سے شادی کرلی۔

جس وقت وہ اپنی دلہن کو لے کر گھر آیا۔ ساڑھے بارہ سالہ امجد خان نیازی صحن کے ایک کونے میں چولہے کے قریب بیٹھا تھا۔ اور بجھی ہوئی راکھ کو تنکے کے ساتھ کرید رہا تھا۔ اس کا لباس میلا تھا اور بال مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔

"امجد خان! اپنی ماں کو سلام کرو۔"

ان لوگوں کی آمد پر اس نے سر اٹھایا تو اس کے باپ نے کہا تھا۔ باپ کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔ جسے محسوس کرکے اس کا سہما ہوا دل کچھ اور سہم گیا، اس نے کھڑے ہو کر سجی سنوری زرینہ گل کو سلام کیا اور اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب زرینہ گل نے اس کے حلیے کی پروا کیے بغیر اسے نا صرف گلے لگایا، بلکہ بہت محبت سے اس کا ماتھا بھی چوما۔ وہ عجیب و غریب احساسات میں گھر گیا۔ اس کو زرینہ گل بے حد اچھی لگنے لگی۔ حالانکہ ابھی چند لمحے پہلے وہ اسے کسی ڈائن سے تشبیہ دے رہا تھا۔ اسے جو کچھ سوتیلی ماؤں

کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اس کی روشنی میں وہ یہی سوچ سکتا تھا کہ اس کے باپ کی دوسری بیوی گھر آتے ہی اسے اسکول سے اٹھا کر گھر کے کام کرنے پر لگا دے گی۔ اور دن رات اس کی پٹائی کیا کرے گی۔ مگر زرینہ گل کا رویہ اسے بے حد حیران کر رہا تھا۔

اس وقت اس کی حیرانی مزید بڑھ گئی، جب زرینہ گل نے گھر آنے کے کچھ دیر بعد ہی اسے دھلا ہوا شلوار سوٹ ڈھونڈ کر فراہم کیا اور نہانے کے لیے بھیج کر گھر کی صفائی ستھرائی میں جت گئی۔ اس رات بہت سارے دنوں کے بعد اس نے ایسا کھانا کھایا جسے کھا کر اسے مزا آیا تھا۔ نرم روٹیاں اور مزے دار سالن، وہ چولہے کے قریب بیٹھا کھاتا گیا۔ اور زرینہ گل محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے روٹیاں پکا پکا کر اس کے اور اس کے باپ کے آگے رکھتی گئی۔

وہ دل ہی دل میں بے حد خوش تھا۔ اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا۔ جس نے اسے زرینہ گل جیسی ماں سے نوازا تھا۔

☆ ☆ ☆

پہلے پہل برادری اور محلے میں سب کا خیال تھا کہ زرینہ زیادہ عرصے تک امجد خان کو یوں ہتھیلی کا چھالا بنا کر نہیں رکھے گی۔ بلکہ جیسے ہی اس کی اپنی اولاد ہوگی، وہ روایتی سوتیلی ماں نہ بھی بنی تو یوں امجد خان کے آگے پیچھے پھرنا اور اس کا بے تحاشا خیال رکھنا ضرور ترک کر دے گی۔ مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔

زرینہ گل نے تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کو جنم دیا، مگر امجد خان کے ساتھ اس کی محبت میں رتی بھر کمی نہیں آئی۔ اس میں اگر ایک طرف اس کی اچھی فطرت کا ہاتھ تھا تو دوسری طرف امجد خان بھی اس کا حد سے زیادہ فرماں بردار تھا۔ اس نے کبھی بھی زرینہ گل کے بتائے ہوئے کسی کام کو کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ اپنے باپ کا حکم وہ ٹال سکتا تھا مگر سوتیلی ماں کے منہ سے نکلا ہر لفظ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب وہ بیس سال کا ہوا اور تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا، تب اس کا باپ ایک ایکسیڈنٹ میں معذور ہو کر بستر پر پڑ گیا اور امجد خان کو اپنی تمام ترجیحات کو پس پشت ڈال کر گھر کی دال روٹی چلانے کے لیے نوکری کرنا پڑی۔ حالانکہ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے ماں، باپ کی تمنا تھی کہ وہ بہت سارا پڑھے اور کوئی اچھی سی نوکری کرے، اس لیے تنگدستی اور غربت کے باوجود وہ اسے کسی نہ کسی طرح پڑھائے جا رہے تھے۔ مگر اس کی قسمت میں شاید زیادہ تعلیم نہیں لکھی تھی۔ اس لیے محض بیس سال کی عمر میں ماں، باپ اور چاروں چھوٹے بھائی، بہنوں کی ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آ پڑیں۔

ابتدا میں اس نے چند چھوٹی چھوٹی نوکریاں کیں۔ مگر محض انٹر تک تعلیم حاصل کرنے والے کسی شخص کو جتنی اچھی آمدن والی نوکری مل سکتی تھی۔ ویسی ہی نوکری اسے بھی ملتی تھی۔ اور اتنی کم تنخواہ میں گھر کا خرچ چلانا ہی محال تھا، پھر وہ اپنے باپ کا علاج کہاں سے کرواتا۔ اور بھائی، بہنوں کو تعلیم کیسے دلواتا۔ اس لیے سال بھر بعد ہی اس نے نوکری چھوڑ کر ڈرائیونگ سیکھ لی۔ اور ٹرک چلانے لگا۔ یہ کام اس لحاظ سے اچھا تھا کہ جتنی زیادہ محنت کرتا اتنا ہی معاوضہ زیادہ [illegible] نوکری کی طرح کوئی بندھی تنخواہ نہیں [illegible] محنتی اور پر اعتماد تو وہ شروع ہی سے تھا۔ اس لیے بہت جلد اس کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ اور ان کے گھریلو حالات کسی قدر بہتر ہونے لگے۔ مگر زرینہ گل کو اس کی تعلیم ادھوری رہ جانے کا بہت افسوس تھا۔ جس کا ذکر وہ بہت [illegible] کیا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے ایسی بات سن کر وہ ہلکے سے مسکرا دیتا اور سکون سے کہتا۔

"میری قسمت میں جتنی تعلیم تھی۔ وہ میں نے حاصل کر لی، اب میں اپنے بھائی کو بہت سارا پڑھاؤں گا، بڑا افسر بناؤں گا۔"

سوتیلی ماں اور بھائی، بہنوں کے لیے اس کی محبت مثالی تھی۔ اور وہ انہیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز رکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ اگر زرینہ گل کا اس سے

مثالی سلوک تھا تو دوسری وجہ خود اس کی نیک فطرت تھی۔ وہ فطری طور پر ہی بہت بے لوث واقع ہوا تھا۔ اور خود سے وابستہ لوگوں کی آسانی کے لیے اپنے اوپر ہر مصیبت جھیل جانے کو تیار رہتا تھا۔

چار سال تک وہ پوری تندہی سے اپنے باپ کا علاج کرواتا رہا۔ اور اس مقصد کے لیے اپنی کمائی کا بڑا حصہ خرچ کرنے کے ساتھ اس نے کئی رشتہ داروں اور دوستوں سے قرض بھی لے لیا۔ مگر اس کا باپ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ اور چار سال معذوری کی زندگی بسر کرنے کے بعد [illegible]

باپ کی وفات نے اس کی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری میں مزید اضافہ کر دیا۔ جب تک باپ زندہ تھا۔ تمام ذمہ داریاں نبھانے کے باوجود اسے اپنے سر پر سائے کا احساس رہتا تھا۔ مگر باپ کے چلے جانے کے بعد وہ عجیب سے احساس تنہائی کا شکار ہو گیا۔

انہی دنوں اپنے باپ کے ایک کزن کی توسط سے اسے فیصل آباد میں اچھی نوکری کی پیش کش ہوئی تو وہ بہتر مستقبل کی تلاش میں فیصل آباد چلا آیا۔

☆ ☆ ☆

فیصل آباد میں نصیر خان کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ کافی حیران ہوا۔ ان کے خاندان کے زیادہ تر لوگ غریب یا پھر سفید پوش تھے۔ مگر نصیر خان اچھا خاصا امیر آدمی تھا۔ اس کے کئی ٹرانسپورٹ کمپنیوں میں شیئرز تھے۔ اور وہ ہر ماہ لاکھوں کماتا تھا۔ فیصل آباد کے ایک اچھے علاقے میں اس کا شاندار بنگلہ تھا۔ جس میں وہ اپنے کچھ نوکروں کے ساتھ اکیلا رہتا تھا۔ اور اپنا زیادہ وقت کتابیں پڑھنے میں گزارتا تھا۔

فیصل آباد آنے کے دو روز کے اندر اندر امجد خان کو میٹرو بس میں ڈرائیور کی نوکری بھی مل گئی اور چند دوسرے ڈرائیورز کے ساتھ اس کی رہائش کا انتظام بھی ہو گیا۔ وہ یہاں آ کر بہت خوش تھا۔ تنخواہ کے ساتھ اس کا ایک مخصوص کمیشن بھی مقرر تھا۔ اور اگر وہ اوور ٹائم لگا لیتا تو اس کے پیسے الگ سے ملتے۔ وہ کچھ ہی دنوں میں وہاں سیٹ ہو گیا۔ اور بہت محنت سے اپنا کام کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

فیصل آباد میں نوکری کرتے ہوئے اسے ڈھائی سال ہوئے تھے، جب اس کی زندگی میں وہ دن آیا جس نے اس کی آئندہ زندگی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

صبح وہ کسی سے بھی مخاطب ہوئے بغیر اور ناشتا تیار ہونے کے باوجود پہلی بار بغیر ناشتے کے ورکشاپ چلا آیا تھا۔ وہاں بھی اس نے کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ نہایت خاموشی سے اپنے روٹ کے لیے مخصوص بس میں جا بیٹھا تھا۔ اس کا کنڈیکٹر اور ہیلپر دونوں بار بار اس کی خاموشی کی وجہ پوچھتے رہے، مگر اس نے ان دونوں کو بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ اس کا ڈرائی پورٹ سے سبزی منڈی تک کا دوسرا چکر تھا، جب بس الائیڈ اسپتال کے پاس ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ اس کی کوفت اور بے زاری میں اضافہ ہو گیا۔ اور اس کا بے اختیار ہی دل چاہنے لگا کہ وہ بس کو یہیں روک کر نیچے اتر جائے۔ کوفت کے عالم میں وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی نظر اپنے بائیں جانب والی سیٹوں پر پڑی۔ اور اس کی پہلی ہی نظر وہاں ٹھہر کر رہ گئی۔

وہاں دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ کونے والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی سفید لباس پہنے اتنی مقدس اور خوبصورت نظر آ رہی کہ امجد کا دل اس کے چہرے سے نگاہ ہٹانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ لڑکی اپنے ساتھ موجود دوسری لڑکی کے ساتھ باتوں میں بری طرح سے مشغول تھی۔ بولنے کا انداز کم از کم امجد کو اس وقت بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے آج تک کبھی کسی لڑکی کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ ان کے اپنے گاؤں اور خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین چہرہ موجود تھا۔ اور اب وہ سفید کپڑوں والی نازک سی لڑکی جو کوئی غیر معمولی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر سے وہ اپنی نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔

اس لڑکی کا کتابی چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور نکھری رنگت جیسے اسے اسیر کیے جارہے تھے۔

چند منٹ کے بعد اس لڑکی نے کچھ الجھن بھرے انداز سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور پھر اس کی نظریں امجد خان کے چہرے پر ٹک گئیں۔ مگر امجد خان نے پھر بھی اس کے چہرے سے اپنی نظر نہیں ہٹائی۔ وہ اسے اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسے لڑکی کی ناراضی کا خوف بھی نہیں رہا تھا۔ مگر اس وقت اسے حیرت ہوئی جب اس نے اس خوبصورت لڑکی کے چہرے پر غصے یا ناراضی کی بجائے ایک نرم اور ملائم سا تاثر دیکھا، بلکہ وہ شاید مبہم سا مسکرائی بھی تھی۔ یا کم از کم امجد خان کو ایسا ہی لگا تھا۔ اس کی بے زاری اور کوفت دونوں لمحوں میں غائب ہوگئی تھیں۔ اور وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی سرشاری اور سرخوشی محسوس کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسے ٹریفک کا جام ہونا بھی اب برا نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس کچھ دیر اور ٹریفک جام میں پھنسی رہے، تاکہ وہ اس لڑکی کو کچھ دیر اور دیکھ سکے۔

☼ ☼ ☼

وہ لڑکی اسے پہلی نظر میں ہی اتنی اچھی لگی تھی کہ سیدھی دل میں اتر گئی تھی۔ مگر پھر بھی اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ آنے والے دنوں میں اس کے حواسوں پر اس طرح سے طاری ہو جائے گی "اٹھتے بیٹھتے" سوتے جاگتے غرض اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے میں اسے اس لڑکی کا خیال آتا رہتا تھا۔ جس کا نام تک وہ نہیں جانتا تھا۔ البتہ اس نے دل ہی دل میں اسے چاندنی کا نام دے دیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے چاندنی کی طرح ہی اجلی اجلی اور پاکیزہ لگتی۔

اگلے چند ہی روز میں اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ لڑکی نشاط آباد کے علاقے سے زرعی یونیورسٹی تک جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھیں اب صبح اور سہ پہر کے وقت ڈرائی پورٹ سے سبزی منڈی تک جانے والے ہر پھیرے میں اسی کو ڈھونڈا کرتی تھیں اور جس روز اسے وہ دکھائی دے جاتی۔ وہ اندر تک سرشار ہو جاتا۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا اس کے حسن کی چاندنی سے اپنے دل کی دنیا کو منور کرتا۔

اسے یہ اندازہ لگانے میں بھی دیر نہیں لگی تھی کہ صرف وہی نہیں بلکہ وہ لڑکی بھی اس کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اپنی طرف اٹھنے والی اس کی ہر نظر میں امجد خان کو اپنے لیے محبتوں کے ڈھیروں چراغ لو دیتے محسوس ہوتے تھے۔ جن کا احساس اس کے دل کو بے طرح خوش کرتا تھا۔

ان دنوں وہ خوشی اور مسرت کے ساتویں آسمان پر رہنے لگا تھا۔ ایک عجیب سی سرشاری اسے اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی تھی۔ اور اس کی آنکھیں ہمہ وقت خوبصورت خواب دیکھا کرتی تھیں۔

خواب۔ جن میں اس کی زندگی اس کی چاندنی ہر لمحہ اس کے پاس اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اور شاید ان خوابوں کی دلکشی اسے یونہی اپنے حصار میں لیے رکھتی، اگر اس رات نصیر خان جسے ٹرانسپورٹ کمپنی میں سب ہی بڑے خان جی کے نام سے بلایا کرتے تھے نے اس کو اپنے گھر پر نہ بلالیا ہوتا۔

بڑے خان جی کے شاندار بنگلے پر وہ پہلے بھی کئی بار جا چکا تھا اور بڑے خان کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ ہوتا تھا۔ کیونکہ دور کا ہی سہی وہ بہرحال ان کا رشتہ دار تھا۔ اور پھر اپنے کام سے بہت مخلص اور محنتی بھی تھا۔ اس لیے وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اس رات بھی انہوں نے سب سے پہلے اپنے ساتھ کھانا کھلایا، پھر قہوہ اور رات دس بجے اسے اپنی اسٹڈی میں لے گئے۔ امجد خان کو تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ بڑے خان جی کو اس سے ایسی کون سی خاص بات کرنی ہے۔ جو وہ اتنی رات کو اسے اسٹڈی لے کر آئے ہیں۔ اس نے اپنے طور پر کچھ اندازے بھی لگائے تھے۔ مگر اس کا لگایا ہوا ہر اندازہ اس وقت بالکل غلط ثابت ہوگیا، جب اس نے بڑے خان جی کے منہ سے چاندنی کا ذکر سنا۔ وہ اس بارے میں ایک ایک بات جانتے تھے اور امجد خان کو ان کی

معلومات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ جس ٹرانسپورٹ کمپنی میں وہ کام کرتا تھا۔ اس میں اس کے اپنے گاؤں کے کئی لڑکے بھی کام کرتے تھے۔ اور بہت دفعہ وہ ایک ہی روٹ پر چلا کرتے تھے۔ ایسے میں امجد خان کی کسی لڑکی کے لیے دلچسپی اور وہ بھی اتنی زیادہ دلچسپی کسی طور پر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی لیے اس نے بڑے خان جی کے سامنے ان کی معلومات کو جھٹلانے یا انہیں غلط ثابت کرنے کی بجائے بہت اعتماد سے اپنی محبت کا اقرار کرلیا۔ جس کو سن کر کچھ لمحوں کے لیے وہ بھی گنگ سے بیٹھے رہ گئے۔ شاید انہیں اس سے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔

"تم جانتے ہو تمہاری اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟"

بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوئے اور سپاٹ سے لہجے میں اس سے سوال کر رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"وہ مجھے ضرور ملے گی' بڑے خان جی! مجھے اس بات پر پورا یقین ہے۔ میرا دل اس کو چاہتا ہے' اسی کو مانگتا ہے۔ اور مجھے پورا اعتماد ہے کہ اس کا دل بھی یہی چاہتا ہوگا۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسا جذبہ اور آنکھوں میں ایسے اچھوتے رنگ تھے کہ بڑے خان جی ایک بار پھر چپ سے ہوگئے۔ اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی حسن کا مالک تھا۔ اور ایک ڈرائیور ہونے کے باوجود اس کے انداز و اطوار اور رکھ رکھاؤ میں ایک شائستگی تھی۔ وہ کسی بھی لڑکی کے دل پر حکومت کر سکتا تھا۔ وہ جھرجھری سی لے کر سیدھے ہوگئے۔

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ وہ لڑکی بھی تمہیں چاہتی ہے؟"

انہیں اپنا لہجہ خود ہی کھوکھلا محسوس ہوا تھا۔ امجد خان ہلکے سے مسکرا دیا۔

"محبت خود بخود محبت کو پہچان لیتی ہے بڑے خان جی! اسے کسی سے یقین دہانی کروانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

اس کی آنکھوں میں کوئی بہت نرم سا تاثر ہلکورے لے رہا تھا جس نے اس کی غلافی آنکھوں کی خوب صورتی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

"یہ لڑکا واقعی بہت خوب صورت لگتا ہے۔ کسی کو چاہنا اور چاہے جانا۔ مگر اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔ امجد خان تم نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ اور یقینی طور پر کسی اچھے گھر کی لڑکی لگتی ہے۔ میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ کیوں بھول رہے تھے کہ معاشرے میں تمہارا اور اس لڑکی کا مقام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ تم اور وہ دریا کے کناروں کی طرح ہو۔ ایک دوسرے سے بالکل الگ بالکل جدا۔ معاشرہ تمہیں کبھی آسانی سے ایک نہیں ہونے دے گا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے خان جی کا لہجہ آخر میں تلخ ہوگیا تھا۔

"وہ سب کچھ چھوڑ دے گی مجھے پتا ہے۔" امجد خان کے انداز میں اس کا فطری اعتماد تھا۔ بڑے خان جی کو بلاوجہ غصہ آنے لگا۔

"میں مانتا ہوں وہ سب کچھ چھوڑ دے گی۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا۔ وہ تمہارے ساتھ کیسے رہے گی۔ وہ جس طرز زندگی کی عادی ہے۔ جس طرح کا مسٹل لیول اور سوچ رکھتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ تمہارے طرز زندگی کے مطابق کیسے خوش رہ پائے گی۔ اور کتنا عرصہ رہ پائے گی۔"

"میں اسے وہ ساری چیزیں، ساری آسائشیں دوں گا جو وہ چھوڑ کر آئے گی۔ میں اس کے لیے سب کچھ کروں گا اسے کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔" اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ بڑے خان جی گہری سانس لے کر رہ گئے اور ایک بار پھر بہت غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"آسائشوں اور مادی چیزوں سے اتنا فرق نہیں پڑتا جتنا سوچ سے اور رہن سہن سے پڑتا ہے۔ اور جان لو کہ اس فرق کو تم کبھی نہیں مٹا پاؤ گے۔"

ان کے لہجے میں عجیب سی یاسیت اور تھکن تھی۔

امجد خان اس بار کچھ نہیں بولا خاموشی سے سر جھکائے قیمتی قالین کو گھورتا رہا مگر اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ اسے بڑے خان جی کی کسی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ بڑے خان جی کچھ دیر اداس سے دیکھتے رہے پھر کرب زدہ آواز میں پوچھنے لگے۔

"تمہارا کیا خیال ہے بیٹا! میں تم سے یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں آخر کون سی ایسی چیز ہے۔ جس نے مجھے تمہارے انتہائی ذاتی معاملے میں دخل دینے پر مجبور کر دیا تھا۔" ان کے شکستہ لہجے اور کرب زدہ آواز نے امجد خان کو ایک بار پھر ان کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں بتاتا ہوں تمہیں۔ تم میرا عکس ہو امجد خان۔ تم میں مجھے تیس سال پرانا نصیر خان نظر آرہا ہے مجھے اس عکس سے خوف آرہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جو کچھ میں نے سہا وہ تمہیں بھی سہنا پڑے۔ میں تمہیں اس غلطی سے روکنا چاہتا ہوں جسے کرکے میں نے عمر بھر کے لیے دکھ اور اداسی کو اپنا ساتھی بنا لیا ہے۔ آج تمہیں یہ سب بہت خوب صورت لگ رہا ہوگا۔ من پسند ساتھی پالینے کا تصور تمہاری روح تک کو سرشار کر رہا ہوگا مگر تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کے بعد کیا ہوگا۔"

وہ اب اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے برابر آبیٹھے تھے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہے تھے۔ امجد خان کو پہلی بار اپنا اعتماد ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا اسے بڑے خان جی کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر نظر آیا تھا۔ جس کو وہ سمجھ نہیں پایا تھا مگر جس نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔

"کیا ہوگا بڑے خان جی؟" اس نے بہت ہلکی آواز میں جیسے کسی ٹرانس میں پوچھا تھا۔

"یہ تمہیں میں بتاتا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ مگر اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ میرے ماضی میں جانا ہوگا۔ آج سے تیس برس پہلے کے نصیر خان [illegible] ہوگا۔" وہ اب کھوئے کھوئے انداز سے [illegible] طرف دیکھے کہہ رہے تھے اور ان کے لہجے میں نمی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"یہ آج سے تقریباً" اکتیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت ستائیس سال کا تھا۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے میری ہر بات مانی جاتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شکل و صورت بھی ایسی دی تھی کہ جو بھی دیکھتا تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی میرا امیج اپنے ہم عمر لڑکوں میں ہیرو کا سا بن گیا تھا۔ میں نا صرف اپنی عمر کے دیگر لڑکوں سے شکل و صورت میں ممتاز تھا بلکہ بلا کا پر اعتماد بھی تھا۔ البتہ لکھنے پڑھنے سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے بس میٹرک ہی تک تعلیم حاصل کرسکا اگرچہ میرے ابا نے مجھے پشاور شہر کے گورنمنٹ کالج میں فرسٹ ایر میں داخل بھی کروا دیا کیونکہ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ میں خوب سارا پڑھوں مگر میرا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا اس لیے فرسٹ ایر میں دوبار انگریزی میں فیل ہونے کے بعد میں نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔

البتہ میں پشاور شہر سے واپس اپنے گاؤں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ابا کو کسی طرح راضی کرکے ایک وین خریدی اور شہر میں ڈرائیونگ شروع کردی۔ ابتدا میں میں نے لوکل روٹ پر اپنی وین چلائی پھر میرے ابا کے دوست [illegible] کے مشورے پر میں نے کچھ اسکولوں کے بچوں کو پک اینڈ ڈراپ دینا شروع کردیا یہ کام میرے لیے [illegible] ثابت ہوا۔ ایک تو اس میں منافع زیادہ تھا [illegible] روٹ والی بھاگ دوڑ بھی نہیں تھی اس لیے میں [illegible] اسی کام کو ترجیح دینے لگا اور آہستہ آہستہ میرا یہ کام چل نکلا۔ میں کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ کرائے کے ایک گھر میں رہتا تھا کھانا اکثر ہوٹل سے کھایا کرتا اور اپنے مقررہ اوقات کے علاوہ وین چلانے سے گریز ہی کرتا تھا کیونکہ مجھے اپنی موج مستی زیادہ عزیز تھی۔

مجھے شہر میں رہتے کئی سال گزر چکے تھے اور میں اپنی زندگی میں بہت مگن اور خوش تھا جب میرے

ساتھ رہنے والے احمد دین کے توسط سے مجھے ایک میڈیکل کالج کی کچھ لڑکیوں کو کالج چھوڑنے اور گھر لانے کے کام کی آفر ہوئی اب تک میں مختلف اسکولوں کے بچوں کو ہی پک اینڈ ڈراپ کرتا آیا تھا۔ اس لیے اس چکر میں پڑنے سے پہلے پس و پیش میں پڑ گیا۔ کیونکہ ایک تو وہ علاقہ شہر کے مضافات میں تھا جہاں کی لڑکیوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنا تھا اور دوسرے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں یہ کام ٹھیک سے کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔ بچوں کو کنٹرول کرنا میرے حساب سے آسان تھا مگر کالج کی لڑکیوں کے بارے میں میری رائے زیادہ اچھی نہیں تھی کیونکہ میرے اب تک کے مشاہدے کے مطابق کالج کی لڑکیاں بہت شوخ و چنچل اور منہ پھٹ لگا کرتی تھیں۔ [illegible] احمد دین نے اتنا زور دیا کہ مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑی۔

ویسے بھی اس روٹ کا معاوضہ مجھے کافی اچھا مل رہا تھا اور ویسے بھی صبح سویرے اور اس کے بعد شام ڈھلے کا [illegible] دونوں اوقات میں میں فارغ ہی ہوتا تھا۔ اس لیے اس کام کو جاری رکھنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی وہ کل دس لڑکیاں تھیں جو پشاور کے مضافاتی علاقے سے کالج تک جاتی تھیں۔ اور میرے پچھلے مشاہدے کے برعکس وہ سب ہی کافی سنجیدہ اور مہذب ثابت ہوئی تھیں۔

مجھے اس روٹ پر وین چلاتے چند ماہ ہی ہوئے تھے جب ایک نئی لڑکی نے میری وین میں کالج جانا شروع کیا اور یہیں سے میری زندگی میں وہ موڑ آیا جس نے میری پوری زندگی ہی بدل دی۔ نئی آنے والی لڑکی کا نام سمیرا تھا اور وہ بلا کی خوب صورت اور شوخ و شریر لڑکی تھی۔ میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی اور پہلے اپنے بھائی کے ساتھ کالج جایا کرتی تھی۔ مگر اب اس کا بھائی بیرون ملک چلا گیا تھا اس لیے وہ میری وین میں جانے لگی۔ اس کے آجانے سے وین کا ماحول بہت حد تک تبدیل ہوگیا وہ بے تحاشا بولتی اور بات بے بات ہنسا کرتی تھی۔ چند ہی دنوں میں اس کی باقی تمام لڑکیوں سے دوستی ہوگئی۔ مجھے اگرچہ شوخ و چنچل لڑکیاں کبھی اچھی نہیں لگی تھیں مگر [illegible] وہ مجھے بھی اچھی لگنے لگی تھی۔

شاید اس کی [illegible] وجہ تو یہ تھی کہ وہ ہنسی مذاق میں بھی کبھی [illegible] سے تجاوز نہیں کرتی تھی اور دوسری [illegible] معصوم حسن تھا۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ [illegible] عمر میں میں نے اس سے پہلے کوئی اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ یا پھر مجھے کوئی اور لڑکی اتنی خوب صورت کبھی لگی نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا لباس بھی دیگر لڑکیوں کی طرح سادہ ہوتا تھا اور اس نے بھی سفید اوور آل پہنا ہوتا تھا مگر وہ پھر بھی باقی سب سے منفرد نظر آتی تھی۔ اور میں دل ہی دل میں اسے سراہا کرتا تھا۔

شاید میرا اس کو سراہنا میرے دل تک ہی محدود رہتا اگر مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی نظر نہ آجاتی ابتدا میں اس پسندیدگی کو میں نے اپنا وہم جانا کیونکہ ایک تو قدرتی طور پر ہی میں کوئی دل پھینک یا لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والا شخص نہیں تھا دوسرے مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میڈیکل کالج میں پڑھنے والی کوئی لڑکی ایک ڈرائیور کو پسند کرسکتی ہے۔ مگر آنے والے دنوں میں یہ واضح ہوگیا کہ سمیرا کی پسندیدگی میرا وہم نہیں ہے وہ واقعی مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی اور اس کی یہ دلچسپی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ وین میں وہ ایسی جگہ بیٹھتی جہاں سے وہ مجھے مسلسل دیکھتی رہے اور وہ سارا ٹائم بغیر کسی جھجک کے یہی کام کرتی تھی۔ ابتدا میں میں نے چند ایک بار سرسری نظر سے ہی اس کی جانب دیکھا مگر پھر وہ مجھے اتنی اچھی لگنے لگی کہ میرا دل بار بار اس کا چہرہ دیکھنے کو چاہتا اور میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوجاتا۔

اس کے چہرے کی دلکشی مجھے جتنی اچھی لگتی اس سے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے اپنے لیے چھلکتی محبت مجھے اپنا اسیر کرلیتی تھی۔ میں دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا اتنی شدت سے کہ مجھے بعض اوقات اپنے آپ سے خوف آنے لگا۔ میں اسے ساری دنیا کی آنکھوں سے چھپا کر اپنے دل میں رکھ لینا چاہتا تھا میرا بس چلتا تو میں دن رات اسے اپنے سامنے بٹھائے رکھتا۔

اور دوسری طرف دیکھو ایسی حال اس کا بھی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بہت دفعہ میرا دل چاہتا کہ میں اسے اپنے ساتھ کہیں گھمانے لے کر جاؤں اس کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں مگر مجھے یہ خواہش اس کے سامنے بیان کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اور زندگی یونہی اپنے راستے پر دوڑتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

رمضان کا مہینہ آیا تو کچھ عرصے بعد میڈیکل کالج کی ٹائمنگ بھی بدل گئی اب لڑکیاں سہ پہر کے وقت ہی واپس آنے لگی تھیں۔ اور میں بھی جلدی فارغ ہو جایا کرتا تھا۔ گھر سے کئی خط آچکے تھے وہ لوگ مجھے عید پر گاؤں بلا رہے تھے۔ مگر میں ایک دن کے لیے بھی سمیرا کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لیے مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

اس روز انتیسواں روزہ تھا۔ کالج سے اسی دن عید کے لیے چھٹیاں ہوئی تھیں اور شاید اسی لیے لڑکیاں شام تک کالج میں رکی رہی تھیں۔ جب میں انہیں لے کر کالج سے نکلا تو افطاری میں صرف چالیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں انہیں ٹائم پر گھر پہنچا کر خود بھی کسی ہوٹل تک پہنچنا چاہتا تھا اس لیے قدرے تیز ڈرائیو کر رہا تھا مگر میری تیز ڈرائیونگ اس وقت دھری کی دھری رہ گئی جب آدھے راستے میں ہی وین کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اتفاق سے میرے ساتھ ہیلپر بھی نہیں تھا۔ اس لیے مجھے خود ہی ٹائر تبدیل کرنا پڑا جس میں کافی ٹائم لگ گیا ساری لڑکیاں وین سے اتر کر تھوڑے سے فاصلے پر موجود درخت کے نیچے کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگیں اور میں اپنے کام میں لگ گیا۔

"بات سنیے ڈرائیور صاحب اور کتنی دیر لگے گی؟" میں اپنے کام میں پوری طرح سے مصروف تھا جب عین میرے پیچھے سے سریلی آواز ابھری میں نے بے اختیار سر گھما کر پیچھے دیکھا وہاں [illegible] کھڑی تھی اور شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے باقی سب کچھ بھول گیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اسے تکنے لگا۔ میرے اس انداز پر وہ تفاخر سے مسکرائی اور بولی۔

"میں نے پوچھا ہے اور کتنی دیر لگے گی؟" اس کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی مجھے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ البتہ اس کے سوال نے مجھے گڑبڑا دیا کیونکہ ٹائر فٹ ہونے میں ابھی کچھ دیر لگنا تھی۔

"اگر دیر ہے تو کچھ کھانے کو ہی لا دیں ہم افطار کر لیں۔" مجھے خاموش دیکھ کر وہ ایک بار پھر بولی تھی۔ میں نے اثبات سر ہلا دیا۔

"کیا لاؤں؟" جانے سے پہلے میں نے سوال کیا۔ وہ جواب دینے سے پہلے ہلکا سا مسکرائی اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"جو کچھ چاہیے وہ دکانوں پر تھوڑی ملتا ہے۔" میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے اس لیے خوب خود ہی مسکرا اٹھا۔

"ٹھیک ہے جو دکانوں سے ملتا ہے وہی لا دیتا ہوں۔" اس کے چہرے پر نظر ڈال کر میں نے نرمی سے کہا اور مزید کچھ پوچھے بغیر چل پڑا۔ تھوڑی دور ہی چند دکانیں نظر آ رہی تھیں اور مجھے یقین تھا وہاں سے مجھے کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا اور میرا یقین درست بھی ثابت ہوا چند منٹ بعد ہی میں سموسے کھجوریں اور پانی لے آیا۔

"کتنے پیسے ہوئے ڈرائیور صاحب؟" مجھ سے چیزیں پکڑتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

"[illegible] تھوڑی ملتی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور پلٹ کر وین کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک دوسری لڑکی میرے لیے افطاری کی چیزیں دے گئی۔ افطاری کا ٹائم ہو رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی سمیرا کو اپنے رب سے مانگا اور کھجور منہ میں ڈال لی۔ بعض اوقات اپنے رب سے کچھ مانگتے ہوئے ہمیں علم بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنے لیے کیا مانگا ہے۔ جنت یا جہنم... مجھے بھی تب کوئی علم نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ عید کا تیسرا دن تھا جب سمیرا اور باقی لڑکیوں کی چھٹیاں ختم ہوئیں اور وہ کالج گئیں۔ البتہ اس روز ان کے جانے کا وقت صبح صبح کی بجائے دن گیارہ بجے کا تھا۔ کیونکہ اس روز کالج میں عید ملن پارٹی تھی۔ جس میں وہ سب خوب تیار ہو کر گئیں۔ سمیرا نے اس روز گلابی رنگ کا بے حد خوب صورت لباس پہن رکھا تھا اور اس کی دونوں کلائیوں میں گلابی رنگ کی ڈھیروں کانچ کی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں اور ہاتھوں کی پشت پر مہندی کے بے حد خوب صورت نقش و نگار بنے نظر آ رہے تھے۔

میں دل ہی دل میں اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کر رہا تھا اور بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ آج خلاف معمول سر جھکائے چپ بیٹھی تھی اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ باقی لڑکیوں سے بھی کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ ہمیشہ مینا کی طرح چہکا کرتی تھی۔ لڑکیاں بار بار اس سے چپ ہونے کی وجہ پوچھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں یار، طبیعت تھوڑی خراب ہے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

وہ بہت دھیمی آواز میں بولی تھی۔ اس کی طبیعت خراب ہونے کا سن کر میں بے چین سا ہو گیا۔

"کیا زیادہ درد ہو رہا ہے۔ کب سے ہو رہا ہے؟" کوئی لڑکی بہت تشویش سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ پہلے تو ہلکا ہلکا سا ہی تھا میں نے سوچا خود ہی ٹھیک ہو جائے گا مگر اب تو بہت بڑھ گیا ہے دراصل مجھے کبھی کبھی آدھے سر کا درد ہوتا ہے۔"

"اوہ یہ تو بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پھر تم آج نہ آتیں۔" کسی اور لڑکی نے ہمدردی سے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے میں واپس چلی جاتی ہوں۔ اس طرح تو میں نہ خود پارٹی کو انجوائے کر سکوں گی اور نہ تم لوگ کر سکو گے۔" کالج کے گیٹ پر وین رک چکی تھی جب میں نے سمیرا کو کہتے سنا۔ تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد باقی لڑکیاں اس کی بات مان کر کالج کے اندر چلی گئیں اور میں نے وین واپس اس کے گھر کی طرف موڑ دی۔

"کیا بہت درد ہو رہا ہے؟" تھوڑا سا آگے آنے کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

"درد تو بہت ہو رہا ہے مگر سر میں نہیں۔" اس بار وہ پہلے سے بہت مختلف لہجے میں بولی تھی۔ میں بے اختیار ہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"پھر کہاں؟" میرے لبوں سے نکلا تھا وہ ہلکے سے مسکرائی اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے بالکل قریب والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ میرا پاؤں بے اختیار ہی بریک پر جا پڑا اور وین اس وقت تقریباً سنسان پڑی ہوئی سڑک کے کنارے رک گئی۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ مجھے کیا ہوا ہے؟" وہ بہت آس سے میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ میں گڑبڑا گیا۔

"دیکھیے آپ..." میں نے کہنا چاہا۔

"پلیز کچھ نہ کہنا کوئی نصیحت نہ کرنا۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ سچائی یہی ہے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں بے حد پیار کرتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم نہیں جانتے پچھلے چند دن جو تمہیں دیکھے بغیر گزرے وہ میں نے کیسے گزارے ہیں۔ میں تو اب ایک دن بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے مہندی سے رچے خوب صورت ہاتھوں میں پکڑ لیا تھا۔ اور میں جیسے کسی طلسم میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ میری آنکھیں اس کے چہرے سے نہ ہٹ رہی تھیں۔

"میں جانتی ہوں تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ کہہ رہی تھی اور میرا دل پوری طرح سے اس کی تائید کر رہا تھا۔ اور اسے جیسے میرے منہ سے کچھ سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ بس خود ہی کہے جا رہی تھی۔

"تو پھر کہتے کیوں نہیں ہو؟" وہ اب میرا ہاتھ اپنے

چھوڑنے سے انکاری تھی۔
"کیسے کیوں نہیں ہو گا۔ تم بھی مجھ سے پیار کرتے ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی میں مرجاؤں گی میں سچ میں مرجاؤں گی۔"

اس کے آنسو میرے ہاتھ پر گر رہے تھے میں تڑپ اٹھا بے اختیار ہی میں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔
"پلیز روو مت! میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا کیونکہ میں بھی تم سے بہت بہت محبت کرتا ہوں۔" میں نے خود کو کہتے سنا۔
"تو چلو پھر شادی کر لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔" اس کی آنکھیں یوں جگمگانے لگی تھیں جیسے اس کے دیدوں میں چھوٹے چھوٹے آئینے فٹ ہو گئے ہوں۔
"مگر کیسے؟" بے چین ہو کر میں پیچھے ہٹ گیا۔
"ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے؟" میں نے بہت آزردگی سے کہا تھا۔
"میں چھوڑ دوں گی... میں سب کو چھوڑ دوں گی تمہارے لیے میں پوری دنیا کو چھوڑ دوں گی بس مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔ اب میں ایک پل بھی تم سے جدا ہو کر نہیں رہ سکتی۔" اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر کہا تھا۔ اور میں اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو کے حصار میں جیسے قید ہو کر رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمیرا نے اپنے کہے پر پورا پورا عمل کیا اس نے اپنا گھر میرے خاطر چھوڑ دیا کیونکہ اس کے گھر والے میرے ساتھ اس کی شادی کرنا تو ایک طرف یہ ذکر بھی سننے کے روادار نہیں تھے۔ اس لیے وہ میری خاطر ان سب کو چھوڑ آئی اور ہم نے کورٹ میرج کر لی۔ میں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا اور ہم دونوں وہاں رہنے لگے۔ ان دنوں زندگی کسی خواب سے بڑھ کر حسین اور خوبصورت ہو گئی تھی۔
سمیرا میرے پاس تھی، میرے ساتھ تھی اور مجھے جیسے دونوں جہان مل گئے تھے۔ زندگی سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔ ہر چیز اچھی لگنے لگی تھی۔ میں اس کا بے حد خیال رکھتا تھا، میرے لیے وہ میری کائنات کی سب سے قیمتی چیز تھی۔ جسے میں بہت احتیاط سے بہت سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والی ہلکی سی نمی بھی میری برداشت سے باہر تھی۔ اس کو ایک اچھی زندگی دینا میرا خواب بن چکا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ جو آسائشیں وہ میری خاطر چھوڑ کر آئی ہے۔ وہ ساری کی ساری اسے فراہم کروں۔ اور اس مقصد کے لیے میں اب دن رات محنت کرنے لگا تھا۔
سمیرا کے ساتھ رہتے ہوئے ایک سال کیسے گزرا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا تھا اور یقیناً" آئندہ بھی سمجھتا رہتا اگر اس کا رویہ تبدیل نہ ہونے لگتا۔
ابتدا میں وہ مجھے اداس اداس نظر آنے لگی۔ مگر اس چیز نے مجھے پریشان اس لیے نہیں کیا کیونکہ میرے حساب سے اس کی اداسی فطری تھی۔ وہ پہلی بار ماں بننے جا رہی تھی۔ اور ایسے میں اسے اگر اپنے والدین بہن بھائی اور اپنا گھر یاد آ رہا تھا تو یہ بالکل فطری چیز تھی۔ میں نے اسے اداسی سے نکالنے کے لیے اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اور اسے خوش رکھنے کا ہر وہ جتن کرنے لگا جو میرے بس میں تھا۔ مگر اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کی اداسی دن بہ دن بڑھتی چلی گئی۔
حتیٰ کہ ایک صحت مند اور خوبصورت بیٹے کی ماں بننے کے بعد بھی اس کے چہرے پر کسی خوشی کا عکس مجھے نظر نہیں آیا۔ تب میں صحیح معنوں میں پریشان ہوا اور میں نے بہت نرمی اور دوستانہ انداز سے اس کی اداسی کا سبب جاننے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ مگر جب میرا اصرار بڑھنے لگا تو وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔
"تم ہو میری ہر پریشانی، ہر اداسی کی وجہ صرف تم ہو۔"
"میں...؟" شاک کے عالم میں میرے منہ سے

نکلا۔
"ہاں سمیرا... میں...؟" پتا نہیں کیوں میں اس لمحے خواہش کر رہا تھا کہ وہ اپنی کہی ہوئی بات کو جھٹلا دے۔ کہہ دے کہ وہ مذاق کر رہی تھی، مجھے ستا رہی تھی۔ اور میرے چہرے سے لگ کر کہے کہ اسے پوری دنیا میں سب سے بڑھ کر مجھ سے محبت ہے۔ مگر میری یہ خواہش، خواہش ہی رہی وہ پہلے سے بھی زیادہ نفرت بھرے انداز میں بولی۔
"ہاں تم ہو میری زندگی کو تباہ کرنے کے ذمہ دار تم نے مجھے برباد کر دیا۔ مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ نہیں تم نے مجھ پر کیسا جادو کیا تھا جو میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ اپنے والدین، اپنے بہن، بھائی، اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ آ گئی۔ تم جس کو کسی سے بات تک کرنی نہیں آتی، جسے کھانا تک کھانے کی تمیز نہیں ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نہ جانے کیوں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ اس ڈربے میں رہنے آ گئی۔ کیا کیا خواب نہیں دیکھے تھے میں نے ڈاکٹر بنوں گی۔ نام کماؤں گی۔ اور تم نے سب کچھ ملیامیٹ کر دیا، سب کچھ تباہ کر دیا۔"
وہ اب سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر میں بری طرح سے پریشان ہو گیا۔ اور اسے یہ بھی نہ جتا سکا کہ میرے ساتھ میرے اس ڈربے میں آنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ میں نے اسے اس کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ اور اگر اس کا کچھ برباد ہوا ہے، تو اس کے اپنے ہاتھوں، میں تو شاید کسی کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرنے کی بھی کوشش نہ کرتا، یہ تو وہ تھی جس نے اپنی جرأت سے ہر ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا تھا۔ اور اب وہ سارا الزام میرے سر پر ڈال رہی تھی۔ اور میں گنگ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔
"سمیرا! دیکھو اس طرح سے نہ روؤ پلیز چپ کر جاؤ۔"
اس کے آنسو میری کمزوری تھے، میں اسے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے چند منٹ کے بعد ہی اسے چپ کروانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بھول کر کہ ابھی کچھ لمحے پہلے اس عورت نے میرے دل میں اپنے لفظوں سے وہ گھاؤ ڈالے ہیں، جو شاید کبھی نہ بھر سکے۔

☆ ☆ ☆

میرا خیال تھا کہ سمیرا نے کسی وقتی پریشانی سے گھبرا کر مجھ سے وہ سب کچھ کہا ہے اور آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہو جائے گی، مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ آنے والے دنوں میں وہ نارمل ہونے کی بجائے پہلے سے کہیں زیادہ چڑچڑی اور بے زار رہنے لگی۔ مجھ پر اور گھر پر توجہ دینا تو ایک طرف اس نے خود اپنے آپ پر اور اپنے بیٹے پر توجہ دینا بھی بالکل چھوڑ دیا۔ ننھا شاہ میر اس کے سامنے پڑا روتا رہتا، اور وہ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔
میں رات کو تھکا ہارا گھر آتا تو مجھے پانی تک نہ پوچھتی اور اکثر اس نے کھانا بھی نہیں پکایا ہوتا تھا۔ بہت سارے دنوں تک میں اس کا یہ رویہ برداشت کرتا رہا، اس کے ساتھ بدستور محبت بھرا سلوک کرتا رہا، میری دلی خواہش تھی کہ وہ سب کچھ بھول کر پھر سے پہلے جیسی سمیرا بن جائے۔ وہ کھانا نہ پکاتی تو میں چپ چاپ جا کر ہوٹل سے کھانا لے آتا۔ بچے کو خود فیڈر بنا کر پلا دیتا، محبت سے اصرار کر کے سمیرا کو کپڑے بدلنے اور اپنا حلیہ درست کرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر جب وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا۔
میں نے بتایا ہے ناکہ میں اسے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے آنسو میری کمزوری تھے۔ اور ایسی ہی ایک رات اسے بے طرح روتے دیکھ کر میرا ضبط بالکل ختم ہو گیا، میں نے پہلی بار اسے غصے سے جھنجوڑ ڈالا۔
"آخر تم چاہتی کیا ہو۔ کیسے خوش ہو سکتی ہو تم؟" بہت چیخ کر میں نے اس سے پوچھا تھا۔
"تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھے طلاق دے دو۔ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں

رہ سکتی۔"

وہ میری طرف دیکھے بغیر بول رہی تھی۔ اور میرے گرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ صرف دو سال سات ماہ پہلے اس نے روتے ہوئے کہا تھا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی اور آج وہ کہہ رہی تھی کہ وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ بس اتنی سی ہی تھی اس کی محبت' یہ ہی تھا اس کا میرے لیے مر مٹنے کا جذبہ' صرف دو سال اور سات ماہ کی میعاد تھی' محبت کے لیے' میں کتنی ہی دیر تک ساکت بیٹھا رہا' مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کیا کروں۔ اس سے کیا کہوں اور اس سے بھی بڑھ کر خود اپنے تڑپتے ہوئے دل سے کیا کہوں' میں بغیر کچھ کہے اٹھا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

رات کا باقی حصہ میں نے سڑکوں پر پھرتے اور خود پر ترس کھاتے گزارا۔ میں خود کو ایک ایسا شخص محسوس کر رہا تھا جس کا سارے کا سارا اثاثہ لٹ چکا ہو۔ اور جس کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ بچا ہو۔ اس رات میں نے شدت سے خواہش کی کہ کاش میں نے سمیرا سے شادی نہ کی ہوتی۔ اس سے محبت بے شک کر لیتا' مگر شادی نہ کرتا اور چپ چاپ اس کی زندگی سے نکل جاتا۔

پھر کم از کم میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت تو نہ دیکھتا۔ نارسائی کا دکھ بے شک ساری عمر رہتا' مگر اپنے وجود اور اپنی محبت کی توہین اس ہستی سے تو نہ کرواتا' جو مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر عزیز تھی۔ حتیٰ کہ اپنے آپ اور اپنے سکون سے بھی۔ میں اب بھی اسے چھوڑنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنے لیے اپنی محبت کے لیے' اس کی نفرت دیکھ لینے کے باوجود میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ خواہ وہ مجھ سے کتنا ہی توہین آمیز سلوک کیوں نہ کرتی۔

صبح کے آٹھ بجے تھے' جب میں دوبارہ گھر آیا۔ سمیرا جاگ رہی تھی اور بستر پر بیٹھی نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرے اندر داخل ہونے پر اس نے ایک حقارت کی نظر مجھ پر ڈالی' مگر کچھ بولی نہیں' حالانکہ میرا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہے' بے شک کوئی معذرت نہ کرے' کوئی محبت بھرا جملہ نہ بولے' مگر کچھ تو کہے' مگر اس نے کچھ نہیں کہا' تو میں بھی چپ چاپ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس لیے کوشش کے باوجود مجھے نیند نہیں آئی' تو میں آدھے گھنٹے بعد اٹھ بیٹھا۔ وہ ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور ایک بار پھر گھر سے باہر نکل آیا۔ شہر کی سڑکیں ایک بار پھر میری منتظر تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تم سے کہا تھا مجھے چھوڑ دو' میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔" دو روز کی خاموشی کے بعد وہ اس رات ایک بار پھر بہت تنفر بھرے انداز سے کہہ رہی تھی۔

میں نے اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا' جس کے نقوش اس وقت غصے اور نفرت کی وجہ سے بگڑے ہوئے تھے اور اس نفرت کو دیکھ کر میرا دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبنے لگا' میں چاہنے کے باوجود کچھ نہیں بول سکا۔

"میں تم سے بات کر رہی ہوں۔" مجھے خاموش دیکھ کر وہ چلائی تھی۔

"اگر تم نے مجھے طلاق نہ دی تو میں خودکشی کر لوں گی۔" وہ کہہ رہی تھی' مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی' میں بے حد [illegible]

"تم ایسا کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ۔ تمہیں تو مجھ سے بہت محبت تھی۔"

[illegible] اس کا آنچل پکڑ کر میں نے بہت ملائمت سے اس سے پوچھا تھا۔ مگر وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

"وہ بھول تھی میری' اللہ کے لیے میری وہ خطا بخش دو۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ میں تو تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھے اپنی دنیا میں واپس جانا ہے' اپنے لوگوں میں رہنا

ہے' اور وہ سب مجھے تبھی دوبارہ قبول کریں گے جب میں تم سے پیچھا چھڑا لوں گی۔ اس لیے تم مجھے طلاق دے دو۔ ورنہ میں خود بھی مر جاؤں گی اور تمہارے بیٹے کو بھی مار دوں گی۔"

اس نے بہت جارحانہ انداز سے سوئے ہوئے شاہ میر کو دیکھا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ چند ماہ کا بچہ میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ مجھے بہت پیارا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھے اس بچے سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ میری آنکھوں میں بے اختیار ہی اپنی بے بسی پر آنسو آگئے' یہ زندگی کا کیسا موڑ تھا۔ میں اس عورت سے روح کی حد تک محبت کرتا تھا۔

وہ میرے نکاح میں تھی' میری دسترس میں تھی' مگر میں کچھ بھی کر کے اسے جانے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ایسی کوئی کوشش کرتا تو وہ سچ مچ اپنی جان دے دیتی' اور ایسا میں کسی بھی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اسے ہر لمحے خوش دیکھنا چاہتا تھا' پھر بھلا اسے حرام موت کیسے مرنے دیتا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔ اور وہ چند لمحوں میں میری بیوی سے پرائی عورت بن گئی۔

اسے طلاق دیتے ہوئے مجھے بے حد اذیت ہوئی تھی' مگر اس سے کئی گنا زیادہ تکلیف مجھے اس وقت پہنچی' جب میں نے اس کے چہرے پر پھیلتی طمانیت دیکھی۔ اور میں بالکل ہی ڈھے گیا۔ اور بے جان انداز سے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی ضروری چیزیں سمیٹیں' اور شاہ میر کو گود میں اٹھا لیا۔ اسے اٹھاتے ہوئے اس نے پہلی بار قدرے خوفزدہ انداز سے میری طرف دیکھا تھا' میں اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے خوف نے مجھے تکلیف پہنچائی تھی۔ میں نے کہا نا' میں اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اسے کوئی معمولی سی اذیت پہنچتے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر شاہ میر کو اس سے لے لیا۔

"تم اسے لے جا سکتی ہو۔" اپنے بیٹے کی پیشانی پر آخری بوسہ ثبت کر کے میں نے اسے سمیرا کی گود میں ڈال دیا۔ اور وہ اسے لے کر چلی گئی۔ ان کے جانے کے بعد مجھے [illegible] ٹھہر گیا' اور میں بھی باہر نکل گیا۔

اگلے دو دن میں میں نے اپنا تمام اثاثہ فروخت کیا۔ اور [illegible] رقم بچی' وہ لے کر گاؤں چلا گیا۔ میں اب اس شہر میں نہیں رہ سکتا تھا' جس نے مجھے زندگی کی ساری خوشیاں دے کر بے دردی سے چھین لی تھیں۔

اگلے تین سال میں نے گاؤں میں گزارے۔ اور وہ میری زندگی کے بے حد اذیت ناک سال تھے۔ سمیرا اور شاہ میر مجھے دن رات یاد آتے۔ اور زندگی مجھے ایک بوجھ لگنے لگتی۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ بعض اوقات میری دماغی حالت ایسی ہو جاتی کہ میں سنجیدگی سے خودکشی کرنے پر غور کرنے لگتا۔ اور شاید میں ایسا کر بھی گزرتا' اگر کتابیں میری دوست نہ بن جاتیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کتابوں سے میری وابستگی بڑھتی گئی اور میں علم کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں نے اپنی آبائی زمین اور گھر فروخت کر دیا اور ساری رقم لے کر فیصل آباد چلا آیا۔ ابتدا میں میں نے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں اپنی رقم انویسٹ کی۔ اور کمپنی کے کچھ شیئرز خرید لیے۔ شاید دولت میرے مقدر میں تھی۔ اس لیے مجھے پہلے سال ہی خطیر منافع ہوا۔ بعد میں بھی میں نے جتنے کاموں میں ہاتھ ڈالا' مجھے ہر جگہ فائدہ ہی ہوا۔ کبھی کوئی بڑا مالی نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔

بعض اوقات مجھے اپنی قسمت پر ہنسی آتی ہے۔ سمیرا مجھے دو ہی چیزوں کی وجہ سے چھوڑ کر گئی تھی۔ علم اور دولت' تب یہ دونوں چیزیں میرے پاس نہیں تھیں۔ اور جب وہ چلی گئی تو یہ دونوں ہی چیزیں مجھ پر مہربان ہو گئیں۔ آج بظاہر میرے پاس بہت کچھ ہے۔ مگر مجھ سے پوچھو تو میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ دنیا کا سب سے ناکام اور مایوس انسان ہوں۔ میں نے جس لڑکی کو ساری دنیا سے بڑھ کر چاہا' وہ مجھے چھوڑ کر چلی

گئی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو میں نے اس رات کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ دونوں اب کہاں ہیں کئی بار — میں نے پتا چلانے کا سوچا مگر پھر میری ہمت دم توڑ گئی۔

میں آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی سمیرا کے چہرے پر اپنے لیے دیکھی ہوئی نفرت بھول نہیں پایا۔ اور میرے دل میں یہی خوف ہے کہ ایسا نہ ہو میں دوبارہ کبھی اس کے روبرو جاؤں اور مجھے ایک بار پھر وہی نفرت دیکھنا پڑے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب دوبارہ اس نفرت کو میں سہہ نہیں پاؤں گا۔ اس لیے یونہی تن تنہا اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ اور ایک روز یونہی مر جاؤں گا' ایک بار کہیں پڑھا تھا۔

"من کا ملے تو اچھا اور نہ ملے تو... اور بھی اچھا۔"

میری زندگی پر یہ بات بالکل صادق آتی ہے۔ میں نے سمیرا سے ٹوٹ کر محبت کی۔ اپنے لیے اس کی محبت بھی دیکھی۔ اگر میں یہیں تک قناعت کر لیتا تو بہت اچھا رہتا مگر میں نے محبوب کو پانے کی کوشش کی۔ اور اپنی اور اس کی زندگی کے فرق کو بھول گیا۔ سمیرا کی نفرت کا بہت سالوں بعد تجزیہ کیا تو وہ مجھے حق بجانب نظر آئی۔ اس نے بھی فطرت سے جنگ کی تھی۔ اور نتیجے میں اذیت جھیلی تھی۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو پانے کی ضد نہ کرتے تو بے شک کچھ عرصہ تکلیف میں گزارتے مگر بعد میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا اور ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھی باقی رہتی' ایسی محبت جس میں اذیت اور درد کا کوئی پہلو نہ ہوتا مگر اب... اب تو درد کے بغیر نہ مجھے اس کا خیال آتا ہے اور نہ ہی اسے آتا ہوگا۔ صرف دو سال اور سات ماہ کا عرصہ ساتھ گزارنے کا خراج ہمیں پوری زندگی کی اذیت کی صورت ادا کرنا پڑا ہے۔

محبت صرف ساتھ رہنے کا نام تھوڑی ہے۔ یہ تو بس محبت ہوتی ہے کسی سے بے لوث اور بے [illegible] ہونا چاہیے۔ دل کی دنیا کو منور کرنا چاہیے۔ [illegible] چاہئیں۔ اگر محبت کی دنیا میں خود غرضی کی آندھی چل پڑے تو وہاں کچھ نہیں بچتا' ہر طرف تباہی ہی تباہی پھیل جاتی ہے۔"

بڑے خان جی اب خاموش ہو چکے تھے۔ امجد خان جھرجھری سی لے کر سیدھا ہوا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"مگر بڑے خان جی! جس سے اتنی محبت ہو اس سے دور جا کر رہنا کس طرح ممکن ہے' مجھے تو لگتا ہے کہ میں اگر اس سے دور چلا گیا تو میرا سانس رک جائے گا۔"

"نہیں رکے گا بیٹا! نہیں رکے گا۔ دور جانے سے سانس نہیں رکتا۔ ہاں اپنی محبت کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھ کر ضرور رک سکتا ہے۔ میں نے یہ اذیت جھیلی ہے اور میں اسی لیے تمہیں اس سے بچانا چاہتا ہوں۔ آگے تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تمہیں اس سے الگ رہ کر اس کے دل میں اپنی محبت آباد رکھنی ہے یا قریب رہ کر اس محبت کو نفرت میں بدلتے دیکھنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کوئی کائناتی سچائی ہے۔ ہو سکتا ہے جو میرے ساتھ ہوا وہ تمہارے ساتھ نہ ہو' وہ لڑکی سمیرا سے بالکل مختلف ثابت ہو [illegible] رسک تو بہرحال ہے نا۔

اور یہ بات بھی طے ہے کہ اگر وہ لڑکی [illegible] کر کے ساری عمر تمہارے ساتھ [illegible] سے خوش بہرحال نہیں ہوگی۔ [illegible] طرز زندگی ہی نہیں اپنے ماں [illegible] بھائی سب کو چھوڑنا ہوگا۔ اور اس [illegible] انسان زیادہ دنوں تک برداشت نہیں [illegible] پھر وہ تمہارے سامنے نہ بھی روئے [illegible] ضرور نا۔ اور جن سے محبت ہو [illegible] روتے ہوئے دیکھنے سے بڑی سزا اور کوئی [illegible] ہے۔"

"لیکن بڑے خان جی! ہو سکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے' اس کے گھر والے مان جائیں۔" امجد خان ابھی بھی امید کا سرا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بڑے خان جی پھیکے سے انداز سے مسکرا دیے۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا امجد خان! تم خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہو۔ اس کھیل میں اذیت ہی اذیت ہے۔ میری بات مان لو اسے کھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ نا صرف تمہیں بلکہ اس لڑکی کو بھی بہت کچھ سہنا ہوگا۔ بہت تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اس سے واقعی محبت کرتے ہو اور اس کی خوشی چاہتے ہو تو اسے فطری زندگی گزارنے دو۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے' بیٹے نفرت کو نہ بھر سکے تو اور بات باقی زخموں کو بھر ہی دیتا ہے۔"

بڑے خان جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا تھا اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ ان کے گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر تاریک رات پھیلی ہوئی تھی۔ جو اسے اپنے مقدر کی طرح سیاہ لگ رہی تھی۔ وہ اس وقت شدید [illegible] کا شکار تھا۔ اس لیے رات کے سینے پر سجے چاند ستاروں کو نہیں دیکھ پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پوری طرح جاگتا رہا اور ورکشاپ کے ایک کونے میں بیٹھا بڑے خان جی کی باتوں کو سوچتا رہا۔ اسے ان کی باتیں ٹھیک لگ رہی تھیں۔ اور اسے اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ وہ مر کر بھی اپنی چاندنی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ نہ ہی اپنے لیے اس کی چاہت کو ختم ہوتے برداشت کر سکتا ہے۔

مگر دوسری طرف یوں چپ چاپ اس کی زندگی سے نکل جانا بھی اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ صبح تک وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ اور ساڑھے پانچ بجے تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ یہ اس کا بس لے کر نکلنے کا ٹائم تھا۔ وہ آج ساری رات گھر نہیں گیا تھا۔ اور اس وقت بھی اس کا جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے اپنے کنڈیکٹر اور ہیلپر کے آتے ہی بس لے کر نکل کھڑا ہوا۔ اس کی الجھن ابھی تک برقرار تھی۔

"بس میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے' میں اسے بہت خوش رکھوں گا بہت پیار دوں گا۔ وہ کبھی اداس نہیں ہوگی۔"

نشاط آباد تک پہنچتے پہنچتے وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن اپنے فیصلے پر وہ عمل نہیں کر سکا کیونکہ اسٹاپ سے کچھ پیچھے ہی اسے چاندنی وہاں کھڑی نظر آگئی۔ اور اس کا پاؤں بے اختیار بریک پر پڑ گیا۔

"[illegible] اسے گھر تک لے جانا مجھے بہت ضروری [illegible]"

[illegible] گیٹ پر کھڑے دوسری بس کے ڈرائیور کو مخاطب کر کے اس نے کہا اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ دور سے اس نے چاندنی کی آخری جھلک دیکھی اور پلٹ کر دائیں طرف والی سڑک پر مڑ گیا۔

"میں اپنی چاندنی کو روتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں اسے کبھی کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے پہلی بار مضبوطی سے سوچا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بڑے خان جی کے سامنے موجود تھا۔

"مجھے کسی اور شہر میں بھجوا دیں۔ بڑے خان جی! میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔" اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور خوبصورت چہرے پر حزن ہی حزن تھا۔

"میرا خیال ہے تم ایک ماہ گاؤں رہ لو۔ پھر میں تمہیں اپنی کسی دوسری کمپنی میں بھجوا دوں گا۔"

انہوں نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"اور اس بات کا یقین رکھنا کہ تم نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ جلد یا بدیر تمہیں اپنی چاندنی کا کوئی نہ کوئی نعم البدل ضرور ملے گا۔ اور نعم البدل بہت اچھا نہ ہو تب بھی دکھ کو بھلانے میں مددگار ہوتا ہے۔"

اسے بڑے خان جی کی آخری بات سے اتفاق نہیں تھا مگر اس وقت اس کا کچھ کہنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا' اس لیے صرف اثبات میں سر ہلا کر انہیں اللہ حافظ کہہ کے وہاں سے آگیا' تب تک اسے نہیں معلوم تھا کہ تقدیر اس کے لیے ایک نعم البدل کا بندوبست کر چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

گھر کا دروازہ بے تحاشا گوری رنگت اور سنہری بالوں

والی جس لڑکی نے کھولا وہ اس کے لیے اجنبی تھی۔ مگر دوا سے دیکھتے ہی خوشی سے چلا اٹھی۔

"آپ..." پھر اس نے اندر کی طرف منہ کر کے پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز سے چلا کر کہا۔

"خالہ... امجد خان آ گئے۔" اس کے انداز میں اتنا جوش تھا کہ وہ پریشان ہو کر رہ گیا۔ چند ہی لمحوں میں ماں دروازے... پر آ گئی۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ بھی بے تحاشا خوش ہوئی۔

"یہ پلوشہ ہے۔ میری بڑی آپا کی بیٹی، میں نے تمہیں اس کے بارے میں لکھا تھا خط میں۔" اسے اندر لاتے ہوئے ماں نے برابر چلتی پلوشہ کا تعارف کروایا تو اسے بھی یاد آ گیا کہ چند ماہ پہلے ماں نے خط میں اس کا ذکر کیا تھا۔ وہ ماں کی بھانجی تھی۔ جس کے ماں، باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اس کی بھابھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ اس لیے ماں اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

امجد خان نے سرسری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ بلاشبہ بہت خوبصورت تھی۔ شفاف، بے داغ، گوری رنگت، لمبے سنہری بال اور چمکتی ہوئی آنکھیں، جن میں اس وقت شوق ہی شوق نظر آ رہا تھا، اس نے بے اختیار ہی پلوشہ سے نظریں چرا لی تھیں۔

"اگر آپ نے نہانا ہے تو میں پانی گرم کر دوں؟" وہ اب اگلا سوال کر رہی تھی۔ امجد خان کو لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت باتونی لڑکی ہے۔

"ارے پگلی! ابھی تو وہ آیا ہے، اسے کچھ دیر آرام کرنے دے، جب اٹھے گا تو نہا بھی لے گا۔" ماں نے ہنس کر پلوشہ کو ٹوکا اور اسے آرام کرنے کی تلقین کر کے پلوشہ کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی، امجد خان نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس وقت وہ واقعی تنہائی چاہتا تھا۔ اس نے جوتا اتار کر چارپائی کے نیچے رکھا اور سر تکیے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

"پتا ہے میں نے خالہ کے پاس آپ کی تصویر دیکھی تھی، اسی لیے تو فوراً آپ کو پہچان لیا۔ ورنہ تو کبھی آپ ہمارے گھر آئے اور نہ ہی میں اب سے پہلے کبھی آئی اصل میں اماں اچھا نہیں سمجھتی تھی لڑکیوں کا رشتہ داروں کے گھر جا کر رہنا۔ یہ تو اب مجبوری بن گئی تو یہاں آ کر رہنا پڑا۔ ورنہ بھابھی تو شاید مجھے کسی روز جان سے ہی مار دیتی۔"

مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھا تھا اور اب نیم گرم پانی سے غسل کر کے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ وہ کسی جن کی طرح اس کے سامنے نمودار ہوئی اور اب مسلسل بولے جا رہی تھی۔

امجد خان کو اب اس کا زیادہ بولنا برا نہیں لگ رہا تھا، بلکہ اب تو اسے اس لڑکی کی بے فکری پہ رشک آ رہا تھا۔

"کاش میں بھی اس کی طرح سوچوں سے آزاد ہوتا۔" اس کے دل سے ہوک سی اٹھی تھی۔

"تم سارا دن کیا کرتی ہو پلوشہ؟" اپنی سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر اس نے پلوشہ سے سوال کر دیا۔

"کرنا کیا ہے جی! بس تھوڑا بہت گھر کا کام کرتی ہوں یا پھر سلائی کڑھائی کرتی رہتی ہوں۔ پتا ہے... اپنا سوٹ آج کل کڑھائی پر لگایا ہوا ہے۔ خالہ... سے چھپوا کر دیا تھا۔ اتنا خوبصورت... بس... وہ ساتھ والوں کی زرمینہ... کی بات ادھوری رہ گئی، باہر سے ماں... زور زور سے آوازیں دے رہی تھی، اسے... باہر جانا پڑا۔

"کیا ہے خالہ... امجد خان کے ساتھ باتیں کرنے... اس لیے خالہ کے یوں بلانے پر بے مزہ... اور اٹھ کر باہر چل دی۔

☼ ☼ ☼

گاؤں میں اس کے کرنے کے لیے کچھ خاصا کام نہیں تھا۔ اس کے کوئی ایسے دوست بھی نہیں تھے جن کے پاس وہ جا کے بیٹھا رہتا، اس لیے اس کا زیادہ وقت گھر ہی گزرتا تھا۔ بڑے خان جی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ شہر سے کچھ کتابیں خرید کر لایا تھا مگر ان میں اس کا زیادہ دل نہیں لگا۔ البتہ عبادت کرنے میں اسے مزہ آنے لگا تھا۔

پہلے وہ نماز بھی پابندی سے نہیں پڑھا کرتا تھا۔ اور اب فرض نمازوں کے ساتھ نفلی عبادات بھی کرنے لگا تھا۔ گھر میں سب ہی اس کا بے حد خیال رکھتے تھے، خاص طور پر پلوشہ تو ہمہ وقت اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ وہ کسی اور سے بھی کوئی کام کہتا تو وہ جھٹ پٹ خود کرنے کھڑی ہو جاتی۔

امجد خان کو اس کی معصومیت اور اس کا خلوص اچھا لگتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ پلوشہ بھی اس کی چاندنی کا نعم البدل بھی ہو سکتی ہے۔ اگر اس سے پوچھا جاتا تو اس کے لیے کوئی بھی لڑکی چاندنی کا نعم البدل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی چاندنی تو بس ایک ہی تھی۔ اس جیسا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

چاندنی کی یادوں میں کھوئے ہوئے اسے کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ اٹھارہ سالہ خوبصورت اور شوخ و چنچل پلوشہ اسے دل دے بیٹھی ہے۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ امجد خان سے ملنے سے بھی پہلے صرف اس کی تصویر دیکھ کر اور اس کے بارے میں خالہ سے سن سن کر ہی وہ اس کو چاہنے لگی تھی اور اب جو وہ ایک مہینہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہا تھا تو اس چاہت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت دفعہ اس کا دل چاہتا کہ امجد خان بھی اپنی آنکھوں میں اس کے لیے ویسا ہی پیار لے کر اسے دیکھے، جیسا وہ اس کے لیے اپنے دل میں چھپائے پھر رہی تھی۔

مگر اسے کبھی اپنے محبوب کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ یا پھر عبادت میں مصروف رہتا تھا۔ البتہ جب بھی پلوشہ فرصت کے اوقات میں اس کے قریب بیٹھ کر اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتی تو وہ بہت خاموشی اور دھیان سے اس کی باتیں سنتا تھا۔ تب وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگتا۔ اور جو کبھی وہ اس کی کسی بات پر مسکرا دیتا تو پلوشہ اندر تک سرشار ہو جایا کرتی تھی۔

اس کی نیک صحبت میں وہ بھی پابندی سے نماز پڑھنے لگی تھی اور نماز کے بعد جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی، اس کا وجود اپنے پروردگار کے سامنے خود بہ خود ہی امجد خان کا سوال بن جایا کرتا تھا۔ اور اللہ تو بے نیاز ہے، جب اور جسے چاہے کسی کی خالی جھولی کو اس کی مراد سے بھر دے۔

☼ ☼ ☼

"جناب! عید کا چاند نکلے پورے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ آپ ابھی تک کون سی دعائیں مانگے جا رہے ہیں۔ خالہ آپ کو بلا رہی ہیں۔"

چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے وہ آسمان پر نظریں جمائے کب سے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ آج اسے چاندنی بے حساب یاد آ رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اسی چاند کو دیکھ کر اس نے بھی دعائیں مانگی ہوں گی۔ خود اس نے جتنی بھی دعائیں مانگی تھیں، سب کی سب چاندنی کے سکھ اور خوشی کے لیے مانگی تھیں۔ ان دنوں اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ خوش بھی ہو گی یا نہیں۔ کہیں وہ اداس نہ ہو اور اس کی اداسی کا خیال ہی امجد خان کو بے کل کر دیا کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنی اسی بے کلی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا، جب اپنے پیچھے سے ابھرنے والی پلوشہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر پلوشہ کی طرف دیکھا، جس کا روشن چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

"میں بس نیچے آ ہی رہا تھا۔" وہ دھیمی آواز میں بولا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ویسے ایک بات پوچھوں۔" اس کے برابر چلتی پلوشہ نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"پوچھو!" وہ ہمیشہ والی نرمی سے بولا۔

"کیا واقعی یہ سچ ہے کہ عید کے چاند کو دیکھ کر جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔" سب سے اوپر والی سیڑھی پر رک کر وہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں سنا تو ایسا ہی ہے۔" وہ بھی رک کر بے خیالی سے بولا تھا۔

"تب پھر میں۔" پلوشہ جھجک کر ایک لمحے کو رکی، پھر ایک نظر آسمان پر ڈال کر دوسری اس کے چہرے پر جماتے ہوئے بولی۔

"اگر میں آپ کو مانگ لوں تو آپ مجھے مل جائیں گے۔"

اس کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ امجد خان ہکا بکا رہ گیا۔

"پلوشہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" بمشکل اس کے منہ سے نکلا تھا، مگر وہ جواب دینے کی بجائے دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی، جبکہ امجد خان کتنی ہی دیر تک ساکت وصامت سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا رہا۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اگلی صبح وہ عید کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوا ہی تھا جب وہ نہ جانے کس کونے سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ گہرے سرخ رنگ کے خوبصورت کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس دونوں کلائیوں میں بھر بھر کر کانچ کی سرخ چوڑیاں اور کانوں میں سرخ آویزے پہنے وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ چند لمحوں کے لیے وہ واقعی مبہوت سا ہو گیا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے دل سے تعریف کی تھی۔ وہ اس کی رات کی کہی ہوئی بات کو دانستہ بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ دیکھیں میں نے مہندی بھی لگائی ہے۔" وہ اب اسے اپنی مہندی سے رچی گلابی ہتھیلیاں دکھا رہی تھی۔

"یہ بھی بہت اچھی ہے۔" اس نے اندر کی جانب قدم بڑھائے تھے۔

"بھاگے کہاں جا رہے ہیں۔ کم از کم عیدی تو دے دیں۔" پلوشہ نے اس کا راستہ روکا تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرایا اور جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کی مہندی سے رچی ہتھیلی پر رکھ دیا، پلوشہ نے نوٹ کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ امجد خان نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، کچی عمر کی لڑکی کی آنکھوں میں محبتوں کے لاتعداد چراغ روشن تھے۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا، اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے نرم ہاتھوں سے چھڑا لیا اور تیزی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

"یہ لڑکی کس راستے پر چل پڑی ہے۔ اسے کیسے سمجھاؤں کہ اس راستے میں بڑے دکھ ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں ہیں۔ میں بھلا اس کا ہاتھ کیسے پکڑ سکتا ہوں۔ میرے تو دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ میں چاندنی کو چھوڑ آیا ہوں، اسے دکھی کر آیا ہوں تو اب بھلا خود کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔"

کمرے میں آکر بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ اور اسی وقت وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اگلے ہی دن سب کے روکنے کے باوجود پلوشہ کی معصوم التجاؤں کو نظر انداز کرتا ہوا وہ وہاں سے چلا آیا۔

بڑے خان جی سے اس نے فون پر بات کر لی تھی اور انہوں نے اسے ایک دوسری ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازمت دلوا دی تھی۔ یہ ملازمت پہلی والی سے زیادہ اچھی تھی۔ اسے اسلام آباد سے فیصل آباد اور فیصل آباد سے اسلام آباد تک اے سی کوچ چلانا تھی۔ رہائش اس کو اسلام آباد میں رکھنا تھی۔

اس نے بے دلی سے ملازمت شروع کی مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا دل لگنے لگا۔ وہ محنت سے اپنا کام کرنے کا قائل تھا۔ اس لیے بہت جلد وہاں سب لوگ اس کی عزت کرنے لگے تھے۔ اگرچہ وہ کسی سے بھی زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اپنا کام پورا کرنے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت عبادت یا پھر مختلف کتابیں پڑھنے میں گزرتا تھا۔

ان چند سالوں میں وہ بمشکل دو تین بار ہی گاؤں گیا تھا اور وہ بھی بہت تھوڑے دنوں کے لیے۔ اس کے گاؤں نہ جانے کا سبب پلوشہ تھی۔ جو آج بھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اس کے سوا کسی اور سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ خود امجد

خان کی ماں نے بھی کئی بار اسے پلوشہ سے شادی کر لینے کا کہا تھا، مگر وہ اس نہج پر سوچتا ہی نہیں تھا۔ اور اگر کبھی سوچنے کی کوشش کرتا تو نہ جانے کہاں سے چاندنی نکل کر سامنے آجاتی اور آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگتی۔ امجد خان اس کے آنسوؤں سے گھبرا جایا کرتا تھا۔ اور پلوشہ کی طرف سے دانستہ دھیان ہٹا لیتا تھا۔ بہت دفعہ اس کا دل چاہا کہ وہ بڑے خان جی کو کہہ کر چاندنی کا پتا کروائے کہ وہ کیسی ہے۔ خوش ہے یا نہیں۔ مگر ہر بار بڑے خان جی سے بات کرنے سے بھی پہلے اس کی ہمت ٹوٹ جاتی۔

"اگر وہ خوش نہ ہوئی تو پھر... میں کیسے ایسی خبر کو برداشت کروں گا..." وہ گھبرا کر سوچا کرتا تھا۔

اور آج اتنے سالوں کے بعد وہ اسے نظر آئی تھی۔ تو اس کے دل سے جیسے کوئی پھانس نکل گئی تھی۔ آج اس نے اپنی چاندنی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے مگر وہ جانتا تھا کہ یہ آنسو وقتی دکھ کے باعث ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ اسے اپنے شوہر کے ساتھ نہایت خوش و خرم دیکھ چکا تھا۔ اور اس کے چہرے کی تازگی اور آنکھوں کی چمک گواہ تھی کہ وہ بہت مطمئن اور خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔ امجد خان کے لیے اس سے بڑی طمانیت کوئی نہیں تھی کہ اس کی چاندنی خوش ہے۔

اس نے ذرا سی گردن موڑ کر چاندنی کی طرف دیکھا۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ البتہ ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

✡ ✡ ✡

"آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" بس خالی ہو چکی تھی اور وہ نیچے اترنے سے پہلے اس کے قریب کھڑی سوال کر رہی تھی۔ امجد خان جانتا تھا، وہ اس سے یہ بات ضرور کرے گی، اس لیے دانستہ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ چاندنی کا سوال سن کر اس نے بے حد نرم نگاہ

اس کے خوبصورت چہرے پر ڈالی اور بہت ملائمت سے بولا۔

"اس لیے کہ میں آپ کو وہ زندگی کبھی نہیں دے سکتا تھا جس کی آپ عادی تھیں۔ میں آپ کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ آپ ہمیشہ بہت خوش رہیں۔ اور میرے اللہ کا بہت احسان ہے کہ آپ اپنی زندگی میں خوش ہیں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور نائلہ گنگ کھڑی اس بس ڈرائیور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے بے تحاشا حیرت ہو رہی تھی کہ جن چیزوں کو اس نے اتنے سالوں بعد سمجھا وہ امجد خان نے اس وقت کیسے سمجھ لی تھیں۔ جن کی طرف اس نے کبھی دھیان نہیں کیا تھا۔

"اگر میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی کوشش کرتا تو آپ کو بہت کچھ چھوڑنا پڑتا۔ زندگی کی آسائشیں تو شاید میں آپ کو کبھی نہ کبھی فراہم کر ہی دیتا مگر جو رشتے آپ سے چھوٹ جاتے وہ اور ان کا مان لوٹانا میرے لیے ناممکن تھا اور میں آپ کو کبھی دکھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔ آپ دکھی ہوتیں تو میں بھی کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ لیکن میری محبت خود غرض نہیں۔ میری محبت آپ کو ہر لمحہ خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ میں آپ کو پچھتاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے آپ کی زندگی سے چلا گیا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میرا وہ فیصلہ درست تھا۔ آج آپ کو خوش دیکھ کر میرے دل کو کتنی مسرت پہنچی ہے' وہ میں آپ کو کیا شاید خود کو بھی ٹھیک سے بتا نہیں سکتا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں' اور ہمیشہ کرتا رہوں گا' میرے دل کا ایک کونا ہمیشہ آپ کی یادوں سے روشن رہے گا۔ مگر ہمارا ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا۔"

وہ بہت نرمی سے کہہ رہا تھا اور نائلہ کو اس کا ایک ایک لفظ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دیر سے ہی سہی اس نے بھی اس سچائی کو جان لیا تھا کہ اس کا اور امجد خان کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا۔

اسے اس شخص پر اور اپنے لیے اس کی محبت پر بے اختیار ہی فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ طمانیت سے مسکرا دی۔

"تھینک یو۔" اس نے پورے خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"میں بھی آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی اور آپ کے لیے دعا کروں گی کہ آپ کو زندگی کی ساری خوشیاں ملیں۔" وہ بس سے اتر گئی تھی مگر اپنی خوشبو چھوڑ گئی تھی۔

امجد خان چند لمحے ساکت بیٹھا اس خوشبو کو محسوس کرتا رہا' پھر اس نے ونڈ اسکرین سے پار اپنے بھائی کے ساتھ سفید کار کی طرف جاتی اپنی چاندنی کو دیکھا۔ جو بے حد خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے امجد خان کی جانب دیکھا اور امجد خان کو اتنے فاصلے سے بھی اس کے چہرے کی نرم مسکراہٹ نظر آ گئی' اس نے طمانیت بھرے انداز سے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"حسن کا ملے تو اچھا۔ اور نہ ملے تو ۔۔۔ اور بھی اچھا۔"

اس کے اندر کوئی آواز گونجی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور باہر پھیلے ... کی طرف دیکھا۔ آج اسے سب کچھ اچھا ... لگ رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ ابھی اسے ایک اور کام بھی کرنا تھا۔

☼ ☼

وہ ابھی اپنے گاؤں کے اسٹاپ پر اترا ہی تھا کہ روزہ افطار ہو گیا۔ اس لیے اس نے وہیں رک کر روزہ کھولا' نماز پڑھی اور گاؤں جانے والی وین پر سوار ہو گیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ اپنے گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو عید کا چاند نظر آ چکا تھا اور ہر طرف گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ انتیسویں روزے کے بعد عید کا چاند نظر آنے پر ویسے بھی لوگوں کا جوش و خروش بہت زیادہ ہوتا ہے' اسے بھی قدرتی طور پر خوشی ہوئی تھی۔ اور جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے بہن بھائی اور ماں اسے دیکھ کر کھل اٹھے کیونکہ وہ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے آیا تھا۔

"ماں! پلوشہ نظر نہیں آ رہی؟" سب سے ملنے کے بعد بھی اسے وہ نظر نہیں آئی تو اس نے ماں سے پوچھ لیا۔

"وہ چھت پر ہو گی چاند دیکھنے گئی تھی' ابھی تک نیچے نہیں اتری۔ تم کھانا کھاؤ گے؟" پلوشہ کے بارے میں بتانے کے ساتھ ساتھ ماں نے اس سے کھانے کے بارے میں پوچھا تھا۔

"کھاؤں گا مگر ابھی نہیں کچھ دیر بعد' میں ذرا پلوشہ سے مل آؤں۔"

اپنے بیگ سے ایک سفید پیکٹ نکال کر اس نے کہا تو اسے ماں کے چہرے پر خوشی کے رنگ پھیلتے ہوئے نظر آئے۔ جنہوں نے اس کے فیصلے کو مزید مضبوط کر دیا۔ وہ چھت پر پہنچا تو پلوشہ چھت کی منڈیر کے پاس کھڑی نظر آئی' اس کی نگاہیں آسمان پر جمی تھیں۔ امجد خان کو چھ سال پہلے کی چاند رات یاد آ گئی جب وہ ٹھیک اسی جگہ کھڑا تھا۔ اور پلوشہ اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے مسکرا کر ہاتھ میں موجود پیکٹ کو کھولا اور عین اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"اتنی دیر سے کیا مجھے مانگ رہی ہو؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا تھا' پلوشہ کرنٹ کھا کر پلٹی' اور اپنے پیچھے اسے دیکھ کر اس کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھا۔

"آپ۔" اس کی آواز خوشی سے لڑکھڑا رہی تھی۔

"آپ آ گئے۔" اسے گویا امجد خان کو دیکھ کر بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں میں آ گیا ہوں تمہارے لیے۔" اس نے بہت نرمی سے پلوشہ کا سفید ہاتھ تھاما اور بہت احتیاط سے کانچ کی نازک چوڑیاں اسے پہنانے لگا۔ خوشی سے پلوشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنہیں اس نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

"آپ پھر مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" وہ اسے جو ... پلوشہ بچوں کی سی معصومیت ... امجد خان نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور محبت بھرے انداز سے بولا۔

"کبھی نہیں' اب میں تمہیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔ جب یہاں سے جاؤں گا تو تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"سچ۔" وہ خوشی سے چہکی تھی۔ وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

"آپ ہنستے رہا کریں' بہت اچھے لگتے ہیں۔" پلوشہ نے فرمائش کی تھی۔

"اچھا۔" اس نے مسکرا کر دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور کب کب اچھا لگتا ہوں۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

پہلی بار پلوشہ کو اس سے ڈھیر ساری شرم آئی اور وہ سیڑھیوں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر وہ بے اختیار ہنسا تھا۔ مگر اس کے پیچھے نہیں گیا۔ بلکہ وہیں کھڑا ہو کر آسمان کے سینے پر چمکتے چاند کو دیکھنے لگا۔ اس کا دل اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ جس نے اس عید کو اس کے لیے اتنا خوبصورت اور مکمل کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بڑے خان جی کے لیے دعا کی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے صحن میں آ گیا' جہاں پلوشہ گنگناتے ہوئے اس کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر رنگ ہی رنگ تھے۔

☼ ☼

عقیلہ ہاشمی

سجناں دا ملنا مشکل

بانجھ عورت اور مخنث میں کیا فرق ہوتا ہے؟“ اس کے ذہن میں کل سے عجیب سوال گردش کر رہا تھا۔ دودھ دھوتے ہوئے اس کے ہاتھ رک جاتے۔ بھینسوں کو چارا ڈالتے ڈالتے وہ کہیں کھو جاتی پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہونے کی کوشش کرتی لیکن وہ خیال پیچھے سے اس کا پیچھا کرتا ایک بار پھر اسے اپنے گھیرے میں لینے میں کامیاب ہو جاتا۔

”یہ میں کیا غلط سلط سوچتی رہتی ہوں بھلا مخنث اور عورت کا کوئی جوڑ ہے؟“ وہ ایک بار پھر سے حملہ آور ہونے والے اس خیال کو ذہن سے جھٹکتی لیکن دل کے کسی کونے سے آواز آتی۔

”مخنث اور عورت کا کوئی جوڑ نہیں لیکن مخنث اور بانجھ عورت کا تو آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔“

درد کی اک ہوک سینے سے اٹھتی اور سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر درد سے چور چور کر ڈالتی اتنا چور چور کہ اس کے ہاتھ سے دودھ والا برتن چھوٹ جاتا وہ وہیں زمین پر بیٹھ جاتی۔

کل اس وقت وہ بھینسوں کے اس احاطے میں گوبر سمیٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کما بھینسوں کو لے کر باہر گیا تھا۔ کے کو اس نے پچھلے مہینے بھینسوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھا تھا۔ اب اس سے اکیلے اتنی ساری بھینسیں سنبھالی نہیں جاتی تھیں۔

صبح صبح کا وقت تھا۔ بھینسوں کا دودھ دھو کر باری باری سارے لوگوں کو فارغ کیا تھا اب [illegible] کے چلے جانے کے بعد کھرلیوں کی صفائی کر رہی تھی۔ سردی اور کورے سے ہاتھ ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔

سامنے والی بڑی کھرلی کو صاف کر کے وہ مڑی تو اسے [illegible] کے درخت کے نیچے پڑی چارپائی پر کسی انسانی وجود کا گمان گزرا۔ چادر کی بکل میں وہاں کوئی تھا۔

”کون ہے بھئی تو؟“ دونوں ہاتھوں کو قریب پڑی بالٹی کے ٹھنڈے پانی سے دھوتی وہ وہیں سے چلائی۔ کسی کی جرات نہ تھی وہ یہاں بغیر اجازت آجاتا۔ وہ نا صرف آچکا تھا بلکہ چارپائی پر بھی بیٹھ گیا تھا۔ اس کے پکارنے کا اس بندے پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”کون ہے بھئی بول کیوں نہیں رہا؟“ جب ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ گیلے ہاتھوں کو چادر سے خشک کرتی چارپائی کے قریب آگئی۔ دونوں [illegible] کو اب کولہوں پر رکھے وہ اس کا جائزہ [illegible] تبھی اسے پتا چلا وہ تو خالدہ (مخنث) [illegible] بکل مارے چارپائی پر سمٹ کر بیٹھی [illegible]۔ خالدہ کا تعلق اسی گاؤں سے [illegible] ان لوگوں کا کام بھی مندا ہو گیا [illegible] لوگ ان کا ناچ شوق سے سنتے تھے۔ کسی [illegible] کی ہوتی تو ان لوگوں کی کھل کر [illegible] اب ایسا وقت آگیا تھا کوئی ایسے ناچ گانے [illegible] سارے رواجیں ہی بدل گئیں [illegible] بے چاروں کو اپنی گزر بسر کے لیے گھر گھر بانٹنا پڑتا تھا۔

خالدہ بے چاری بھی پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے بھیک مانگتی تھی۔ اس کے گھر مانگنے آئی تو وہ اسے دال چاولوں، آٹے کے علاوہ پیسے بھی دے دیتی کبھی رک جاتی رہی ہوتی تو اسے پاس بٹھا لیتی۔ گرم گرم روٹی پکا کر دیتی۔ بدلے میں وہ دعائیں دیتی وہاں سے رخصت ہو

جاتی۔ وہ قریب کھڑی اسے رو تا دیکھ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کیے نہ ہی اسے کوئی تسلی دی۔ وہ جانتی تھی دل میں طوفان اٹھے تو جب تک وہ آنکھوں کے راستے بہہ نہیں جاتا تب تک کسی کی تسلی اس کی شدت میں کمی نہیں کر سکتی اس لیے اسے روتا چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ گھر کے اندر آکر چولہا جلایا توا رکھا گرم گرم دو روٹیاں پکائیں۔ رات کا ساگ

بنا ہوا تھا اسے لسن کا تڑکا لگا کر ایک پیالی میں ساگ اور چھابی میں دو روٹیاں رکھ کر پانی کا گلاس بھر کر وہ دوبارہ اس کے پاس [illegible]

[illegible] سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن اب آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف ہو چکے تھے۔ وہ [illegible] طوفان تھم گیا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر روٹی اس کی طرف بڑھا دی پانی کا گلاس نیچے چارپائی کے

قریب رکھ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوسری کھرلی صاف کر کے مڑی تو وہ کھانے سے فارغ ہو چکی تھی۔ چارپائی سے اٹھتے ہوئے خالی برتنوں کو چومتے ہوئے اس کی آنکھیں ایک بار پھر سے چھلک پڑی تھیں۔ اپنی چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی وہ اس احاطے سے باہر نکل گئی۔ وہ کھرلی کے قریب کھڑی دیکھ رہی تھی۔ آج ہر بار کی طرح جاتے ہوئے اس نے کوئی دعا نہیں دی تھی۔

"جس کا اپنا دامن خالی ہو وہ کسی دوسرے کو کیا دے سکتا ہے۔" وہ تلخی سے سوچ کر رہ گئی۔ خالدہ کے آنسوؤں نے اسے اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا تب سے اب تک وہ یہی سوچ رہی تھی اس میں اور خالدہ میں کوئی فرق نہیں بے شک آج وہ دو مربعوں کی مالک ہے۔ چھ بھینسیں اس کی ذاتی ہیں۔ یہ گھر، یہ احاطہ اس کی ملکیت ہے لیکن یہ سب کس کام کا جب ان سب کا کوئی وارث نہیں۔ ایک دن کوئی غیر آئے گا اور ان سب چیزوں کو ہتھیا لے گا تب نہ وہ مربعوں کی مالک رہ جائے گی نہ گھر والی ہوگی گھر سے بے گھر ہو جائے گی۔

اس کی شادی کو دس سال گزر چکے تھے۔ اس کی گود آج بھی کسی سونے مزار کی طرح اجڑی اور خالی پڑی تھی۔ بڑے علاج کروائے، پیروں فقیروں کے پاس گئی گاؤں کی دائی مائی چھیدی سے علاج کروایا لیکن کہیں سے کوئی خیر نہ پڑی۔

وہ کئی بار تیفے سے کہہ چکی تھی وہ دوسری شادی کر لے اس سے پہلے کہ ہمارے شریک ہماری جائیداد پر قبضہ جمالیں تو شادی کر لے اس گھر کا سونا پن دور کر دے۔ اس ساری جائیداد کو ایک وارث کی ضرورت ہے لیکن پتا نہیں وہ اللہ رکھی کی خلوص دل سے دی گئی اس اجازت سے کیوں کتراتا تھا حالانکہ رکھی نے اسے یقین دلایا تھا وہ اس کے ہونے والے بچے کے نام اپنی ساری جائیداد خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر دے [illegible]

"اس بارے میں تو تسلی رکھ [illegible] لینے کی کوشش کرتی تو وہ ٹال جا[illegible] نہیں کہ وہ رکھی کو تسلی ہی دیتا ہو کہ وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ اس

سوہنے رب پر یقین رکھ وہ اس کی گود ضرور بھر دے گا۔ وہ تو اس مسئلے پر یوں خاموش ہو جاتا جیسے اس کے دل میں کوئی چور ہو۔ اسے لگتا وہ اس سے کچھ چھپا رہا ہے پھر بہت سارے دن خاموشی سے گزر جاتے۔

وہ بے یقینی اور ناامیدی جو اسے گھیر کر رکھتی ایک بار پھر چھٹ جاتی۔ وہ اس سوہنے رب کی دی اس امید کے سہارے پھر سے دن گزارنے لگتی شاید وہ کریم اس بار کرم کر دے۔ دن ایسے ہی گزر رہے تھے۔ ان دنوں وہ مائی چھیدی سے علاج کروا رہی تھی۔ اس نے اس سے کہا تھا وہ کھو کے پھول لے کر اس کو ابالے اور اس کی بھاپ لے۔ مائی چھیدی کے کہنے پر اس نے کمے سے کھو کے پھول منگوائے تھے جو بتا رہا تھا۔

"باجی بڑی مشکلوں سے یہ پھول ملے ہیں۔ وہ چک 42 کے حکیم کے پاس گیا تھا ویسے تو نے یہ کیا کرنے ہیں؟" اس کے ہاتھ سے پھول لے کر وہ اندر چلی گئی اب وہ اسے کیا بتاتی اس نے یہ پھول کیا کرنے ہیں۔

رات کو کھانے کے بعد جب کما بھینسوں والے احاطے میں سونے چلا گیا تو اس نے بڑے دیگچے میں پانی ڈال پھول ابالنے رکھ دیے۔ جب اچھی طرح ابل گئے تو وہ پتیلا اٹھا کر اندر لے گئی۔ دروازے کی کنڈی [illegible] لی اور رضائی لے کر لیٹ گئی۔

تیفا اب اکثر گھر سے باہر [illegible] گزارنے لگا تھا۔ یہ تو اسے پتا تھا وہ نشہ [illegible] سننے میں آ رہا تھا وہ چودھری کے ڈیرے [illegible] کھیلنے لگا ہے۔ بری عادتوں کی لت [illegible] سے پہلے بھی تھی۔ شادی ہو گئی تو [illegible] بھی اس نے کبھی قبول نہ کی [illegible] اناج آجاتا اور دودھ بیچ کر وہ گھر کا خرچہ چلاتی۔ تیفا بھی اپنی ضرورت اسی سے پوری کرتا تھا۔ اب اکثر راتوں کو بھی غائب رہنے لگا تھا۔ وہ بہتیری اس سے مغز ماری کرتی لیکن اس کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ الٹا ان کی لڑائی کا انجام رکھی کی مار کٹائی پر ختم ہوتا۔ گلی محلے کے لوگ آ کر اس کی جان چھڑواتے۔

اب آہستہ آہستہ اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ گھر نہ بھی آتا تو وہ اس سے نہ پوچھتی بلکہ

آرام سے کنڈی چڑھا کر سو جاتی۔

☼ ☼ ☼

اس روز مائی چھیدی گلی میں ماسی نوراں کی بہو کو دیکھنے آئی تو تھوڑی دیر اس کے پاس بھی بیٹھ گئی۔

"سنا کھو کے پھولوں کی بھاپ تو لی تھی نا؟"

مائی چھیدی کو اپنے اس نسخے پر بڑا یقین تھا کہ [illegible] تھی کئی ایک کو اس سے فائدہ ہوا ہے۔

"ہاں ماسی بھاپ تو وہ تین [illegible] ہے لیکن مجھے نہیں لگتا اس کا مجھے کوئی فائدہ ہوا ہے۔ پتا نہیں اسے کیا منظور ہے؟ [illegible] ہوں وہ اتنا ہی تڑپاتا جا رہا ہے۔ کبھی [illegible] چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں [illegible]

[illegible] چہرے پر کتنا کرب تھا۔ ایسا بے زبان کرب جسے اس کے جیسی عورت ہی محسوس کر سکتی تھی۔ مائی چھیدی خود بے اولادی کا دکھ بھگت چکی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں خوشخبری سنانے والی ساری زندگی اپنے گھر کسی خوشخبری کی منتظر ہی رہی۔ رکھی کے درد سے مائی چھیدی کا دل بھر آیا۔

"نہ میری دھی اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔ تو اکیلی تو نہیں تیرے جیسے کئی لوگ ہیں اس دنیا میں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی حوصلہ ہو جاتا ہے۔ ویسے رکھی! تو کسی کا بچہ کیوں نہیں پال لیتی۔ دیکھ پتر اتنے سال گزر گئے ہیں۔ وقت کا کام ہے گزر جانا وہ تو گزرتا رہے گا۔ کسی کا بچہ لے کر پال لے گی تو تیرا دل لگ جائے گا پھر بعد میں کیا پتا اللہ تیری گود بھی آباد کر دے۔"

مائی چھیدی کی صلاح سے پہلے بھی کئی بار وہ ایسا سوچ چکی تھی۔ تیفے کے بھائی کئی بار اسے اپنے بچے دینے آئے تھے۔ چھوٹے دیور نے تو اپنے چوتھے بیٹے کی پیدائش پر اپنا ایک دن کا بیٹا اس کی گود میں ڈال دیا تھا۔

"بھابی! یہ آج سے تیرا پتر ہے تو اس کی ماں اور بھا تیفا اس کا باپ ہمارا آج سے اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

[illegible] اس جذبے سے متاثر ہو کر اس کی [illegible] آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اسی لمحے اس نے [illegible] کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہاں بہت کچھ کھو دینے کا تاثر تھا۔ ایک ماں سے اس کی ساری عمر کی کمائی کھو جانے کا تاثر۔

"تو بھابی پھر تو اس کے نام کب اپنی جائیداد کر رہی ہے۔" اچھو کے مخلص جذبے کے پیچھے چھپا اس کا لالچ فوراً زبان پر آ گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھی اور گرم چادر میں لپٹے بچے کو اصغری کے پہلو میں لٹا کر اس کے گھر سے باہر آ گئی۔

اس کے بعد اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا کہ وہ کسی کا بچہ لے کر پالے گی بلکہ دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کسی رشتے دار کا بچہ نہیں لے گی ہاں کسی غیر کا بچہ مل گیا تو شاید اسے پال لے۔ مائی چھیدی نے اسے کہا کہ اگر وہ ایسا بے سہارا بچہ لا دے تو کیا وہ اسے پال لے گی۔

"ماسی! دنیا میں کوئی بچہ کتنا ہی بے سہارا کیوں نہ ہو کم از کم اس کی دنیا میں لانے والی ماں تو ضرور ہوتی ہے۔ کیا اس کی ماں بھی مر چکی ہے؟"

وہ سوچ رہی تھی بچہ اگر بے سہارا ماں کا ہے تو وہ کبھی بھی نہیں دے گی ہاں اگر ماں اس دنیا سے جا چکی ہے تو شاید مل جائے۔

ماسی چھیدی نے بتایا کچھ دن پہلے اس کی ماں مر گئی ہے۔ چاچی کے پاس ہے۔ تو پال لے گی تو ثواب بھی کما لے گی اور تیرا سونا آنگن اس کے آنے سے آباد بھی ہو جائے گا۔" اس نے فوراً ہامی بھر لی۔

عورت کے دل میں اولاد کی محبت بھی کیسی ہوتی ہے؟ نیلے آسمان کی طرح ہر وقت سر پر تنی رہتی ہے۔ عورت کا تو شاید دل ہی خدا نے اولاد کی محبت سے گوندھا تھا۔ جیسے آٹے میں شیرینی ڈال کر گوندھو تو وہ آٹے کا حصہ بن جاتی ہے۔

دوسرے دن مائی چھیدی چادر میں لپٹی ایک لڑکی اس کے حوالے کر گئی۔ اس کے بدلے میں اس نے اسے پورے دس ہزار روپے دیے تھے۔ تیفے نے سنا

تو اس روز پھر اس کے گھر لڑائی ہوئی۔ وہ بار بار پوچھتا رہا۔ "اس نے یہ لڑکی کہاں سے لی ہے؟ اس کی اجازت کے بغیر اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟" وہ سوال پر سوال کر رہا تھا اور وہ خوشی سے مراداں کو سینے سے لگائے پیار کر رہی تھی۔

اس نے اس کا نام "مراداں" رکھا تھا۔ وہ اس کی مراد تھی۔ اس کی دعاؤں کا صلہ دیا تھا خدا نے۔ اسے پالنے میں پھر پتا ہی نہ چلا وقت کیسے پر لگا کر اڑنے لگا۔ مراداں اب پانچ سال کی ہو گئی تھی۔ رکھی نے اسے اسکول داخل کروا دیا۔ تیفا اب بھی ہفتے دس دن بعد گھر آتا تھا۔ اس نے رکھی کو سختی سے منع کر دیا تھا مراداں خوشی سے اسے ماں کہے لیکن وہ اسے ابا کہنے کی جرات نہ کرے۔

"میری مراداں تجھے ابا کیوں کہنے لگی۔ میں اس کی ماں بھی ہوں اور اس کا باپ بھی میں ہی ہوں۔ تو فکر نہ کر وہ تجھے کبھی ابا نہیں کہے گی۔ سمجھا تو۔"

وہ اسے اسکول بھیجنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ تیار کر کے اس کا بستہ اٹھایا اور اسے اسکول چھوڑنے چلی گئی۔ تیفا دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنے دنوں بعد گھر آیا تھا اور رکھی اس کا یہ استقبال کر رہی تھی۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے اپنے مجازی خدا کو گھاس نہیں ڈال رہی تھی۔

پھر وقت کچھ اور آگے بڑھا مراداں پورے تیرہ سال کی ہو گئی تھی۔ ماشاءاللہ تیرہویں سال میں ہی ایسی جوان ہوئی تھی کہ ہر کوئی دیکھ کر سوچتا تھا اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ رکھی تو جان بوجھ کر لوگوں سے اس کی عمر چھپاتی۔ کبھی کسی کو عمر نہیں بتاتی تھی کہ لوگ نظر لگا دیتے ہیں۔ بھرے بھرے جسم کے ساتھ مراداں کی اوڑھنی ٹھیک کرتی۔ اس کا دل ماں کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ دودھ اور مکھن سے پال کر اس نے اپنی مراداں کو اپنی مرادوں اور ارمانوں کی طرح پالا تھا۔ لوگ مراداں کی جوانی اور خوب صورتی کو دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتے۔

اس بار تیفا گھر آیا تو وہ بھی مراداں کو دیکھ کر [illegible] گیا۔ اس کی نظروں میں مراداں کے [illegible] بس گئی۔

اس نے رکھی کو اندر سے بلا کر رکھ دیا۔

مراداں تھوڑی دیر پہلے نہا کر غسل خانے سے نکلی تھی۔ تولیے سے بالوں کو خشک کرتی مڑی تو اس کی کمر پر لہراتے بال سیاہ ناگ کی طرح بل کھا رہے تھے۔ رکھی چولہے کے قریب بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس کی جسم سے چپکی قمیص دیکھ کر تیفے کے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ گیا۔

"مراداں! چل اندر جا کر چادر لے کر آ۔ ایسے کھلے آسمان کے نیچے ننگے سر نہیں پھرتے کئی شیطان آوارہ گھوم پھر رہے ہوتے ہیں۔ چل میری دھی چادر لے کر چل کے۔" اس نے وہیں سے مراداں کو کمرے میں بھیج دیا۔ تیفا شاید سمجھ گیا تھا اس لیے فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"دے دے رکھی روٹی دے مجھے۔" وہ اٹھ کر چولہے کے قریب آ بیٹھا۔

"کھا روٹی اور جا کہیں مر جا جا کر۔ جواریوں کے ساتھ رہ رہ کے تو بھی پکا جواری ہو گیا ہے۔ گھر اور گھر داری کیا ہوتی ہے ساری زندگی خبر نہ لی۔ یہ تو میں تھی جو تیرے گھر بس گئی۔ کوئی اور ہوتی تو دو دن میں عقل ٹھکانے لگا دیتی۔" اس کے سامنے روٹی رکھتے اس نے اسے ہزاروں کو سنا ڈالے لیکن آج اس کے [illegible] اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

☆ ☆ ☆

تیفے کی نظروں نے اسے [illegible] کر دیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی وہ آج کل روز [illegible] گھر آ جاتا تھا۔ اس نے لڑنا بھی نہیں [illegible] تھا پیار سے بات کرنے لگا تھا۔ رات کو [illegible] کچھ نہ کچھ کھانے کو بھی لے آتا۔

اس روز وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں جلیبیاں تھیں۔ وہ اس نے آتے ہی مراداں کو دیں۔ وہ لے کر اندر چلی گئی۔ جلیبیاں دیتے ہوئے اس نے جن نظروں سے مراداں کو دیکھا تھا اس نے رکھی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"کیوں لایا ہے یہ جلیبیاں؟" وہ اس کے پیچھے ہولی۔ "آج سے پہلے تو تو کبھی گھر میں کوئی چیز نہ لایا تھا نہ کبھی اس کی خیر خبر لی تھی کہ وہ کیسے گزارا کرتی ہے۔ اب روز روز اس کا گھر آنا اور یہ تحفے لے کر آنا۔ اسے خطرے کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔

"تم لوگوں کے لیے لایا ہوں۔ لو بھلا تم میری ذمہ داری نہیں ہو؟" ساری زندگی لاپروائی میں گزارنے والا ذمہ داری کی بات کر رہا تھا۔

"یہ آج اچانک کیسے تیری ذمہ داری ہو گئی۔ اس سے پہلے تو تو نے [illegible] کبھی جیتی ہے یا مر گئی۔ یہ ذمہ داری [illegible] سے جاگ گئی تیرے اندر تا مجھے۔" وہ دونوں کولہوں پہ ہاتھ رکھے اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

"[illegible] بال کی کھال اتارتی ہے۔ جب ذمہ داری قبول نہیں کرتا تھا تب بھی شکایت تھی۔ اب ذمہ دار ہوا ہوں تو بھی شکایت ہے۔ تیرا بھی پتا نہیں چلتا۔ او تے گھر والی نہیں ہے تو میری۔"

"ہاں گھر والی تو ہوں میں تیری۔ اس ناتے سے مراداں بھی تیری دھی لگتی ہے نا پھر۔" اس نے بڑی دور کی لگائی تھی۔

"نہ بھئی تو تو میری گھر والی ہے پر یہ مراداں نہ کل میری دھی تھی اور نہ آج ہی میری دھی ہے سمجھی تو۔"

"مراداں تیری دھی نہیں تو پھر یہاں کیا لینے آتا ہے۔ چل نکل یہاں سے یہ میری دھی کا گھر ہے۔ اس میں وہی بندہ میرے ساتھ رہ سکتا ہے جو اسے بھی دھی سمجھے گا۔ چل چلتا بن یہاں سے۔" اس نے کھڑے کھڑے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔ اسی وقت مراداں اس کی لائی جلیبیاں پلیٹ میں ڈال کر لے آئی۔

"چھوڑ اماں تو بھی ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کبھی تو ہنس کر بات کر لیا کر بے چارے سے۔" مراداں نے پیار سے جلیبی توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ جلیبی اس نے مراداں کی محبت میں اندر نگل تو لی لیکن ساری رات وہ یہی سوچتی رہی کس طرح مراداں کی حفاظت کرے گی۔ آخر فجر کے قریب کہیں اس کی آنکھ لگی۔ سونے سے پہلے اس نے حل نکالا جلدی سے مراداں کے ہاتھ پیلے کر کے اس گھر سے رخصت کرے گی۔ یہ سوچ کر جہاں وہ مطمئن ہو گئی وہیں اسے دور بھیجنے کا سوچ کر وہ دکھی بھی ہوئی۔ تیرہ سال اسے پال کر جوان کیا تھا۔ اس کے ساتھ کی وہ عادی ہو گئی تھی۔ اب وہ اس کے بغیر کیسے زندگی گزارے گی۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے جاننے والوں سے مراداں کے رشتے کی بات کی تھی کہ کوئی اچھا رشتہ نظر میں ہو تو اسے بتائیں۔ لوگ اسے کہتے "اتنی جلدی کیا ہے تجھے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اتنی جلدی اس کی شادی کر دی تو پھر سے اکیلی رہ جائے گی۔"

وہ انہیں کیا بتاتی اسے کس بات کی جلدی ہے۔ کوئی خوف تھا جو اسے پہلے سے آگاہ کر رہا تھا انہی دنوں اس کے بھائی کے بیٹے کی شادی آ گئی۔ وہ مراداں کو لے کر شادی میں چلی گئی۔ مراداں کو اسکول سے دو ہی چھٹیاں ملی تھیں۔ اس لیے وہ دونوں ماں بیٹی ولیمہ کے دوسرے دن گھر آ گئیں۔ سویرے مراداں کو اسکول جانا تھا۔ وہ صبح تڑکے اٹھی۔ آٹا گوندھ کر روٹیاں پکائیں۔ مراداں کی وردی استری کر کے رکھی۔ جب اسے جگانے گئی تو اس کا سارا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔

گاؤں کا واحد ڈاکٹر مقبول صبح دس بجے دکان کھولتا تھا۔ اس وقت تک رکھی کو چین نہ آیا۔ کبھی اسے دبائی کبھی رضائی سیدھی کرتی۔ کئی بار ہمسایوں کے احاطے میں جا کر کے ٹائم پوچھتی رہی۔ دس بجے وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی۔

اس نے کہا "سردی لگ گئی ہے ایسی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" لیکن رکھی کو چین نہیں آ رہا تھا۔ سارے کام کاج چھوڑ کر اس کے سرہانے بیٹھ گئی تھی۔

"میری دھی کا تاپ مجھے کیوں نہ چڑھ گیا۔ سوہنا ربا میری دھی کا تاپ اتار دے۔ میں بابے ملنگ کے مزار پر میٹھے چاول پکا کر لے کر جاؤں گی۔"

وہ اس کا ماتھا چومتی خود ہی باتیں کرتی جارہی تھی لیکن مراداں چپ تھی نہ ہی وہ آج اس کی محبت کے بدلے میں کسی محبت کا اظہار کررہی تھی نہ ہی آج وہ اسے کہہ رہی تھی۔

"اماں اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔" [illegible] کہتی رہی۔

"میں ٹھیک ہوں جا تو جا کر کام کر مجھے سونے دے۔"

مراداں کو شادی میں اس کی بڑی ماسی نے بتایا تھا رکھی تیری سگی ماں نہیں۔ کچھ کچھ شک تو اسے پہلے تھا اب ماسی کے منہ سے یقین کر دل میں اپنی اصلی ماں کو دیکھنے کی خواہش جاگی تھی۔ وہ اس ماں کو دیکھنا چاہتی تھی جس نے اسے پیدا کرکے اس عورت کے حوالے کردیا۔ اپنی گود اجاڑ کر اس عورت کی سونی گود کی رونق بنادیا۔ کیوں وہ کوئی فالتو چیز تھی؟ کیا اسے اس سے کوئی محبت نہ تھی؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے ذہن میں کئی سوال اٹھ رہے تھے۔

"اماں! میں تیری دھی نہیں نا؟ تو نے مجھے لے کر پالا ہے نا؟" شام کو اس کا بخار کچھ کم ہوا تو اس نے رکھی سے پوچھا۔ اس کے سر میں پھرتی رکھی کی انگلیاں ایک دم سرد پڑ گئیں۔

"کیوں؟ تجھے کس نے کہا تو میری دھی نہیں ہے؟ بتا کس نے کہا؟ میں اس کا منہ توڑ دوں گی جس نے تجھے یہ بات بتائی۔"

"اماں! پہلے تو مجھے یہ بتا یہ بات ٹھیک ہے نا تو میری ماں نہیں۔" مراداں کا سوال وہیں کا وہیں تھا۔

"مراداں تو نے سوچ بھی کیسے لیا؟ میری محبت میں کہاں کوئی کمی دیکھی تو نے۔ تیرے دل میں یہ خیال آیا بھی کیسے کہ میں تیری ماں نہیں بول بول میرا پتر۔" رکھی کی آنکھوں سے آنسو امڈ آئے۔ روتے روتے اس نے مراداں کو سینے سے لگالیا۔

"پھر لوگ کیوں کہتے ہیں تو میری ماں نہیں؟ تو مجھے میری ماں کا پتا بتادے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میں ہی تیری ماں ہوں کوئی اور تیرا [illegible] تو یہ خیال دل سے نکال دے۔"

"نہیں اماں! خدا کے لیے مجھے میری ماں کا پتا بتا دے۔" وہ رو رہی تھی۔ بلک رہی تھی۔ رکھی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑے التجا کررہی تھی۔ رکھی اس کے دونوں جڑے ہاتھوں کو چوم کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس سے مراداں کا رونا دیکھا نہیں جارہا تھا۔ کلیجہ پھٹ رہا تھا۔

"میرے مولا! میری ریاضت میں کہاں کمی رہ گئی تھی جو میری جھولی میں مراد ڈال کر واپس مانگنے کا تقاضا کررہا ہے۔" آنسو اس کی آنکھوں سے تواتر سے گرتے جارہے تھے۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے رب سے رو رو کر گلہ کرتی رہی۔

ساری رات نہ رکھی نے مراداں کو بلایا اور نہ ہی مراداں نے اس سے کچھ پوچھا۔ رکھی کی دبی دبی آوازیں آتی رہیں۔ وہ شاید اپنے پروردگار سے راز و نیاز کررہی تھی۔

صبح مراداں کا بخار اتر چکا تھا۔ وہ رکھی کے منع کرنے کے باوجود اسکول چلی گئی۔ رکھی گھر کی دہلیز پر بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔ دوپہر کو اس نے مراداں کے لیے چائے بنائی ساتھ اس کی پسند کی چاچے منظور کی دکان سے باقرخانیاں لے کر وہ اس کے اسکول آ گئی۔

"کھالے کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہے؟" اپنے ہاتھ سے باقرخانی کھلاتے ہوئے [illegible] مراداں کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"مجھے پتا ہے تو نے [illegible] نہیں کھایا۔ دوائی بھی گھر بھول آئی [illegible]" اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کی دوائی [illegible] کھلائی۔ مراداں اس کے چہرے کی طرف [illegible] رہی۔

"[illegible] سکتا ہے یہ میری ماں نہ ہو۔ رب تو نے مجھے اس کی کوکھ سے جنم کیوں نہ دیا۔" مراداں اس کی بانہوں میں سمٹ کر بلک بلک کر رو دی۔

"نہ میری دھی تو نہ رو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" رکھی نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو صاف کرکے اس کے ماتھے پر کتنے بوسے دے ڈالے تھی

مراداں کو اس کی جماعت سے ایک لڑکی بلانے آگئی۔

"اماں اب تو گھر جا۔" مراداں کے کہنے پر وہ گھر لوٹ آئی۔

✿ ✿ ✿

اس واقعے کے بعد پھر نہ کبھی رکھی نے اس بات کا ذکر کیا اور نہ ہی کبھی مراداں نے اس سے اپنی اصلی ماں کا پتا دوبارہ پوچھا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ رکھی کے جواب اس کے رونے دھونے یا پھر اس کی محبت کی وجہ سے چپ ہوگئی تھی [illegible] کر بیٹھ گئی تھی۔ اندر ہی اندر اس کی [illegible] بڑھتی جارہی تھی۔ تیفے نے بھی جستجو [illegible] آنکھوں میں پڑھ لیا تھا [illegible] اس کے قریب ہو رہا تھا۔ اس نے مراداں [illegible] اس کی ہمت بڑھائی تھی۔ اسے [illegible] تھا وہ اسے اس کی اصلی ماں تک لے کر جائے گا۔ مراداں کو اس کی باتوں میں سچائی نظر آئی تھی۔ دوسرا کام تیفے نے یہ کیا کہ اس کے دل میں [illegible] کے لیے نفرت بھرنی شروع کردی اس نے نقطہ ہی وہ پکڑا تھا کہ مراداں کا اس سے بدگمان ہونا لازمی تھا۔

اس روز وہ ماسی نوراں کے گھر ساگ لینے گئی تھی۔ رکھی کو ساگ بہت پسند تھا۔ ماسی نوراں نے اسے کہا تھا وہ ساگ بنا رہی ہے شام کو جب مراداں اس کی طرف آئے گی تو وہ اس کے ہاتھ ساگ بھیج دے گی۔ ساگ لے کر لوٹ رہی تھی کہ جب گلی میں تیفا مل گیا۔ آج بہت دنوں کے بعد وہ اسے نظر آیا تھا۔ آخری بار جب اس سے ملا تھا تو وعدہ کرکے گیا تھا اس کی ماں کا پتا کرکے لوٹے گا۔ اب جیسے ہی وہ اس کے سامنے آیا وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی۔

"میری ماں کا کچھ پتا چلا؟" مراداں کو یقین تھا وہ ضرور کوئی نہ کوئی پتا لے کر آیا ہوگا۔

"پتا چلا بھی اور سمجھ نہیں بھی لگا۔" اس کے گول مول جواب نے مراداں کو الجھا دیا۔

"کیا مطلب ہے؟" مراداں کے ہونٹ کپکپا

اٹھی۔

"مراداں! تو اپنے آپ کو سنبھال میں پھر تجھے سب بتاؤں گا۔ اس وقت تیری حالت ایسی نہیں تو یہ سب برداشت کر سکے۔ جا تو گھر چلی جا۔" وہ اس کے لٹھے کی طرح سفید پڑتے رنگ سے ڈر گیا۔ مراداں کو اگر کچھ ہو جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ فوراً" وہاں سے کھسک گیا۔

مراداں گھر لوٹی تو بڑی خاموش تھی۔ رکھی پوچھتی رہی پر وہ اس سے چھپاتی رہی۔

"نہیں اماں کوئی بات نہیں تجھے تو بس وہم ہو جاتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

دوسرے دن وہ رکھی سے اپنی سہیلی سلطانہ کے گھر جانے کا بہانہ کر کے تیفے کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی۔ وہ گاؤں سے باہر پرانے تھڑے پر نشہ کرتا مل گیا۔

"بول تیفے تو میری ماں کے بارے میں کیا جانتا ہے؟"

مراداں آتے ہی اس کے سر ہو لی کل تو وہ جان چھڑا گیا تھا۔ آج وہ تہیہ کر کے آئی تھی اس سے پوچھ کر ہی گھر جائے گی۔

"تو آرام سے بیٹھ کر بات کر پھر تجھے تیری اصلی ماں کے بارے میں بھی بتا دیتا ہوں۔ پہلے اپنی اس نقلی ماں کا اصلی چہرہ تو دیکھ لے۔" اس نے رکھی کے خلاف جو نفرت اور کدورت کا زہر تیار کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے اندر اتارنا شروع کیا۔

"میں گیا تھا تیری اصلی ماں کے گاؤں۔ وہاں لوگوں نے بتایا وہ تو کب کی مر چکی ہے۔" تیفے کے اس نئے انکشاف نے اس کی دنیا اجاڑ کر رکھ دی۔ وہ جو جستجو جو ارمان لے کر نکلی تھی سب خاک میں مل گیا۔

"میری ماں مر گئی۔"

"مر نہیں گئی۔ لوگ کہہ رہے تھے ایک عورت نے اسے زہر دے کر مارا تھا۔" اس کی آنکھیں [illegible] سے بند ہو رہی تھیں پھر بھی رکھی کے خلاف زہر کم نہیں ہوا تھا۔

"زہر دے کر مارا؟ کس نے مارا میری ماں کو تو جانتا ہے اسے۔" وہ اس کا گریبان پکڑ کر چلائی۔

"او مجھے تو چھوڑ جا اپنی نقلی ماں سے پوچھ جس نے دائی کے ساتھ مل کر تیری اصلی ماں کو زہر دیا تھا۔" وہ ایک اور انکشاف کر کے دوبارہ سگریٹ کے سوٹے لگانے لگا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل پڑیں۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تو جھوٹ بولتا ہے۔" وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نے تیفے کو تو چپ کروا دیا تھا لیکن پیچھے سے آتی اس کی آواز میں کوئی تو سچائی تھی۔ جو وہ سینہ بجا کر کہہ رہا تھا۔

"جا پتا کر لے سارا گاؤں اس بات کو جانتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

تیفے نے جو نفرت اس کے دل میں اتاری تھی وہ آہستہ آہستہ رنگ لے آئی تھی۔ رکھی اور مراداں کے درمیان نفرت کی ایسی دیوار کھڑی ہو گئی کہ لاکھ کوشش کے باوجود رکھی اس کے پاس اپنی مراداں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ مراداں کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی لیکن اس کا ذہن اس نقطے پر ٹھہر گیا تھا۔

بہت سارے دن اسی کشمکش میں گزر گئے [illegible] کسی نے مشورہ دیا تو مراداں کی شادی [illegible] شاید اس سے اس کا رویہ کچھ بدل جائے [illegible] اس کے رشتے کی بات تو کئی لوگوں سے [illegible] کی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں [illegible]

اس روز [illegible] چارپائی پر بیٹھی سوچ میں گم تھی۔ سامنے [illegible] بھینسوں کو نہلا رہا تھا۔ اچانک اسے خیال [illegible] وہ مراداں کا بیاہ اس سے کر دے اس طرح مراداں ہمیشہ اس کی نظروں کے سامنے رہے گی۔ [illegible] بھلا لڑکا ہے۔ کئی سالوں سے اس کے پاس تھا۔ آگے پیچھے تھا بھی کوئی نہیں۔

[illegible] کے اور مراداں کے رشتے کا سوچ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

اس نے کمے سے بات کی تو اسے کیا اعتراض ہو

سکتا تھا۔ اس کا تو وہ حال تھا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں وہ تو کب سے دل ہی دل میں مراداں کو پسند کرتا تھا۔ جب مراداں کو پتا چلا تو اس نے رکھی کی وہ خبر لی کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔ بس منہ دیکھتی رہ گئی۔

"تو ہوتی کون ہے میری قسمت کا فیصلہ کرنے والی؟ پال پوس کیا لیا تو سمجھتی ہے جس کسی کے ساتھ باندھے گی چپ چاپ سر جھکا کر چلی جاؤں گی۔ یہ خیال دل سے نکال دے رکھی بی بی کہ میں [illegible] جاؤں گی۔ ساری زندگی تیرے سینے پر مونگ دلوں گی میں۔ تیرے سامنے رو کر تڑپاؤں گی تجھے۔"

یہ کیسا انقلاب آگیا تھا [illegible] اس کی مراداں سینہ تان کر اس کے سامنے [illegible] رکھی خاموش کھڑی حیران پریشان اس [illegible] ہی کو دیکھ رہی تھی جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ رکھی [illegible] لٹ گئی تھی وہ تو اس بات سے بھی بے خبر تھی اسے لوٹنے والا کون ظالم ہے۔

☆ ☆ ☆

اس کی مراداں اس سے اتنی دور ہو گئی تھی کہ چاہ کر بھی وہ اسے قریب نہیں لا سکتی تھی۔ سارا دن ایک گھر میں رہنے کے باوجود وہ رکھی کو بلاتی نہ تھی۔ چپ چاپ اس کے پاس سے ایسے گزر جاتی جیسے اس کا اس سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ رکھی اسے بلاتی تو وہ جواب نہ دیتی۔

مراداں کی بے اعتنائی نے رکھی کو جیتے جی مار دیا۔ وہ کسی کو اپنا دکھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ کہتی بھی کس سے اس کا دنیا میں کون تھا؟ مراداں کو اپنا بنایا تھا وہ بھی پرائی ہو گئی تھی۔

اب وہ سارا دن بھینسوں والے احاطے میں کام کرتی رہتی۔ گھر کے اندر جاتی تو مراداں کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگتا۔

ایک دن وہ کوڑے کی ٹوکری اٹھا کر جا رہی تھی۔ ڈھیر پر کوڑا پھینک کر واپس آتے ہوئے اس کی نظر سائیکل پر جاتے تیفے اور مراداں پر پڑی۔ مراداں تیفے کی بانہوں میں سائیکل پر سوار شہر کی طرف جا رہی تھی۔

رکھی کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا بلکہ سب کچھ ٹوٹ کر [illegible] نے دیکھا رکھی کو مستقل چپ لگ گئی [illegible] سے بات کرتی نہ کسی سے کچھ کہتی [illegible] دن بھینسوں والے احاطے میں بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

پھر لوگوں نے دیکھا تیفا مستقل گھر لوٹ آیا۔ اس نے زمینوں کا سارا انتظام سنبھال لیا۔ تھوڑے دنوں بعد اس نے کمے کو کام سے فارغ کر دیا۔ پھر وہ بھی ہو گیا جس پر دیکھنے والی ہر آنکھ نے افسوس اور دکھ کا اظہار کیا دوسری طرف یہ بھی کہا کہ "چلو اچھا ہی ہوا رکھی یہ سب دیکھنے سے پہلے ہی اپنے ہوش کھو بیٹھی کوئی عورت اتنا بڑا دکھ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔"

وہ دکھ تھا تیفے اور مراداں کی شادی، مراداں نے رکھی کو اذیت دینے کے لیے تیفے سے شادی کر لی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی مٹی کی اس مورت کو دکھ دے کر اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا وہ تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اب تو مراداں کو اس دکھ میں ساری زندگی جلنا تھا۔

رکھی سارا دن احاطے میں بیٹھی خود سے باتیں کرتی رہتی یا پھر گاؤں کی گلیوں میں نکل جاتی۔ گلیوں میں کھیلتے بچوں کے ساتھ یوں گھل مل جاتی جیسے آج بھی وہ ان بچوں میں کہیں اپنی مراداں کو ڈھونڈ رہی ہو۔

دل مانگ مانگ اے اللہ جوڑ سانگے
سجناں دا ملنا مشکل مانگ اے
اساں گل پا کے عمری اسیری
تیرے پیچھے مل لئی سجناں فقیری
[illegible] پھیرا کسے سجناں دے واٹوں
سجناں دا ملنا مشکل مانگ اے

☆ ☆

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

زنداں کی بلند دیواروں کے اس پار کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے ڈھیروں مناظر نظروں سے گزرتے ہیں آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی ہیں آزاد اور پر لطف زندگی چاروں طرف رقصاں ہوتی ہے۔ آزادی ایک حسین اور تابناک چیز ہے اس کی قدر و قیمت و اہمیت اس سے پوچھیں جس پر جیل کی چھوٹی سی دنیا میں کائنات محدود کردی جاتی ہے۔
کرن میں اس ماہ سے نیا سلسلہ "روداد قفس" کے نام سے شروع کیا جارہا ہے جیلوں میں قید خواتین کے حالات و واقعات پر مبنی۔ آخر ایسے کون سے مسائل و حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس سلسلے کی کوئی کہانی آپ کے پاس ہے تو ہمیں روانہ کریں۔ ہم نوک پلک سنوار کرا سے شائع کریں گے۔

اوکاڑہ کینٹ سے نکلتی ہوئی پتلی سی بل کھاتی ہوئی یہ سڑک قصبہ نور شاہ کی طرف جاتی تھی۔ جس پر تھوڑا سا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد سرسبز و شاداب اور لہلہاتے کھیتوں سے سجا یہ گاؤں "رتی ٹبی" کہلاتا تھا۔

شام کے سائے اپنے پر پھیلا چکے تھے۔ خوش الحان پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں بسیرا کرنے کے بعد خاموشی اختیار کرچکے تھے۔ گاؤں کی ایک چوڑی گلی کے نکڑ پر واقع اکرم چوبارے والے کا دو منزلہ مکان اس وقت گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن دوسری منزل پہ واقع کمرے کی کھڑکی میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ جو نیم تاریکی ماحول سے نبرد آزما ہونے کی کمزور کوشش کررہی تھی۔

کمرے میں ایک میبل کرسی ایک بیڈ ایک طرف سجا ہوا خوب صورت صوفہ، فرش پر بچھا ہوا ایرانی قالین اور ایک سائیڈ پر موجود دیوار گیر الماری جس میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں میز کے برابر پڑی ہوئی کرسی پر ایک متحرک وجود موجود تھا جو میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں پر اپنے ہاتھ میں موجود خوب صورت فاؤنٹین پین سے کچھ لکھ رہا تھا۔

گھنے لمبے سیاہ بال، گھنی پلکیں، موٹی آنکھیں، ستواں ناک، یہ مریم تھی سولہ، سترہ سال کی خوب صورت لڑکی اس وقت پورے انہماک سے نوٹس تیار کررہی تھی۔ بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پوری جانفشانی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دیتی تھی۔ حسب معمول اس وقت بھی وہ اپنے کام میں مشغول تھی کہ کمرے میں گونج اٹھنے والی ٹھک کی عجیب سی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کردیا۔

اس کی متجسس نگاہیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کوئی ایسی چیز موجود ہے جو اس سے پہلے کمرے کا حصہ نہیں تھی۔ اس نے حیرت سے اس چھوٹی سی گول سی چیز کو دیکھا اور پھر وہ کرسی سے اٹھ کر اس چیز تک آئی۔

اس نے اس گول سی چیز کو اٹھایا تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ مٹی کا ایک ڈھیلا تھا۔ جس کے ارد گرد بڑی کاریگری کے ساتھ ایک کاغذ لپیٹا گیا تھا۔ اس نے کاغذ کو مٹی کے ڈھیلے سے الگ کیا اور سیدھا کرکے اس پر ایک نظر دوڑائی تو اس کے ساتھ ہی اس کی پیشانی پر ان گنت شکنیں نمودار ہوگئیں۔

پہلا ہی جملہ جو اس کاغذ پر تحریر تھا۔ "جان سے پیاری مریم" پڑھ کر اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے باہر گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا اور تیزی سے چلتی ہوئے کھڑکی تک جا پہنچی۔ اس نے سر باہر نکال کر جھانکا، لیکن ارد گرد کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ اس نے حقارت سے کاغذ کے ٹکڑے کی طرف دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت میں آئے اور کاغذ پرزہ پرزہ ہوگیا اگلے ہی لمحے کاغذ کے وہ پرزے مٹی کے ڈھیلے کے ساتھ کھڑکی سے باہر تھے۔ اس نے ماتھے پر آنے والے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس کرسی پر آبیٹھی۔ کچھ لمحوں کے لیے اس کا ذہن پراگندہ ہوا، لیکن پھر پُرسکون ہوگئی۔

اب وہ ایک بار پھر پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی کی بکس کھول چکی تھی اور اس کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ پورے انہماک سے نوٹس تیار کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

شہروز کو اپنے گاؤں "رتی ٹبی" آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ وہ ساہیوال کے ایک کالج میں پڑھتا تھا اور تعلیم کے سلسلے میں وہیں رہائش پذیر تھا۔ گاؤں میں اس کا آنا جانا کم ہی ہوتا تھا، کیونکہ گاؤں میں پیدا ہونے، پلنے بڑھنے کے باوجود یہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا، اور لگتا بھی کیسے یہاں اس کی "دلچسپی" کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا ایک دن سے زیادہ یہاں رہنا دوبھر ہوجاتا، لیکن اس مرتبہ کچھ ایسا ہوا تھا کہ تین دن گزر جانے کے باوجود اس نے واپسی کا نام نہیں لیا اور اس کی وجہ صرف وہی جانتا تھا۔

اور یہ وجہ جیتی جاگتی سانس لیتی پریوں کی طرح خوب صورت و نازک مریم تھی۔ جب سے اس نے اسے دیکھا تھا اس کے دماغ میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ ایک عجیب سا احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کرگیا تھا۔

وہ ٹیوب ویل کے پاس اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا، جب اس نے اسے پہلی مرتبہ وہاں سے گزرتے دیکھا اور یہ ایک نظر دیکھنا ہی قیامت ڈھا گیا، وہ مبہوت سا گم سم بیٹھا اسی طرف دیکھتا رہا جہاں سے وہ گزری تھی۔

اس کے دوست راشد نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کب کی جاچکی اور خالی پگڈنڈی پر دور تک کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

دوسری مرتبہ وہ اپنے گھر سے نکل رہا تھا تو اس نے اسے گلی سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ سفید لباس میں ملبوس، سفید ہی دوپٹہ اوڑھے ہوئے وہ بہت مقدس لگ رہی تھی۔ اس کا معصوم و خوب صورت چہرہ کسی طرح اسے اپنے سحر میں گرفتار کرگیا۔

وہ قدم بقدم اس کے پیچھے کھنچتا چلا گیا۔ تین، چار گلیوں سے گزرنے کے بعد شاید اس کی منزل آگئی وہ غڑاپ سے دروازے میں داخل ہوئی اور گم ہوگئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کسی کے ہوش و حواس گم ہوئے ہیں۔ وہ دیر تک وہیں کھڑا اس دروازے کو تکتا رہ گیا۔

شہروز اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا، وہیں ہوش سنبھالا تھا۔ لہٰذا وہ گاؤں میں رہنے والے "تقریباً" ہر فرد سے واقف تھا اور کیوں نہ ہوتا گاؤں کی آبادی کتنی ہوتی ہے۔ اور چچا اکرم جو گاؤں میں اکرم چوبارے کے نام سے مشہور تھے۔ وہ تو پشتوں سے اس گاؤں میں آباد تھے۔ ان کے باپ، دادا نے بھی اسی مٹی سے جنم لیا۔ اور اسی مٹی میں مل گئے تھے۔

کچھ دیر تک وہ بے اختیار سا ہو کر وہیں کھڑا رہا، لیکن پھر شاید اسے عقل آگئی اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے واپس چل دیا۔

اور آج تین دن گزر جانے کے باوجود وہ اس چہرے کو فراموش نہیں کرسکا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک عجیب سی بے چینی اس کی طبیعت پر طاری تھی۔ کچھ تھا جو اس کے ذہن میں جوار بھاٹے پیدا کررہا تھا۔ کچھ مختلف، کچھ ایسا انوکھا عمل تھا جو اس کے اندر ہی اندر کسی لاوے کی طرح پک رہا تھا۔

نایاب جیلانی

۳

تیسری قسط

ڈھلوانی سطح سے چودہ فٹ گہری کھائی دور سے ہی دہشت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ جس جگہ وہ لوگ کھڑے تھے۔ وہاں سے یہ گڑھا اتنا گہرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم ان سب نے بھی ماہیر کی پیروی کرتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے چھلانگیں مار دی تھیں۔ اب وہ گڑھے کے عین اوپر کناروں پر کھڑے تھے۔ گھاس پھوس اور جنگلی پھولوں سے اٹی یہ کھائی دیکھنے میں اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان پھولوں کے کنج کے نیچے اتنا گہرا گڑھا ہے۔ مقامی لوگوں نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ یا

مکمل ناول

پھر اس وادی میں بے شمار جابجا گڑھے اور کھائیاں موجود تھیں۔

ہری بھری نوکیلی گھاس اور جنگلی پھولوں نے کھائی کو بیلے کی طرح چھپایا تھا۔ انہیں حریم کی معمولی سی سسکی نما آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ان کے چیخنے چلانے اور شور مچانے کے باوجود کہیں سے ہلکی سی آواز تک سماعتوں میں نہیں اتر رہی تھی۔

"حریم۔ حریم!" ماہیر دیوانوں کی طرح آوازیں دیتا پتھروں کو ہاتھوں سے ہٹاتا، گھاس پھوس کو نوچتا مسلسل حریم کو آوازیں دے رہا تھا۔ یہی حال محسن اور محب کا تھا۔ وہ بھی برابر مٹی کے ٹیلوں کو ہاتھوں سے ہٹا رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر مہک بھی زاروقطار رو رہی تھی۔ خالہ سڑک کے عین وسط میں بے دم سی بیٹھی مسلسل کوئی ورد پڑھ رہی تھیں۔ ان کے آنسو ایک روانی سے چہرے پر پھسل رہے تھے۔

لمبی لمبی گھاس ہٹ چکی تھی۔ مدھم پڑتی روشنی نے وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ شام جا رہی تھی۔ رات آ رہی تھی۔ دہشت زدہ سے سناٹوں میں ان کی کرب میں ڈوبی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔

"حریم! حریم۔ بولتی کیوں نہیں ہو۔ بولو حریم! بولو آواز دو۔" حریم کی سیاہ شال میں لپٹا اس کا وجود بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ساکن، بے دم، خاموش۔

"آپی بے ہوش ہو گئی ہیں۔" محسن نے سوکھے حلق کو ہاتھ سے دبا کر بھرائی آواز میں کہا۔ ماہیر گڑھے میں اتر گیا تھا۔ حریم — بے ہوش تھی یا [illegible] سانسیں بند ہو چکی تھیں۔ ماہیر کو گھبراہٹ، پریشانی اور شاک کی وجہ سے کچھ سمجھ نہیں [illegible] کسی نرم بہت "نرم چیز کو محسوس [illegible] تھے حریم کو باہوں میں اٹھا کر باہر [illegible] اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نرم سی [illegible] گہری کھائی میں اتنی نرم مٹی کی موجودگی [illegible] تھی۔ تاہم ایک اطمینان تو تھا کہ حریم گرنے کے بعد کسی نوکیلے پتھر سے نہیں ٹکرائی۔ اس کا پورا وجود سرخ ابلتے خون سے شرابور تھا۔ یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ خون حریم کے جسم کے کس کس حصے میں سے نکل رہا ہے۔ اس کے بال، سر، ماتھا تازہ خون سے تر بتر تھا۔

گاڑی تک پہنچنا گویا قیامت کا سفر تھا۔ حریم کو دیکھ کر خالہ تو بالکل ہاتھ پیر چھوڑ چکی تھیں۔ محسن اور محب نے انہیں بمشکل سنبھالا تھا۔

"آپی کو شہر لے چلتے ہیں۔"

"نہیں ماہیر! مقامی ہسپتال لے چلو۔ پہلے کچھ ٹریٹمنٹ تو ہو، شہر تو بہت دور ہے۔" خالہ حریم کا سر اپنی گود میں رکھے دوپٹے کے پلو سے بہتا خون جذب کرتی رندھی آواز میں بولیں۔

"اگر مزار پر نہ جاتے تو آپی گرتی بھی نہیں۔" مہک کو اپنی ضد سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہی تو زبردستی انہیں مزار تک لے گئی تھی۔

"تمہیں جنون چڑھا تھا، پہاڑی پر چڑھنے کا۔" محب کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ مہک کی گردن ہی مروڑ دیتا۔

"کیا خبر تھا کہ حادثہ پیش آ جائے گا یہاں آنے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔" محسن کا ملال بھی کسی طور پر [illegible]

"بک بک نہ کرو، بس دعا مانگو۔ اللہ حریم کو صحت دے دے۔" خالہ کو حریم کی کنڈیشن کا اندازہ تھا۔ اسی لیے ان کی فکر اور پریشانی کئی گنا زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ماہیر ہونٹ بھینچے بہت رش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت کئی رنگ آ رہے تھے غم،

فکر، پریشانی، صدمے اور غصے کے رنگ۔

ہسپتال کے پھاٹک پر گاڑی رک چکی تھی۔ ماہیر کو امید تو نہیں تھی ڈاکٹر کی موجودگی کی، تاہم وہ خدا پر بھروسہ رکھے ایمرجنسی اطلاع اندر بھیج چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہسپتال کا عملہ الرٹ ہوگیا۔ اسٹریچر پر بے جان سی حریم کو ڈال کر طویل راہداری کی طرف لے گئے تھے۔ سب اپنی اپنی سوچوں میں گم اعصاب شکن لمحات کے زیر اثر بے دم سے کوریڈور میں رکھے بینچ پر بیٹھ گئے۔

"میں نے روکا بھی تھا پھر بھی۔" وہ بنچ دیوار سے سر ٹکائے اپنی بازگشت کو سننے لگا۔

"کیا ضرورت تھی اسے جانتے بوجھتے پہاڑ پر چڑھنے کی۔"

"اسے تقدیر کہتے ہیں بیٹے؟" خالہ تسبیح ہاتھ میں لیے ماہیر کے برابر بیٹھ کر نرمی سے بولیں۔

"خالہ! ہم یہاں نہ آتے، گھر سے ہی نہ آتے۔ حریم کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہ آتا۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی گھلنے لگی تھی۔ بہت ضبط کے باوجود سرخ آنکھوں سے دو قطرے گر پڑے تھے۔

"جو لوح محفوظ میں اول روز سے لکھا جا چکا ہے اسے ہو کر رہنا ہے۔ ہم مسلمان ہیں، ہمارا عقیدہ مضبوط ہے بیٹے! یہ تکلیف، یہ صدمہ، یہ پریشانی حریم کے نصیب میں لکھی جا چکی تھی۔ اپنے حصے کی اس تکلیف کو اس مقام پر اس جگہ پر کھینچ لانے والی قوت کا نام ہی تقدیر ہے۔ حریم کو یہ درد، یہ صدمہ سہنا ہی تھا۔ یہ کرب اس کے نصیب میں تھا۔"

"امی نے روکا بھی تھا مگر میں۔" وہ ہونٹ کچلتا شاید ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

"یہ امی کی نافرمانی کا صلہ ہے۔" اس کا ذہن ایک نقطے پر منجمد ہو چکا تھا۔ خالہ نے گہری طویل سانس کھینچی تھی۔ وہ حریم کے گھر کے بہت سے حالات سے واقف ہو چکی تھیں۔ وہ حریم کے ضبط اور صبر سے بھی واقف تھیں، یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کی بھانجی برداشت کی بہت قوت رکھتی ہے۔ یہ حادثہ وہ امی کی نافرمانی سے منسوب کر چکا تھا یقیناً۔ اس کی زباں بھی یہی ارشادات جاری کرے گی وہ نہیں جانتی تھیں، ہوش میں آنے کے بعد حریم کو اس اذیت سے بھی بڑے بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑے گا۔

"آپ مریضہ کے شوہر ہیں۔" ایک نرس عجلت میں ان کے قریب آرکی۔ وہ دونوں ہی سوچوں کے کرب ناک بھنور سے نکلے۔

"جی۔" ماہیر ایک دم بنچ سے اٹھ گیا۔

"آپ کو ڈاکٹر صاحبہ بلا رہی ہیں۔" نرس کسی اور راہداری کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ماہیر اٹھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں ایک اور نرس کی ہمراہی میں آگیا۔ ڈاکٹر نے نرس سے بھی زیادہ عجلت کا مظاہرہ کیا۔

"مریضہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ بلیڈنگ البتہ روک دی گئی ہے۔ بینڈیج بھی کر دی ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ فوراً مریضہ کو بڑے ہسپتال لے جائیں۔ سیزیرین ہوگا۔ بہتر یہی ہے آپریشن کے ذریعے قبل از وقت ڈیلیوری کر دی جائے۔ ورنہ شاید ماں اور بچے میں سے کسی ایک کو بھی نہیں بچایا جا سکے گا۔ آج کل کی لڑکیاں احتیاط سے کام نہیں لیتیں کیا ضرورت تھی سیڑھیاں اترنے کی۔" ڈاکٹر کو خالہ نے شاید یہی بتایا تھا۔ ماہیر کے قدموں میں [illegible] لڑکھڑاہٹ آگئی۔ پریشانی اور فکر نے [illegible] اس کی آنکھوں کی سرخی ختم کر دی [illegible]

دو گھنٹے بعد وہ اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ ہسپتال کے کوریڈور میں [illegible] ڈاکٹر اتنا سیریس کیس [illegible] نے گویا آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

[illegible] پہلے کیا ٹریٹمنٹ دی گئی ہے۔ وہ کلینک [illegible] چیک اپ کی رپورٹس اور متعلقہ ٹیسٹ کی رپورٹ دکھائیے۔ پہلے کون سی ڈاکٹر چیک اپ کرتی رہی ہے؟ اب کیوں اس ڈاکٹر نے کیس نہیں لیا؟ کیا پیچیدگی کی وجہ ہے؟ کیس تو بہت سیریس ہے۔ بچہ تو دور، ماں بچ جائے یہی غنیمت ہے۔ بچے کی ہارٹ بیٹ بالکل سنائی نہیں دے رہی۔ دھڑکن تو مجھے بار بار چیک کرنے کے

باوجود نہیں ملی۔ مریضہ بے ہوش ہے۔ بلیڈنگ بے تحاشا ہو چکی ہے۔ آپریشن کرنا بھی ایک رسک ہے۔ اگر پیشنٹ کو آپریشن کے بعد ہوش نہ آیا تو ہم بری الذمہ ہیں۔" سارے آپشن سامنے رکھ کر خالہ کی ہزار سفارشوں کے بعد ایمرجنسی آپریشن ہوا تھا۔ اس کا رواں رواں دعا گو تھا نظریں آپریشن تھیٹر کے دروازے پر تھیں۔ اسے گھر میں امی کو اطلاع کرنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد مردہ بچہ پیدا ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ خالہ قریبی مارکیٹ سے بچے کے کپڑے، ڈائپر، گرم کمبل، فیڈر وغیرہ لینے گئی ہوئی تھیں۔ ان کے آتے ہی ڈیڈ بے بی کی اطلاع ان تک پہنچائی گئی تھی۔ خالہ اور ملک نے بے اختیار [illegible] کیا تھا۔ محسن میڈیکل اسٹور سے [illegible] لایا تھا۔ سب کو گھر بھیج دیا گیا۔

کچھ دیر بعد کمبل میں لپٹا نیلی رنگت والا گول مٹول گوتھنا سا بچہ [illegible] لائی۔ بچے کی روح کب کی پرواز کر گئی تھی۔ سانس کا تانا بھی باقی نہیں تھا۔ آنکھیں کچھ لمحے قبل ہی بند ہو چکی تھیں۔ سرخ ہونٹوں نے بھی خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی حتیٰ کہ اپنے رونے کی آواز تک نہیں سنائی۔

اتنے مہینوں، دنوں، ساعتوں اور لمحوں کا انتظار اختتام پذیر ہوا تھا۔ چپکے سے بہت خاموشی کے ساتھ اس ننھے سے فرشتے کو آنسوؤں کے سائے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں اتنے کرب ناک انتظار سے ماہیر کو کبھی نہیں گزرنا پڑا تھا۔ لمحہ لمحہ گویا قیامت تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار سفید بیڈ پر لیٹی حریم ساکت وصامت تھی۔ مشینوں پر آتی ریڈنگ سے سانسوں کی موجودگی کا پتا چلتا تھا ورنہ وہ تو امید کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑے بیٹھا تھا۔ پوری رات ٹھنڈے فرش اور سرد دیواروں کو دیکھتے گزر گئی تھی۔ موذن نے فجر کی اذان دی تو وہ اٹھ کر وضو کرنے چل دیا تھا۔

خالہ نے اور ماہیر نے نماز فجر کوریڈور میں ہی ادا کی تھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو نجانے سیل رواں کیسے جاری [illegible] آنسوؤں کے ساتھ رو رہا تھا۔ [illegible] جلد حریم سے اس کے کتنے رشتے [illegible] کے، روح کے، کاغذ کے۔

خالہ نے تسبیح ہاتھ سے رکھ کر ماہیر کے شانے کو تھپکا، محبت سے تسلی دی یہی تسلیاں، دلاسے تو وہ پچھلے اٹھائیس گھنٹوں سے ایک دوسرے کو دے رہے تھے۔

صبح نوخیز نے جھلک دکھائی تو ایک نرس تقریباً بھاگتے ہوئے ان کے قریب چلی آئی۔

"آپ کے پیشنٹ کو ہوش آگیا ہے۔"

"کیا؟" خالہ کا سر سجدے میں جھک گیا۔ آنکھیں رب جلیل کی اس رحمت اس مہربانی پر اشک بار تھیں۔

"حریم کو دیکھ سکتے ہیں۔" ماہیر بے قراری سے اٹھا۔

"نہیں۔" نرس مسکرائی۔

"کچھ دیر بعد آپ کی مسز کو روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔"

"میں امی کو ایک فون تو کر دوں۔" اعصاب شکن لمحات کے اختتام پر اسے گھر فون کرنے کا خیال آیا تو خالہ نے بے ساختہ ماہیر کو آواز دے کر روکا۔

"ٹھہرو بیٹے!" وہ اٹھ کر ماہیر کے قریب چلی آئیں۔

"امی کو اتنی دور بیٹھے پریشان مت کرو۔ کچھ دن بعد گھر جا کر آرام سے، تحمل سے اس حادثے کے متعلق بتانا۔ ابھی کچھ بتاؤ گے تو نجانے ان کا ردعمل کیا ہوگا۔" خالہ، راحت بیگم کے مزاج سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔ اس خبر کو سن کر نجانے وہ کیسا ری ایکٹ کرتیں۔ ماہیر نے خالہ کی بات سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ خالہ اس کی فرمانبرداری پر بے اختیار خوش ہو گئیں۔ ماہیر کی مجنونوں جیسی حالت دیکھ کر انہیں کئی مرتبہ بھانجی کی قسمت پر رشک آیا تھا۔ پھولوں کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔ غم اور خوشی کا ازل سے ساتھ ہے۔ قرابت ہے، مراسم ہیں، حریم کی چھت

مضبوط تھی۔ سائبان کانچ کا تھا یا اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا؟

ہم سفر ساتھ ہو تو زندگی کی طویل راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے لیے شوہر کی محبت بھری رفاقت کا زادِ راہ عمر کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حریم محبت اور اپنائیت، احساس اور خیال کے ان جذبوں سے مالا مال تھی۔ ماہیر کی پُر خلوص محبت اس کے ہمراہ تھی۔

تیرہ جنوری کی سرد ہڈیوں کو ٹھٹھرا دینے والی بے حد اداس، غم سے لپٹی ہوئی کرنی صبح ہسپتال کے کمرے میں اتر آئی تھی۔ شیشے کے پار کا منظر بھی دھند میں لپٹا غمگین تھا۔ آسمان نے بھی رات بھر خوب سوگ منایا تھا شاید اتنی بارش ہوئی تھی کہ سڑکوں پر گویا سیلاب آگیا۔ درد کی اک تیز لہر جسم میں اٹھی تھی۔ نجانے کتنی کرب کی منزلوں سے گزر کر حریم نے آنکھیں کھول کر اپنے شوہر کے پژمردہ، اداس چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آنسو بغاوت کر کے پلکوں کے بند توڑ چکے تھے۔

"میری وجہ سے ماہیر پریشان ہوا ہے۔" یہ سوچ ہی حریم کے دل کو مسلنے کے لیے کافی تھی۔

"حریم!" وہ اس کے چہرے پر جھکا۔

"کیسی ہو میری جان! درد تو نہیں ہو رہا۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ درد نہیں ہے۔" قوت کی ہر لہر کو دبا کر وہ آہستگی سے بولی۔ حلق خشک تھا۔ لب بے جان اور سوکھے تھے۔ کمزوری و نقاہت کا احساس غالب آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا تو وہ دھیرے سے پلکیں موند گئی۔

"حریم! میری بچی! آنکھیں کھولو۔" بہت مہربان سی یہ آواز اس کی خالہ کی تھی۔ امی کی اکلوتی اور واحد کزن ننھیالی رشتہ داروں میں یہی واحد رشتہ بچا تھا۔ امی اور خالہ کی دوستی بھی بہت تھی۔ انسیت بے پناہ تھی۔ خالہ نے امی کے بعد بھی ان سے تعلقات قائم رکھے تھے۔ ہمیشہ محبت اور خلوص کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کے خلوص اور بے لوث محبت کا تو ماہیر خود بھی قائل تھا۔ بچے اور خالہ کسی طرح غم کی ان گھڑیوں میں ساتھ دیتے رہے تھے۔ وہ ان کا احسان مند تھا۔ مشکور تھا۔

"حریم بیٹی! اٹھو، یہ تھوڑا سا دودھ پی لو۔" خالہ نے نرمی سے محبت سے اس کے دائیں ہاتھ کو دبایا۔ ماہیر اسے سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ حریم کی بے ساختہ چیخیں لبوں سے برآمد ہوئیں۔

"ماہیر! ایک اور تکیہ پیچھے رکھو۔" خالہ نے ماہیر کو ہدایت دی تھی۔

"پیو بیٹا۔" خالہ نے نیم گرم دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

"مہک ناشتا بنا کر محب کے ساتھ آجائے گی۔ محسن کو میں نے گھر بھیج دیا ہے۔" خالہ، ماہیر سے مخاطب تھیں۔ اچانک حریم کو اپنے وجود میں کسی خالی پن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"آرام سے بیٹے۔" خالہ نے بریڈ کا چھوٹا سا پیس حریم کے منہ میں رکھا۔

"آپریشن ہوا ہے۔ اٹھنے، بیٹھنے میں احتیاط کرنا پڑے گی۔"

"آپریشن ہوا ہے مگر کیوں؟ مجھے کیا ہوا تھا؟ میرا بچہ کہاں ہے؟ ابھی تو ڈلیوری میں بہت سا وقت پڑا تھا۔ دو اڑھائی مہینے یا اس سے بھی زیادہ۔" وہ کچھ سوچنے کی کوشش میں نڈھال ہو گئی۔

"بس۔" اس نے دودھ کا گلاس لبوں سے ہٹا دیا۔

"دوا کھانی ہے حریم! تھوڑا سا اور دودھ پی لو۔" ماہی نے نرمی سے اصرار کیا۔

"خالہ! میرا بچہ کہاں ہے؟" وہ دونوں ہی شاید اس سوال سے بچنا چاہ رہے تھے۔ دونوں نے بیک وقت نظریں چرا لیں۔

"ماہیر! خالہ! بتایئے نا، آپریشن ہوا ہے تو پھر بچہ کہاں ہے؟" انہونی کے احساس نے حریم کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔

اسے سب کچھ یاد آرہا تھا۔ وہ چھوٹی سی سفید بادلوں سے ڈھکی وادی، جھرنے، آبشاریں، بہتی رواں ندی، پھلوں سے لدے باغات، ماہیر کی ہمراہی، ایک دوسرے کی قربت کی سرخوشی، تنہائی، حسین لمحے، یادیں، بے شمار یادیں۔ پھر کیا ہوا تھا؟ اسے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بادلوں سے ڈھکے آسمان نے رنگ بدل دیا تھا۔ ہواؤں میں تلخی رچنے لگی۔ پھل شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ ندی اور آبشار کا پانی سرخ ہو گیا تھا۔ وہ مزار کی طرف جاتی سڑک پر چڑھ رہی تھی۔ نہ جانے کہاں سے پرندوں کا غول غل غپاڑہ مچاتا آگیا تھا۔ اس کے پیر کے نیچے پتھر آیا اور وہ لڑھکتی ہوئی کسی کھائی میں جا گری۔ اس کے بعد منظر دھندلا گئے تھے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ اور نہ جانے کتنے گھنٹوں بعد ... آنکھیں کھولی تھیں۔ ایک دم ہی سارے منظر دھندلا گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو چھلکنے لگے۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی تھی۔ خالہ اور ماہیر کے چہرے پر لکھی تحریر اتنی واضح تھی کہ حریم بھلا پوچھ کر کیا ... اس سفر میں وہ اپنی سب سے قیمتی متاع لٹا چکی تھی۔

جس کے ہونے کے احساس نے دن اور راتوں میں رنگ بھرے تھے اپنی موہنی صورت دکھائے بغیر چلا گیا تھا۔ اپنی ہنسی، اپنے آنسو، اپنی نرم نرم مسکان دکھائے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کی بلکتی ممتا کو سیراب کیے بغیر چلا گیا۔

"حریم! میری بچی! صبر سے کام لو۔ اللہ کا شکر ادا کرو، جس نے تمہیں زندگی بخشی ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد تمہاری گود بھر جائے گی۔" خالہ نے آنسو پی کر اس کی سرد ہوتی پیشانی کو چوما۔ ماہیر خاموش تھا اور شاید ضبط کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخیاں اتر رہی تھیں۔

"خالہ! میں کیا کروں، غم سے میرا دل پھٹ رہا ہے۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو دی۔

"میری بچی! ہمت پکڑو، خود کو مضبوط کرو۔" خالہ اس کا سر تھپک رہی تھیں۔ اس کی سسکیاں ماہیر کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل رہی تھیں۔

"خالہ! ایک بات پوچھ لوں؟"

"... ہاں! پوچھو۔"

"... بیٹا؟" وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر تمام ... چکی تھی۔

"... تھا۔ بالکل ماہیر جیسا۔" خالہ کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ اسی پل محب اور مہک ہاتھ میں ٹفن اور تھرموس لیے اندر داخل ہوئے۔

"آپی! فٹافٹ اٹھ جائیں۔ آپ کے لیے دلیہ لائی ہوں۔ خوشبودار، بھاپ اڑاتا۔" مہک کو شاید خود کو بھی دلیہ بہت پسند تھا۔

"اچھے وقت پر آئی ہو مہک۔" ماہیر نے سر جھٹک کر گویا زہریلی سوچوں سے پیچھا چھڑایا تھا۔

"ناشتا لائی ہوں، انڈے، پراٹھے، روسٹ اور چائے۔"

"واہ۔ مزا آگیا۔" ماہیر نے اور بھی خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔

"اٹھو، حریم! بھاپ اڑاتا دلیہ کھالو۔" وہ اٹھ کر حریم کے قریب چلا آیا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"ہر بات دل کی نہیں مانتے۔ اکثر دل نقصان بھی کروا دیتا ہے۔" نا چاہتے ہوئے بھی ماہیر کی آواز میں ملال گھل گیا۔

"تھوڑا سا دلیہ کھالو۔"

"نہیں نا۔" وہ بے چینی سے سر تکیے پر پٹخنے لگی۔

"رہنے دو ماہیر! کچھ دیر بعد کھا لے گی۔" خالہ نے اس کی بے زاریت محسوس کر لی تھی۔ وہ جانتی تھیں حریم کے دل پر اس وقت غم کا موسم گزر رہا ہے۔ ماہیر بچوں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو چکا تھا۔ شاید وہ اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا اور ناشتا تو اس نے بھی صرف برائے نام کیا تھا۔ محض خالہ کے اصرار کی وجہ سے۔

"ماہیر بھائی! وہ موٹی سی نرس ہمارے محسن کو بہت گھور رہی تھی کہہ رہا تھا جتنی مرتبہ میڈیکل اسٹور میں دوائیاں لینے گیا ہوں موٹی نے بڑی دل آویز مسکراہٹ ہر دفعہ میری طرف اچھالی تھی۔ شاید وہ میری عاشق ہو چکی ہے۔" محب محسن کے ساتھ

ہونے والی ٹریجڈی کو سرعام نشر کر رہا تھا۔

"مسوڑی کی اتنی جرأت، کیوں گھورتی رہی ہے میرے بھائی کو، آنکھیں نہ پھوڑ دوں اس کی۔" مہک کے ہمشیرانہ جذبات مچل اٹھے۔

"چھلاوہ موٹی نرس میرے بانکے سجیلے بھائی کے لیے رہ گئی ہے۔" محب نے بھی رنجیدگی خود پر طاری کرلی۔

"محسن کے کیا تاثرات ہیں؟" ماہیر ان کی نوک جھوک سے اچھا خاصا محظوظ ہو رہا تھا۔

"شدید صدمے سے لوٹ پوٹ پڑا ہے۔" محب نے مزے سے بتایا۔

"وہ کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بے چارے پر ادھیڑ عمر جمعدارنیاں، گھریلو نوکرانیاں ہی عاشق ہوئی ہیں اور اب یہ موٹی نرس۔" مہک نے رازداری سے بتایا۔

"او۔ سمجھ گیا۔" ماہیر نے پرسوچ انداز میں سرہلایا۔

"اچھی ٹریجڈی ہے۔"

"تو اور کیا؟" مہک افسردہ ہوئی۔

"میرا بانکا سجیلا بھائی ان "مسوڑیوں" کے لیے رہ گیا ہے۔" مہک نے گویا بڑی عقلمندی کی بات کی تھی۔ ماہیر اور محب دونوں ہنس دیے۔

"حمق اس طرح کہو۔" محب نے ہنسی روک کر مہک کو جتایا۔

"یہ "مسوڑیاں" میرے بانکے سجیلے بھائی کے لیے رہ گئی ہیں۔"

"اچھا۔" مہک جھینپ کر مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

نیند اتنی گہری تھی یا پھر نسوانی چیخ کی آواز اتنی کرب ناک تھی۔ وہ ایک دم بستر سے اٹھ گیا۔ اس شدید ٹھنڈ میں بھی اس کا پورا وجود پسینے سے شرابور ہو گیا۔

"کیسا خواب تھا؟ پہاڑ، جنگل، کنواں یا پھر عجیب سی کھائی۔ ایک گرتا ہوا سایا، چیخیں، آنسو اور سسکیوں کی آوازیں۔"

ماسٹر بیڈ روم کی ہر شے میں اداسی کے رنگ چھلکنے لگے تھے۔ وہ گلاس ونڈو سے بھاری کرٹن ہٹائے، وسیع و عریض لان میں اتری رات کو دیکھنے لگا۔

"وہ خیریت سے ہے۔" دل میں بے چینیاں کروٹیں لینے لگی تھیں۔

"فون کروں؟" وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں، اس وقت فون کرنا مناسب نہیں۔" وہ نفی میں سرہلاتا پھر سے لان میں اتری رات کو دیکھنے لگا۔

"جانی سے تو پوچھ سکتا ہوں۔" ایک سوچ انگڑائی لے کر جاگی۔

"نہیں اس وقت نہیں۔ صبح کروں گا۔ بلکہ خود چلا جاؤں گا۔"

بھیگی کالی رات کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔ احساس کے ان رشتوں میں محبت کشکول پکڑے کھڑی تھی۔ دل کے تاروں نے اس اذیت کو محسوس کرلیا تھا جس سے محبت لاحاصل گزر چکی تھی۔ گزر رہی تھی۔ نجانے یہ کیسا بندھن تھا؟ یہ کیسا رابطہ تھا؟ یہ کیسا تعلق تھا۔؟

ایسی ٹھنڈی میٹھی محبت تو کسی نے نہ کی ہوگی، چپکے، خاموشی سے۔ نہ ظاہر ہوتی، نہ واضح ہوتی، نہ عیاں ہوتی نہ آشکار ہوتی پھر بھی کہتی ہے [illegible] محبت۔

کبھی کبھی زر جان عباس کو لگتا اس کا دل ایک صراحی کی مانند ہے۔ خالی صراحی کی مانند۔ اس صراحی کو حریم کی "یاد" پھولوں سے، کلیوں سے، موتیوں سے زیبائش دیتی ہے، اس کی آرائش کرتی ہے۔ سجاتی ہے [illegible] پھر اس کا منہ صندل کی خوشبو سے بھر کر بند کر دیتی ہے۔ اور وہ اس خوشبو کے سنگ [illegible] کا سفر بڑے شوق سے بڑی چاہ سے طے کر رہا تھا۔

اہل زمین آج چاندنی سے نہائی کیوں نہیں لگ رہی تھی۔ چاند بھی شاید اداس تھا، غمگین تھا۔ بادلوں کی اوٹ میں چھپا بیٹھا تھا۔ اونگھ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ رات کے رخسار پر کوئی ہاتھ رکھ کر مسکرایا تھا۔ تمسخرانہ، طنزیہ، مذاق اڑاتی اس ہنسی کی آواز وہ پہچانتا تھا۔ بولتی خاموشی تمکنت سے چلتی ہوئی اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ تمسخر سے دیکھتی ہوئی۔

"اسے "یاد" کر رہے ہو۔" خاموشی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کب نہیں کرتا۔ وہ تو ہر وقت ساتھ ہے۔" خفگی ادھر بھی عیاں تھی۔

"بھلا یاد کرنے سے کیا حاصل۔" خاموشی نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے [illegible]"

"یہ تمہارا احساس ہے۔ تمہارے دل کے اور [illegible] سناٹے" مجھے پسند نہیں۔" خاموشی نے ناک بھوں چڑھائی۔

"مجھے تمہاری پسند ناپسند سے کیا لینا دینا۔"

"جس کی پسند، خواہش اور تمناؤں کو اولیت دیتے ہو۔ اس نے کبھی تمہیں سوچا بھی نہیں۔" خاموشی نے تنگ کر کہا۔

"میں جو اسے سوچتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا؟ وہ میری سوچ میں رہے یا میں اس کی سوچ میں رہوں۔ بات تو ایک ہے۔"

"ہوں۔ ہوں، کیوں خود کو بہلاتے ہو۔" خاموشی نے نفی میں سرہلایا۔

"تم اس کی سوچ کا حصہ ہو، یہ تو ناممکن سی بات ہے۔ اس کی سوچیں تو ایک "محور" کے گرد گردش کرتی ہیں۔"

"اپنی "خوشی" میں میرا سکون ہے۔ تم کیوں بھول جاتی ہو۔"

"زندگی یادوں کے سہارے نہیں گزرتی۔" خاموشی کا انداز ناصحانہ تھا۔

"اور یادوں میں بھی تمہارے پاس کیا ہے؟ کوئی ایک لمحہ، ساعت، گھڑی، پل بیتے سالوں میں سے ڈھونڈ کر دکھاؤ۔ اس نے کبھی تمہیں سرسری نظر سے [illegible] نہیں دیکھا۔"

"[illegible] اس کو دید سے سیراب ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔"

"دیوانے ہو دیوانے۔" خاموشی نے گویا ماتھا پیٹا۔

"ایسی محبت کا بھلا کیا فائدہ۔"

"محبت میں فائدہ اور نقصان نہیں دیکھتے۔"

"محبت میں پھر بھلا کیا دیکھتے ہیں۔ محبوب کی بے رخی، سنگدلی، سرد مہری۔" خاموشی غصے سے بولی۔

"اسے سنگدل مت کہو۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"وہ باوفا ہے۔ حیا اس کی چادر ہے، جس میں اس نے خود کو لپیٹ رکھا ہے۔ اس کی اسی "وفا" نے مجھے اسیر کر رکھا ہے۔ بھلا دیکھو تو زر جان عباس کو ہر موڑ پر ٹھکرانے والی لڑکی اسی "وفا" کی خاطر میرے دل پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ محبت اسے ماہیر عالم سے ہے۔ وفائیں ساری بھی اسی کے نام ہیں۔ زندگی کا ہر لمحہ کچے کاغذوں پر لکھ کر اس نے ماہیر عالم کو دے رکھا ہے۔ اس کے باوجود میں اس کے لاحاصل عشق میں مبتلا ہوں تو بھلا کیوں؟"

"کیوں؟" خاموشی حیران ہوئی۔

"وفا اور حیا کی خاطر۔"

"میں سمجھی نہیں۔" خاموشی نے نفی میں سرہلایا۔

"اس کی وفائیں تو ماہیر عالم کے نام ہیں پھر۔"

"ایمانداری اسی کو کہتے ہیں۔ محبت اسی کا نام ہے۔ ذرا میرے سرکل میں نظر دوڑا کر تو دیکھو، ایسی سچے موتیوں جیسی عورت کہاں ہے؟ کھوٹا پیسہ، کھوٹی عورت ایک برابر۔"

"سمجھ گئی۔" خاموشی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تم نے زبردستی کیوں نہ کی۔ اٹھلاتے حریم جمال کو بھلا۔" خاموشی نے بڑی عجیب راہ دکھائی تھی۔ عجیب سوال کر کے۔

"کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟"

"تم غصہ کر گئے۔" خاموشی کچھ خوفزدہ ہوئی۔

"ہاں۔"

دیکھتی رہی تھی یہاں تک کہ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔
"ماہیر!" حریم کے لبوں سے سسکاری نما آواز نکلی۔
"ہم اسلام آباد نہ آتے۔ اس گاؤں میں نہ جاتے۔ میں پہاڑی پر نہ چڑھتی تو پھر یہ سب تو نہ ہوتا۔"
"ایسا کیوں سوچتی ہو حریم!" ماہیر نے نرمی سے اس کی پیشانی کو چھوا۔
"یہ صدمہ ہمارے نصیب میں لکھا تھا۔"
"گھر کب جائیں گے۔" وہ ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم سے اکتا گئی تھی۔
"ڈسچارج پیپر مل گیا ہے۔"
"تو پھر چلیں۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔
"حریم! ایک پرابلم ہے۔" ماہیر کی آنکھوں میں گہرا تفکر تھا۔
"کیسی پرابلم۔" وہ حسب معمول گھبرا گئی تھی۔ دل تو ویسے بھی پہلے سے زیادہ نحیف ہو گیا تھا۔ ذرا سی بات پر گھبرانے لگتا۔
"بل تو کلیئر کر دیا ہے اگرچہ میری توقع سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ تمہارے دو آپریشن ہوئے ہیں۔ ڈاکٹرز کی الگ الگ فیس، پرائیویٹ روم کا خرچہ۔ علاج اتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔ دوائی غریب آدمی کی پہنچ سے اتنی دور ہے۔ متوسط طبقے کا آدمی تو چکی کے پاٹوں میں پس کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال واپس جانے کا کرایہ بچا ہے۔ وہ بھی نجانے کن دقتوں کے بعد۔" وہ دھیمی آواز میں کہتا ہوا بہت الجھا الجھا لگ رہا تھا۔
"تمہاری خالہ کی محبت، خلوص۔ بچوں کی بے لوث خدمت۔ ایک بیوہ عورت پر اتنے دن اضافی بوجھ لا در کھا تھا ان کا بجٹ ڈاؤن ہو چکا ہوگا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مہک کا میٹرک کا رزلٹ بہت شاندار آیا ہے۔ میرا خیال تھا بچوں کو کچھ اچھے گفٹس [illegible] مگر۔ ان حالات میں یہ ممکن نہیں [illegible] سوچ رہا ہوں صرف مہک کو گفٹ د[illegible] تک ہماری واپسی ہے۔ آفس سے لی چھٹیاں [illegible] ختم ہو چکی ہیں۔

ذوالفقار صاحب سے بات کی تھی میں نے ایک دو دن کی اضافی چھٹی مل گئی ہے۔"
"گھر کب چلنا ہے۔"
"ابھی محسن گاڑی لے کر آ رہا ہے۔" ماہیر کے لبوں میں الفاظ تھے جب محسن نے کمرے میں جھانکا۔
"محسن آچکا ہے۔" وہ مزے سے گنگنایا۔
"لوگ مجھے اتنا یاد کرتے ہیں۔ اسی لیے چھینک چھینک کر میرا برا حال ہے۔"
"اب چھینکوں کی بیماری ہمیں مت لگانا۔" محسن کو رات سے فلو تھا۔ ماہیر کے کہنے پر وہ مزے سے ہنسنے لگا۔
"گھر چلیں آپی!"
"کیوں نہیں۔" ماہیر نے بازو کے سہارے سے حریم کو اٹھنے میں مدد دی۔ محسن دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ صرف بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ گھر آ چکے تھے۔ خالہ نے حریم کا صدقہ دیا۔ خیرات کے پیسے الگ رکھے۔
"میری بچی! غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہمارے لیے بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔ بس ہم انسان نادانی میں [illegible] پاتے۔ اس پاک ذات سے شکوے کرنے لگتے ہیں۔"
وہ رات کو بہت دیر تک حریم کو سمجھاتی رہیں۔
"خالہ! پتا نہیں دل اتنا خالی خالی سا کیوں ہو گیا ہے۔"
"یوں مت کہو بیٹی۔ اللہ کا شکر ادا کرو دوسری زندگی ملی ہے [illegible] اتنا خطرناک حادثہ تھا۔ ہمارے لیے تمہارا بچ جانا ہی معجزہ ہے۔ آہستہ آہستہ زخم سل ہی جائیں گے۔" حریم لب کچل کر آنسو پینے لگی۔
"یہ حادثہ تمہیں گھر میں بھی پیش آسکتا تھا۔ کسی اور بہانے سے۔" وہ اس کے ہاتھ نرمی سے تھپتھپانے لگیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگی تھیں۔
"حانی کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"
"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔"
"بھائی صاحب کی صحت بھی ٹھیک نہیں۔ حانی کی

فکر۔ مجھے ہمیشہ پریشان رکھتی ہے۔ ابھی تو بوا کا دم ہے۔ نجانے میری بچی کا کیا بنے گا۔" خالہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ حریم بھی رنجیدہ ہو گئی۔
"ہر لحاظ سے صحت مند ہے۔ ذہین ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ صرف ایک کمی نے اس کی شخصیت کو گہن لگا دیا ہے۔"
"تمہارے انکل کے بغیر چل سکتی ہے۔"
"جی خالہ! انکل کے بغیر بھی چل سکتی ہے۔ میں تو بہت توجہ سے اسے روزانہ ایکسرسائز کرواتی تھی بہت دھیان سے پنڈلیوں کی مالش [illegible] بوا کا خیال اسے بہت رہتا ہے۔ [illegible] میں بہت لاپروا ہے۔" حریم نے آزردگی [illegible]
"حانی کی شادی [illegible]" خالہ نے بہت انوکھی بات کی تھی [illegible] حیران ہی تو رہ گئی۔
[illegible]
"کیوں نہیں۔ اللہ کی اتنی وسیع دنیا ہے۔ کوئی تو اس کا جوڑ کا بھی ہوگا۔" خالہ بہت پرامید تھیں۔
"حانی اپنے گھر کی ہو تو بھائی صاحب کی ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔"
"اگر ایسا ہو جائے تو میں بھی شاد ہو جاؤں۔" وہ آنکھوں میں جگنو لیے کسی اور جہاں میں پہنچ گئی تھی۔ خالہ اس کا دھیان بٹ جانے پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔
اگلی صبح ماہیر، مہک کو خالہ کے بے حد ناراض ہونے، منع کرنے کے باوجود مارکیٹ لے گیا تھا۔ مہک اپنی پسند کا ریڈی میڈ اسٹائلش سوٹ، میچنگ کے چپل لے کر آئی تھی اور وہ بہت خوش تھی اسی شام وہ دونوں کچھ اچھی اور زیادہ غم اور دکھ سے بوجھل یادیں لے کر واپس آ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

ماہیر اور حریم جب گھر پہنچے تو پورے گھر پر ہو کا عالم تھا۔ کچھ دیر پہلے لاؤنج میں بہت رونق تھی۔ زمیلہ کی سسرال والے شاید آئے تھے۔ میز پر کھانے پینے کی

بھی کچھ اشیا بے ترتیبی سے پڑی تھیں امی اور زمیلہ تخت پر بیٹھی تھیں۔ اور دونوں بہت خوشگوار ماحول میں باتیں کر رہی [illegible] انہیں آتے دیکھ کر چونک کر سیدھی ہو [illegible] نظریں حریم کے آزردہ بے رنگ [illegible] ٹکرائیں۔ کچھ تو تھا جو غیر معمولی [illegible] ہوا تھا۔ الگ سا غیر متوقع حریم نے انہیں [illegible] انہوں نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگایا۔
زمیلہ بھائی سے لپٹی کھڑی تھی۔
"شکر ہے، آپ آ گئے۔" زمیلہ نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے۔
"گھر میں ذرا بھی رونق نہیں تھی۔ حالانکہ بھابھی اتنا بولتی بھی نہیں، اس کے باوجود گویا ان کے ہونے سے رونق تھی۔"
"میرا اپنا دل بڑا پھیکا پڑ رہا تھا۔ ایسی بے زاری تھی کہ حد نہیں۔" وہ بیٹے کو بے ساختہ چوم رہی تھیں۔
"میرے لیے کیا لائی ہیں بھابھی!" زمیلہ مطلب کی بات پر فوراً آ گئی تھی شاید اسے بھابھی کی طرف سے ملنے والے تحائف کی توقع تھی۔
"مجھے یقین تھا آپ خالی تو نہیں آسکتیں۔"
"میں تو پوری خالی ہو کر آ گئی ہوں زمیلہ۔" حریم کے آنسو بہنے کو بے تاب ہوئے۔
"لوگ تو سیر و سیاحت کے بعد اتنے فریش ہوتے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ نکھرتے ہیں مگر بھابھی کو کیا ہوا ہے۔ یہ تو پہلے سے بھی زیادہ بجھی بجھی لگ رہی ہیں۔" زمیلہ کے تبصرے نے حریم کا دل گویا مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ مزید بیٹھنا محال تھا۔ ایک ہاتھ سے ریلنگ تھامے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ بکھری، اداس، غمگین اور خالی خالی سی۔
راحت بیگم کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔
حریم کو یہ سیڑھیاں پل صراط کی مانند لگ رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بیڈ پر تقریباً ڈھے گئی تھی۔ اتنی سی مشقت نے سانسوں کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے پیاس کا احساس ہر

شے پر جا دی تھی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی مگر ٹیبل پر رکھا جگ خالی تھا۔ نیچے جاتے ماہیر کو آواز دینے کی ہمت نہیں تھی۔ ساہیر کے اوپر آنے کے امکان بھی کم نظر آرہے تھے۔ اتنے دن ماں سے دور رہا تھا۔ وہ اتنی جلدی تو اسے نہیں آنے دیں گی یہ یقین تو حریم کو تھا ہی۔ شاید آج کی رات وہ اوپر آتا ہی نہ۔ ماں کو صفائیاں دیتے ہوئے گزر جاتی یہ مشکل ترین اور بھاری رات۔ ان کی لعن طعن سنتے، غصہ سہتے، سخت کلامی برداشت کرتے ہوئے۔ حریم کو سب سے عذاب ناک بات یہ لگ رہی تھی کہ صبح وہ امی کا سامنا کیسے کر سکے گی۔ نجانے وہ کیا کیا سنائیں گی۔ جلی کٹی، دل دکھانے والی باتیں، زہر میں بجھے الفاظ۔

"دیکھ لیا نافرمانی کا انجام۔" اسے یوں لگا تھا، راحت بیگم تمسخر سے اسے دیکھ رہی ہیں۔

"منع کیا تھا نہ جاؤ مگر میری بات کو ہنسی میں اڑا دیا تھا۔" وہ غصے سے گویا پھنکار رہی تھیں۔

"سارا قصور اس حریم کا ہے۔ یہ ہی میرے بیٹے کو مجبور کرتی رہی ہو گی۔ آگ لگی تھی سیریں کرنے کی، بھگت لیا سڑکوں پر دندنانے کا انجام۔ میری بکواس پر تو دھیان دینا گناہ ہے۔ میں کچھ بھی بکتی رہوں، کسی کو بھلا کیا احساس، اتنا نقصان کر دیا ہمارا۔ بچے کی خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ آخری دیدار بھی نہ کیا پوتے کا۔ بہت منحوس ہے یہ حریم! جس دن سے اس گھر میں داخل ہوئی ہے، ہم مشکلات کے طوفان سے ہی نمٹتے رہے۔ جھک گئے میرے بیٹے کے کندھے۔ پہلے اوپر والے کمروں کا قرض اتارا، پھر شادی کے سلسلے میں لیے جانے والا لون تنخواہ میں سے کٹواتے رہے۔ اب اس کی بیماری بال بال قرض میں جکڑ دے گی۔ آپریشن ہوا، بچہ نہ رہا۔ ہمیں کسی نے بتایا نہیں۔ یہ ساری پٹیاں حریم کی ہیں۔ میرے بیٹے کے کان بھرتی رہی ہے اسے ہمارے خلاف بھڑکاتی رہی۔ میرے بیٹے نے ماں کو کچھ بتانا گوارا نہیں کیا۔ ایسی بھولی صورت اور ایسی ساری شیطانی۔

چلتر باز نے آگے پیچھے پھر کر [illegible] سمیٹ کر اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ میں تو اول روز سے ہی اس کی چالاکیوں کو جان گئی تھی۔ اسی لیے زیادہ سر نہیں چڑھایا میں نے۔ ہمیشہ ایک حد میں رکھا۔ کیا ضرورت تھی۔ سانپ کو دودھ پلانے کی، چومنے چاٹنے کی یہ ساری بہوئیں ایک جیسی ہوتی ہیں، خود غرض اور کمینی۔" راحت بیگم کا بنتا بگڑتا چہرہ شفاف دیوار پر اپنا عکس چھوڑ رہا تھا۔ کبھی مٹتا کبھی ابھرنے لگتا۔

"تمہارے نصیبوں میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ سوچا تھا پوتا ہو گا اس سے دل بہلایا کروں گی۔ بہو تو ایسی بے زبان ملی ہے، کبھی عید کے عید نہ بولی نہ مسکرائی۔ ہم تو گویا چھتی کی صورت اٹھا لائے ہیں۔ بے زار خاموش۔ ہر دم اداس نجانے کون کون سے غم جان کو لگا رکھے ہیں۔ ساس ہے نہیں، باپ بیمار، بھنوں کی پٹی لگتی ہے۔ شاید کسی سے دل لگا رکھا ہو گا۔ کبھی تو ایک دن ہم نے اسے مسرور نہیں دیکھا۔ ایسے بھی کیا ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں ہم۔ گھر کے کام کاج کرتے ہوئے صورت پر مسکنیت طاری ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں ہر وقت آنسو جمع۔ سب چالاکیاں ہیں۔ یہ داؤ پیچ ہم پر آزمانے کی ضرورت نہیں، بہو! ہم [illegible] مکاریوں کو جانتے ہیں یہ منافقت ہمیں [illegible] منہ پر میٹھے بنے رہے، پشت پر [illegible] باتوں سے ہمارے احمق بیٹے کو [illegible] بہلاؤ۔ اسے باتوں سے بہلا سکتی ہو [illegible] جیت سکتی ہو۔ میں ساری مکاریاں جانتی ہوں۔ ان خطروں، غد متوں سے تم مجھے [illegible] نہیں پاؤ گی۔ میں تمہارے دام میں [illegible] اور پہ آزمانا۔ یہ ڈھونگ کہیں اور جا کر رچانا۔ یہ ڈرامے کسی اور کو دکھانا۔ ہم نے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ تجربہ ہے ایک عمر کا۔ اب اس آپریشن کے بہانے بستر توڑنے کی ضرورت نہیں۔ مگر کون سا پیدل کر کے آئی ہو۔ دیکھ بھی لیا ہے، مہمان آئے تھے۔ میز اور کچن میں برتنوں کے انبار لگے ہیں۔ ہر شے ٹپ پڑی ہے۔ بیگم صاحبہ اگر آرام فرمانے لگی ہو۔ کیا ہسپتال میں پہاڑ کاٹتی رہی ہو۔ ادھر بھی تو اتنے دن آرام ہی کیا ہے۔ اٹھو بستر سے۔ کچن میں جاؤ صفائی کرو۔ برتن دھو کر رکھو۔ اپنی گھر ہستی سنبھالو۔ اتنے دن آرام کر لیا، یہی کافی ہے۔ ہم کب تک بوڑھی ہڈیوں کو گھسیٹتے رہیں۔ اٹھ بھی چکو۔" وہ گویا دیوار سے نکل کر یکدم دھاڑی تھیں۔ حریم کے لب سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ خوف اور دہشت سے اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ شدید سردی کے باعث یا پھر خوف کی شدت سے اس کے دانت بجنے لگے۔

وہ سسکاریاں بھر بھر کے رونے لگی تھی۔ جب ہولے سے کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ حریم نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت درد کی انتہائی منزل سے گزر رہی تھی۔ حریم چونکی تو تب، اپنے کندھے پر نرم ہاتھ کا دباؤ جب محسوس کیا۔ کوئی اس کے قریب بیٹھ رہا تھا۔ دھند کے پار کا منظر بھی دھندلا تھا مگر اس دھندلے منظر کے پار ایک عکس شفقت کا مجسم نظر آرہا تھا۔

"اتنا کچھ ہو گیا۔ ہمیں بتایا نہیں، خود ہی تکلیف سہتی رہیں۔" نرم آواز، نرم سا یہ لہجہ، حریم حیران پریشان راحت بیگم کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں کو دیکھتی رہی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ رہی تھیں۔

"اسی لیے میرا دل گھبرا رہا تھا۔ کئی دفعہ فون کیا تھا ماہیر کے موبائل پر، کمپیوٹر والی ایک ہی جواب دیتی کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ مجھے کیا خبر میرے بچوں پر کیسی قیامت بیت رہی ہے۔" کندھے سے پھسلتا ان کا ہاتھ حریم کے سر پر آٹھہرا تھا۔

"ماہیر بتا رہا تھا۔ آپریشن ہوا ہے۔ خالی گود لے کر اٹھی۔" ان کے آنسو اب گالوں پر پھسل رہے تھے۔

"تمہارے نصیب میں یہ صدمہ سہنا لکھا تھا۔ ورنہ کیا کیا ارمان تھے بچے کے متعلق۔" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ حریم بھی بے آواز روتی رہی۔

"رونا نہیں۔" انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔

"[illegible] چلے میں کچی ہوتی ہیں۔ آنسو مت بہاؤ، نظر بھی [illegible]۔ اخبار وغیرہ پڑھنے نہ بیٹھ جانا۔ آنکھوں پر [illegible] پڑے گا۔" وہ پیار سے نرمی سے سمجھا [illegible]

"مجھے اس حادثے کی خبر ہوتی تو زبردستی تمہیں روک لیتی۔ جانے ہی نہ دیتی۔ میں نے بھی سوچا کہ ابھی تو کافی وقت پڑا ہے۔ عورتیں اس حالت میں نوکریاں کرتی ہیں۔ بھرے پرے کنبے بھگتاتی ہیں۔ بیرون ملک تک سفر کرتی ہیں۔ اسی لیے خاموش ہو گئی۔ سوچا، بچوں کی خوشی ہے۔ روڑے کیوں اٹکاؤں۔ تمہاری خالہ کے بھی اتنے فون آئے تھے۔ بصد اصرار بلا رہی تھی۔" ان کے چہرے پر دکھ کے اثرات بہت گہرے تھے۔

"ماہیر بھی بہت پریشان ہے۔ اتنے دن اکیلا خوار ہوتا رہا ہے۔ ادھر مولی کو بھی پرسوں بہت شدید دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال لے جانا پڑا۔ میرے اور زمیلہ کے تو قابو میں نہیں آرہا تھا۔ شکر ہے۔ فیفا اور نفیسہ آئی ہوئی تھیں۔ فیفا کی کوششوں سے مولی کو ہسپتال لے گئے۔ پھر سے ٹیسٹ، ڈاکٹر کی فیس، دوائیاں، اتنا لمبا چوڑا بل فیفا نے چکایا ہے۔ ادھار تو ادھار ہی ہوتا ہے۔ ماہیر کو اس لیے نہیں بتایا وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ تھکا ہوا ہے۔ ایک نئی ٹینشن آتے ساتھ سونپنے کو دل نہیں مانا میرا۔" ان کا ہاتھ اب حریم کے ہاتھ پر تھا۔ محبت کے دو بول، نرم لہجے، نرم الفاظ دلوں پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ حریم ان کی اس توجہ، ملائمت اور نرمی سے اور بھی پگھلنے لگی۔

"اب مولی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"پہلے سے کچھ بہتر ہے۔" ان کے لہجے میں واضح یاسیت تھی۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"جھوٹی تسلیاں، فضول کے دلاسے۔ مجھے پتا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ اس کے دماغ میں شاید رسولی ہے۔ ڈاکٹر آپریشن نہیں کرتے۔ ویسے بھی اپنی عمر کے بچوں سے اس کا ذہن بہت پیچھے ہے۔" وہ گویا بالکل نا

امید ہو چکی تھیں۔ حالانکہ اس کا ذہن بہت پیچھے نہیں بہت آگے تھا۔
"بیرون ملک تو علاج ممکن ہے۔" اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ ایک دم ہی مولی کی تکلیف کا احساس ہر شے پر حاوی ہو گیا۔
"عالم نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کیا' علاج کروایا مگر دماغ کی نشوونما نہیں ہو سکی۔" وہ رنجیدگی سے بولی تھیں۔ نہ جانے کس کیفیت کے زیر اثر وہ مولی کی بیماری جیسے حساس موضوع پر گفتگو کرنے لگی تھیں۔ اس سے پہلے تو کوئی بھی اگر مولی کی بیماری کے متعلق کسی مشورے سے نوازنا چاہتا تو راحت بیگم غصے سے بھر جاتی تھیں۔ انہیں شاید یہ محسوس ہوتا تھا کہ مولی کی بیماری کا ذکر لوگ چٹخارے لینے کے لیے یا ان کے زخم ادھیڑنے کے شوق میں کرتے ہیں۔ بہرحال جو بھی تھا' وہ کسی کو مولی کے متعلق گفتگو کرنے نہیں دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ راحت بیگم کے سامنے بابا بھی مولی کا حال احوال پوچھنے سے گریز برتتے تھے۔
"مگر ابراڈ میں آپریشن تو ممکن ہے۔ دورے کی حالت میں مولی جس ذہنی کرب اور درد سے گزرتا ہے۔ آپریشن کے بعد اس درد سے تو نجات مل جائے گی۔" حریم نے نرم آواز میں ہمدردی سے کہا۔
"ہوا یہ گھر زیور حتیٰ کہ ماہیر کی موٹر سائیکل بھی بیچ دی جائے تب بھی مولی کا آپریشن ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہاں کے ڈاکٹر رسک لینا نہیں چاہتے۔ اور باہر کا خرچہ ہماری بساط سے بڑھ کر ہے۔" بیٹے کی تکلیف نے ان کی آنکھوں کو پھر سے بھگو ڈالا تھا۔
"چلتی ہوں۔ تم اب آرام کرو۔ زیادہ بولنا مت' نیچے آنے جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر نے جتنی احتیاط بتائی ہے' جس قدر پرہیز کیا ہے اتنا ہی کرنا۔ کام تو ہوتے رہیں گے۔ جان ہے تو جہاں ہے۔ تمہارے لیے یخنی بنوا کر بھیجتی ہوں۔ ماہیر بتا رہا تھا صبح سے بھوکی ہو۔ کچھ دیر سو جاؤ۔" وہ اسے آرام کی تلقین کرتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ حریم [illegible] تک
اس کا پلٹ پر حیران تھی ششدر تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ابھی اتنی دیر اس کے پاس بیٹھی رہی ہیں۔ باتیں کرتی رہی ہیں۔ تسلی کے پھاہے رستے زخموں پر رکھتی رہی ہیں۔
اسے یوں لگ رہا تھا' اسلام آباد جانا اس کے لیے مبارک ثابت ہوا ہے۔ اسے رونا بھی آرہا تھا بے تحاشا رونا اور ہنسی بھی بکھر رہی تھی۔ کچھ صدمہ تھا' کچھ خوشی تھی بھلا کس مقام پر وہ لفظوں کی زبانیں بکھیرنے لگی تھی۔ تب جب دل حد سے زیادہ رنجیدہ تھا' افسردہ تھا' راحت بیگم کی اس محبت بھری توجہ پر پورے دل سے خوش ہونے سے لاچار تھا' بے بس تھا۔ بھرا بھرا تھا۔ غم سے لبریز تھا۔ اس تسلی نے اس توجہ نے اس محبت نے اور بھی آزردہ کر دیا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ تمام پریشانیوں کو جھٹکنے لگی تھی۔ کچھ دیر پرسکون نیند لینا چاہتی تھی۔
اسے یوں محسوس ہوا تھا باہر ہلکا سا کھٹکا ہوا ہے۔ شاید ماہیر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ماہیر اور راحت بیگم کے بولنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ بہت سناٹا ہونے کی وجہ سے حریم کی سماعتوں میں ان کے چند الفاظ پڑے۔
"بچہ بالکل ٹھیک تھا ماہیر' [illegible] کی کوشش نہ کرنا۔" ان کی آواز میں [illegible]
"بالکل صحت مند تھا۔ خوبصورت' اعضاء بھی مکمل تھے۔ تندرست بچہ تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی اگر آپریشن بروقت ہو جاتا تو بچے کو بھی بچایا جا سکتا تھا۔" ماہیر کی آواز میں بے پناہ افسردگی تھی۔
"بالکل صحت مند۔" نہ جانے وہ کیسی یقین دہانی چاہتی تھیں۔
"جی امی۔"
"کوئی کمی تو نہیں تھی۔" عجیب سی سرسراتی آواز راحت بیگم کے لبوں سے نکلی۔
"نہیں۔" ماہیر کے لہجے میں سچائی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے۔" وہ گویا مطمئن ہو گئی تھیں۔

حریم کو اس اطمینان اور "شکر" کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تاہم اس کا ذہن اب غنودگی کی طرف محو پرواز تھا۔ کچھ پل بعد وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

✿ ✿ ✿

وقت نے گویا اداسی کی پازیبیں پہن لی تھیں۔ دن گزرنے کا نام ہی نہ لیتا۔ راحت بیگم نے اس کے نیچے اترنے پر پابندی لگا دی تھی۔ ناشتا' کھانا اوپر پہنچا دیا جاتا۔ ٹوکری بھر کر مختلف پھلوں کی ماہیر کے ہاتھ بھجوا دی جاتی۔ زمیلہ بھی کبھی سوپ وغیرہ بنا کر بھی دے جاتی تھی۔ حریم کو [illegible] اور بھی بے زار اور اکتاہٹ کا شکار [illegible] اوپر والے حصے کی صفائی ستھرائی [illegible] تھی۔ ماہیر کے کپڑے بھی دھو [illegible] استری بھی کر لیتی۔ پھر آہستہ آہستہ دھلے ہوئے کپڑوں کی بڑی سی گٹھری اٹھا کر اوپر بھجوائی جانے لگی تھی۔
اس دن بھی صبح صبح زمیلہ ایک بھاری سی گٹھری اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔
"بھابھی! انہیں استری کر دیں۔ میں ہنڈیا کو چولہے پر چڑھا کر آئی ہوں۔" زمیلہ قدرے نرمی سے بولی۔ چہرے پر کچھ خجالت کے تاثرات بھی تھے۔
"ادھر رکھ دو۔" حریم استری اسٹینڈ کے پاس کھڑی تھی۔ نہ جانے کتنے ہفتوں کے کپڑے پھر سے جمع ہو گئے تھے۔ حریم کو گول گول چکر آنے لگے۔ گٹھری کو کھول کر دیکھا تو زیادہ کپڑے مولی کے نظر آئے وہ گہری سانس کھینچ کر کپڑے پریس کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے حانی سے فون پر بات کی تھی۔ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کو مختصر الفاظ میں بتا دیا تھا۔ دوسری طرف حانی کیسے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس نے حانی سے وعدہ لینا چاہا تھا کہ بابا کو کچھ بھی نہ بتائے۔
"کوئی بھی خوشی مکمل کیوں نہیں ملتی۔ اتنا ادھورا پن کیوں ہے ہماری زندگیوں میں۔" حانی کے آنسو اس کے دل پر گرنے لگے تھے۔ ابھی تک حانی کی سسکیاں کانوں میں گونج رہی تھیں۔
"میں نے سوچ رکھا تھا تمہارا بچہ میں لے لوں گی۔ اسے خود پالوں گی۔ نہلاؤں گی' دھلاؤں گی' کھلاؤں گی۔ [illegible] پیاری مصروفیت مجھے مل جاتی تھی مگر۔" وہ [illegible] تھی۔
"کتنا انتظار تھا مجھے 'خالہ بننے کا۔"
"پلیز حانی' رو مت۔ ورنہ میں بھی دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دوں گی۔" حریم بار بار التجا کر رہی تھی۔
"حریم! اچھا تو تھا کیسا تھا میرا بھانجا۔ ماہیر بھائی جیسا تھا کیا؟" حانی آنسو پونچھتے ہوئے اشتیاق سے بولی۔
"ماہیر جیسا تھا۔ خالہ بھی کہہ رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا گویا چینی کا گڈا۔" حریم کی آنکھوں میں رنگ اتر آئے۔ ملہرے۔ سرخ گلابی نیلے۔
"آنکھیں بھی بھوری تھیں کیا؟" حانی گویا بچے کا ایک ایک نقش چشم تصور سے دیکھنا چاہتی تھی۔
"پتا نہیں۔" اذیت کی ایک تیز لہر من میں اتر آئی تھی۔
"کیوں تم نے نہیں دیکھا۔" حانی خفگی سے بولی۔
"نہیں۔"
"اچھا۔" حانی کو بہن کے دل دکھنے کا خیال آیا تو چپ کر گئی۔
"تم ادھر آجاؤ' وہاں کون تمہارا خیال رکھتا ہو گا۔" کچھ دیر بعد ٹوٹے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"میں یہاں ٹھیک ہوں۔ امی کا رویہ پہلے سے بہتر ہے۔"
"مقام حیرت۔" حانی خوش دلی سے مسکرائی۔ کئی دنوں کی جمع شدہ باتوں میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ بہن سے دل کا بوجھ ہلکا کر کے وہ قدرے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ ابھی بھی حانی کی باتیں یاد کر کے اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ کپڑوں کی دو اونچی اونچی تہیں استری ہو چکی تھیں۔ اسی پل راحت بیگم بولتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔
"یہ کیا کر رہی ہو' چھوڑو انہیں۔" انہوں نے ڈپٹ

کر اس کے ہاتھ سے شرٹ کھینچی۔

"نفیسہ اوپر آ رہی ہے کیا سوچے گی۔ پچھلے تک بہو کو آرام نہیں دے سکی میں۔" انہوں نے پھرتی کے ساتھ کپڑے سمیٹ دیے تھے۔ کچھ دیر بعد فیفا اور پھوپھو کمرے میں داخل ہوئیں۔ پھوپھو نے اس کا ماتھا چوم کر گلے لگایا تھا۔ حریم بے آواز رونے لگی تھی۔ فیفا کے تاثرات بھی اداس تھے۔ پھوپھو اور امی اسے رونے سے منع کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد زمیلہ چائے لے آئی۔

"زمیلہ! تمہاری اچھی بریڈ ہو رہی ہے۔" فیفا نے ماحول پر چھائی کثافت کے اثر کو زائل کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"سسرال میں جا کر آسانی رہے گی۔"

"بھابھی نے کچن کا سارا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ مجھے تو چائے، چینی ڈھونڈنے میں بھی گھنٹہ بھر لگ جاتا ہے۔"

"ماشاءاللہ سے حریم دس بیس لوگوں کا کھانا با آسانی پکا سکتی ہے۔" راحت بیگم نے تعریفی نظروں سے بھتیجی سی حریم کو دیکھ کر کہا۔

"پہلے فیفا نے بہت سکھ دیا ہے مجھے تو اب حریم بہت خیال رکھتی ہے۔"

"اور محبت آپ کو پھر بھی زیادہ زمیلہ سے ہے۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے امی جان!" فیفا نے غیر محسوس طریقے سے طنز کیا تھا۔ راحت بیگم کچھ کھسیانی سی ہو گئیں۔ پھوپھو نے فیفا کو گھور کر گویا تنبیہ کی تھی۔

"بکواس مت کرو۔"

"زمیلہ! آج کل چہرے پر کیا لگا رہی ہو؟" فیفا نے فوراً موضوع بدل دیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" زمیلہ مکر گئی۔

"اب جھوٹ تو نہ بولو۔" فیفا کو قطعاً یقین نہیں آیا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔" زمیلہ جز بز ہو گئی۔

"فضول کریمیں یوز کرنے سے [illegible] ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے ایسی [illegible] کرنے [illegible]"

"تو کچھ تیاری شروع کی ہے۔" پھوپھو امی کی طرف متوجہ تھیں۔

"ابھی کہاں؟" امی کے تاثرات یکدم سپاٹ ہو گئے۔

"حریم کی صحت بہتر ہوگی تو دیکھیں گے۔ ابھی تو ماہیر کو دو گھڑی کی فرصت نہیں۔ صبح کا گیا شام کو لوٹتا ہے اوپر سے دفتری کام بھی گھر میں اٹھا لاتا ہے۔"

"خیر سے حریم صحت مند ہو گئی تو آپ کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"تو اور کیا۔" امی فوراً متفق ہو گئیں۔

"کپڑے تک سلائی کر لیتی ہے۔" امی کے انداز میں فخر تھا۔

"بھابھی جیسی سلائی اور ڈیزائننگ تو ماہر ٹیلر بھی نہیں کر سکتے۔" زمیلہ نے کچھ دیر پہلے والا بدلہ شاید اتارا تھا۔ فیفا دھیمے سے مسکرا دی۔ زمیلہ جانتی تھی فیفا کو سلائی کڑھائی سرے سے نہیں آتی۔

"تم بھی کسی کی بھابھی بننے والی ہو۔ کچھ ہنر تم نے بھی سیکھ لیے تھے۔" فیفا نے مسکرا کر پھر سے طنز کا تیر پھینکا۔

"کل کو تمہاری نند بھی سیم انہی الفاظ میں [illegible] تعریف کرتی تو امی جان تفاخر سے [illegible] تھیں۔" درپردہ فیفا نے زمیلہ کی [illegible] عادت کو نشانہ بنایا تھا۔ زمیلہ کا منہ [illegible]

"مجھ سے نہیں [illegible] تیں۔" زمیلہ ناگواری سے بولی۔

"[illegible] چھپاتی ہے۔"

"[illegible] نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"[illegible] کس کا اتنا خیال ہے۔"

"[illegible] تو ہوتا ہے۔" زمیلہ کو غصہ آنے لگا تھا۔

"بعض لوگ کچھ زیادہ حسن صحت کے بارے میں کانشس رہتے ہیں۔"

"ہونا بھی چاہیے۔" زمیلہ اب برتن اٹھا کر باہر نکلنے لگی تھی۔ شاید فیفا کی طنزیہ گفتگو سے بچنے کے لیے۔

پھوپھو اور فیفا کے جانے کے بعد برتن سنک میں پٹختے ہوئے زمیلہ اونچی آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔

"بہت اچھا کیا ہے اس "چلتر" کا رشتہ نہیں لیا۔ ہمیں تو دو دن میں اس "مکارن" نے دیوار سے چپکا دینا تھا۔"

☼ ☼ ☼

خالہ تقریباً روزانہ فون کر کے اس کی خیریت پوچھتی تھیں۔ آج صبح بھی خالہ کا فون آیا تو وہ کچھ پرجوش سی تھیں۔ اس کا حال احوال پوچھنے کے بعد بولیں۔

"حانی کے لیے میں نے ایک رشتہ دیکھا ہے۔"

"اچھا۔" اسے خوش گوار حیرت نے گھیرا۔

"کیسا ہے لڑکا کیا کرتا ہے؟"

"رشتہ بہت اچھا ہے۔ ذرا تحمل سے میری بات سننا۔" خالہ کے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی در آئی۔

"حانی خوب صورت ہے، گریجویٹ ہے۔ مگر ایک کمی تو بہرحال "لنگ" حقیقت کی مانند موجود ہے۔ سارے گن آتے ہیں گھرداری میں طاق ہے" سگھڑاپے میں اس کی مثال نہیں ملتی مگر۔" وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔ پھر بولیں تو لہجے میں بلا کا ٹھہراؤ تھا۔ حریم بہت سنجیدگی سے ان کی بات سننے لگی۔

"لڑکا کہنا تو مناسب نہیں ہوگا۔ پینتالیس، چھیالیس کے لگ بھگ عمر ہوگی احسان حسن کی۔ یا پھر اس سے بھی ایک دو سال آگے۔ تعلیم یافتہ ہیں، اپنا اسکول ہے فقط اسٹینڈرڈ تک۔ والدین حیات نہیں۔ بہن بھائی سب اپنے گھربار والے ہیں۔ مناسب وقت میں شادی ہوئی ہوتی تو ان کی بیٹی بھی شاید ہماری حانی کے برابر ہوتی۔ اگرچہ حانی عمر میں ان سے بہت چھوٹی ہے تاہم مجھے احسان حسن سے زیادہ بہتر رشتہ کوئی اور نہیں لگا۔ پنڈی میں رہائش ہے۔ ذاتی مکان ہے۔ بہت سادہ مزاج کے شریف اور عزت دار آدمی ہیں۔ بچپن میں ایک حادثے کی وجہ سے ان کی دائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ پتھری آنکھ سے نظر تو نہیں آتا البتہ دیکھنے میں عیب اتنا ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی "عیب" کو "وجہ" بنا کر لوگوں نے ان جیسے نفیس اور شریف آدمی کو ریجیکٹ کر دیا تھا سو وہ اپنی ذات میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہن بھائیوں کی اپنی زندگیاں ہیں۔ مصروفیات ہیں۔ بڑے بھائی کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں۔ میری ایک کولیگ نے ذکر کیا تھا۔ سو میں خود احسان حسن سے ملنے چلی گئی۔ شکل و صورت بھی عام سی ہے۔ سانولی رنگت، درمیانہ ساقد۔ عام سے نقوش، تاہم صحت بہت اچھی ہے۔ تم بھائی صاحب سے اور جنت بوا سے اچھی طرح مشورہ کر کے مجھے بتا دینا۔"

"آپ نے انہیں حانی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔" خالہ کے خاموش ہوتے ہی حریم بے چینی سے بولی۔

"ہاں، تو اور کیا۔ مجھے کچھ چھپانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔"

"انہیں حانی کی معذوری پر کوئی اعتراض تو نہیں۔" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں۔ بلکہ وہ تو کہہ رہے تھے۔ یہ ان کے لیے عین سعادت کا مقام ہے کہ وہ کسی بے سہارا کا سہارا بنیں گے۔" خالہ اس کی پریشانی کی وجہ جانتی تھیں۔

"جب تم صحت مند ہو جاؤ تو پھر ماہیر کے ساتھ اک نظر احسان حسن کو دیکھ جانا۔ اگر تم دونوں کا دل مانا تو پھر بات آگے بڑھائیں گے۔"

"ہوں۔" حریم نے محض ہنکارا بھرا۔

"احسان حسن خود بھی تو کسی سہارے کے متلاشی ہیں۔"

"میں بابا اور بوا سے مشورہ کر لوں۔" حریم کچھ سوچ کر بولی۔

"کیوں نہیں۔ تم حانی سے بھی تفصیلاً بات کرنا۔ بہرحال حانی کی رضامندی سب سے زیادہ ضروری ہے۔" خالہ نے نرمی سے کہا۔

"آپ کو کب تک جواب چاہیے۔"

"بیٹے! اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ اس سال تو احسان حسن حج کرنے جارہے ہیں۔ ان کی واپسی کے بعد مزید کارروائی کی جائے گی۔ اتنی دیر میں ہم مزید چھان بین کرلیں گے کیا خیال ہے؟" خالہ کی دور اندیشی کی حریم پہلے بھی قائل تھی۔ فوراً "متفق ہو گئی۔

"یہ زیادہ بہتر ہے۔ سوچنے کے لیے اچھا وقت مل جائے گا۔"

"اچھا' یہ محب سے بات کرلو۔ کب سے ترلے منتیں کررہا ہے۔ آپی سے بات کروادوں۔" خالہ نے شاید بے قراری سے محب کے کندھے پر ایک دھپ لگائی تھی۔

"آپی! ہماری یاد بھی نہیں آتی۔ بھول چکی ہیں ہمیں۔" اس نے ریسیور پکڑتے ہی شکوے شکایات کا دفتر کھول لیا۔

"اپنے پیاروں کو یاد کرنے کے لیے وقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمہ وقت سوچوں میں رہنے والوں کو کیا یاد کرنا۔" وہ ملائمت سے اس کا شکوہ دور کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

"آپی!" محب شرارت سے کھنکارا۔

"میں ماہیر بھائی نہیں ہوں۔"

"بدتمیز۔" حریم ہنس پڑی۔

"ماہیر بھائی سے بھی ایسے ڈائیلاگ بولتی ہیں۔"

وہ بکی سہیلیوں کی طرح پوچھ رہا تھا۔

"جی نہیں؟" وہ ناراض ہوئی۔

"ان کے لیے ڈائیلاگز کا بھلا سہارا کیوں لینا ہے۔ یہ تو ہم بے چاروں کے دل رکھنے کے لیے بولے جاتے ہیں۔" اس نے جھوٹ موٹ کی خود پر رنجیدگی طاری کی۔

"بکو نہیں۔" وہ ہنس ہنس کر بے حال ہوگئی۔

"مہک کہاں ہے؟"

"کالج جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے۔ آپ کے بغیر تو یہ کالج کرکر خود کو 'بیچہ' سمجھتی ہیں۔" "یقیناً" مہک کو بھی چڑایا جارہا تھا۔

"آپی! اس 'بکواسی' کی باتوں پر یقین مت کرنا۔"

مہک ریسیور کے قریب منہ کرکے چلائی۔

"ٹھیک ہے میری بہنا!" حریم نے اسی کے انداز میں مہک کو تسلی دی۔

"مجھے قطعاً "یقین نہیں آیا۔"

"آپی! اسکیٹوں اور "شریفوں" کا سلام بھی قبول کرلو۔" ریسیور اب محسن کے ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔ ان کی نوک جھوک نے حریم کو بے تحاشا ہنسنے پر مجبور کردیا تھا۔ صبح صبح طبیعت ایک دم فریش ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسی شام کی بات ہے۔ لمبی سی چمکتی دمکتی گاڑی گیٹ پر آرکی تھی۔ زمیلہ نے جلدی سے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ زمیلہ کے خیال میں شاید اس کے سسرال والے آئے تھے مگر گاڑی میں سے نکلتی جنت بوا کو دیکھ کر زمیلہ حیران رہ گئی تھی بوا' حانی کی وہیل چیئر نکال رہی تھیں جو کہ فولڈ کرکے ڈرائیور نے ڈگی میں رکھ دی تھی۔ حریم کے بابا اور حانی کو دیکھ کر وہ جلدی سے حریم کو اطلاع دینے کی غرض سے بھاگی۔

"بھابھی! آپ کے میکے والے آئے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" حریم کو گویا کسی نے قارون [illegible] دینے کا سندیسہ دیا تھا۔ وہ خوشی سے [illegible] دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر [illegible] حانی اور بوا مٹھائی اور پھلوں کے [illegible] آئے تھے۔

حریم بابا کے سینے سے [illegible] رو پڑی۔ حانی آنسو پی رہی تھی [illegible] کے پلو سے آنکھیں خشک کررہی [illegible]

وہ [illegible] میں ہی بیٹھ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد حریم کو ان کی خاطر و مدارت کا خیال آیا تھا۔ کیونکہ زمیلہ تو بالکل تیار بیٹھی تھی آج اس نے اپنی نند کی سالگرہ میں شرکت کرنے جانا تھا۔ کچھ دیر بعد زمیلہ کے دیور اسے لینے کے لیے آگئے تھے اور وہ رسمی سی معذرت کرکے چلتی بنی تھی۔ حریم چپکے سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

ماہیر آگیا تھا۔ بابا' امی اور ماہیر باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ حانی نے بھی غیر محسوس طریقے سے وہیل چیئر کا رخ موڑ لیا تھا۔ وہ حریم کے پاس کچن میں آگئی تھی۔

"ہمارے لیے تکلف مت کرنا۔"

"کیوں۔؟" حریم خوشدلی سے بولی۔

"ہم لوگ مہمان تو نہیں۔"

"اپنوں کو کیا سوکھے منہ رخصت کردیا جاتا ہے۔" حریم کیبنٹ کھول کر نمکو' بسکٹ وغیرہ نکال رہی تھی۔

"تمہاری سسرال کا تو یہی رواج لگتا ہے۔" حانی کو شاید زمیلہ کا جانا غیر مناسب لگا تھا گھر میں مہمان آئے بیٹھے تھے اور اس نے ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔

"کبھی تم نے بھی [illegible] مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔" حانی کا لہجہ چبھا ہوا تھا۔

"نہیں۔" حریم سمجھ رہی تھی۔ مگر خاموش تھی' خاموش رہنے پر مجبور تھی۔

"کبھی ایسا کرکے دیکھنا تو سہی۔" حانی اسے اور زیادہ اکسا رہی تھی۔ وہ اسی طرح جذباتی تھی۔

"اس گھر سے نکلوانا ہے کیا؟" حریم نے افسردگی سے کہا۔

"اتنا کچا بندھن ہوتا ہے۔" حانی حیرانی سے پوچھنے لگی۔

"سمجھا جائے تو سب سے مضبوط' پائیدار۔ اگر نہ سمجھا جائے تو کچھ بھی نہیں ٹوٹنے پر آئے تو ایک جھٹکے سے ٹوٹ جائے۔ ورنہ بڑے بڑے طوفانوں سے بھی کوئی خطرہ نہیں۔" چائے کا پانی ابل چکا تھا حریم مختلف پلیٹوں میں فروٹ کاٹ کر رکھ رہی تھی۔ چائے سے پہلے اس نے فروٹ لاؤنج میں پہنچا دیا تھا۔ تبھی ماہیر کچن میں آگیا۔

"بازار سے کچھ منگوانا ہے؟"

"نہیں' ماہیر بھائی رہنے دیں۔" حانی بے ساختہ بولی۔

"تکلف کی ضرورت نہیں۔"

"منو! تم خاموش رہو۔ میں اپنی بیوی سے ہم کلام ہوں۔" ماہیر نے حانی کے سر پر چپت لگائی۔

"چائے کے ساتھ پکوڑے لاؤں۔"

"نمکو' بسکٹ اور [illegible] حانی تو ہے۔" حریم خود تذبذب کا شکار [illegible] ماہیر کچھ کہے پلٹ گیا تھا۔

"[illegible] ادھر دیکھو۔" حانی کا انداز سرگوشیانہ ہی نہیں [illegible] بھی تھا۔

"کیا ہے؟" وہ آنچ دھیمی کرکے پلٹ کر حانی کو دیکھنے لگی۔

"یہ رکھ لو زرجان بھیا نے تمہارے لیے دیے ہیں۔" حانی نے ایک اچھا خاصا بھاری لفافہ حریم کی طرف بڑھایا۔

"اس میں کیا ہے؟" حریم قدرے خوفزدہ سی پیچھے ہٹی۔

"سانپ نہیں ہے۔ کچھ رقم بھیجی ہے بھیا نے تمہارے لیے۔ انہیں تمہارے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر مل گئی تھی۔ تمہاری عیادت اور احوال پرسی کے لیے وہ اس لیے نہیں آئے کہ شاید کسی کو ناگوار گزرے۔" حانی نے دبی آواز میں بتایا۔

"پلیز حریم! رکھ لو یہ رقم تمہارے کام آجائے گی۔ بھیا کا دل بھی خوش ہو جائے گا۔ تم کب ان کے دیے گئے تحفوں کو قبول کرتی ہو۔ پلیز حریم! انکار مت کرنا۔ ان کا پہلے سے ٹوٹا دل اور بھی کرچی کرچی ہو جائے گا۔ کتنے اچھے ہیں زرجان بھیا! ہمارا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ ابھی گاڑی بھی بھیجی تھی کہ بابا ڈاکٹر کے پاس بھی ہو آئیں اور ہم لوگ تم سے بھی آسانی سے مل آئیں۔ ایسے لوگ تو بڑے انمول ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا احساس کرنے والے خیال رکھنے والے۔ بڑے ہی دیالو' فیاض' سخی۔" حانی کی آواز بھیگ گئی تھی۔

"یہ رقم اپنے زرجان بھیا کو واپس کردینا حانی! حریم کو خیرات نہیں چاہیے۔" وہ مضبوط لہجے میں کہتی ہوئی رخ موڑ گئی تھی۔

"اتنی کٹھور تو مت بنو حریم!" حانی تڑپ کر رہ گئی۔

"زرجان بھیا کے خلوص کو یوں بے مول تو نہ کرو۔"

"اپنے بھیا سے کہہ دینا۔ یہ خلوص کسی اور پر لٹائیں۔" حریم کی آواز میں پتھروں جیسی سختی تھی۔

"اس میں حرج کیا ہے۔" حالی نے غصے سے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گی حالی!" حریم نے اذیت سے اپنے لب کچل لیے۔

"میں کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔" حالی تلخی سے کہنے لگی۔

"تم سنگدل اور بے مروت ہو۔ ہمیشہ بھیا کے خلوص کو یوں ہی مٹی میں رول دیتی ہو۔ سب جانتے ہوئے بھی کہ بھیا کی "مہربانیوں" کی وجہ سے ہم پر کبھی بھی کوئی مشکل دور نہیں آیا۔"

"میں اس کے احسان اتارنے کے لیے، اس کی اچھائیوں کا سرٹیفکیٹ اپنے ماتھے پر سجالوں۔" وہ دبی آواز میں پھنکاری۔

"میری ذات اس کے ہر احسان سے بری الذمہ ہے۔"

"زمیلہ کی شادی کے سلسلے میں تمہیں رقم کی ضرورت پڑے گی۔ تب استعمال کرلینا۔ ماہیر بھائی کی پریشانیوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ان کا بوجھ تھوڑا کم ہوجائے گا۔" حالی نے آواز اور لہجہ نرم کرلیا تھا۔

"تم زرجان کو یہ رقم لوٹا دینا۔"

"وہی مرغی کی ایک ٹانگ۔" حالی کو پھر سے غصہ آگیا۔

"رکھو پیسے میں بھیا کو واپس نہیں کرسکتی۔"

"مگر حالی۔" حریم غصے کے عالم میں کچھ ترش الفاظ منہ سے نکالنے لگی تھی جب لاؤنج میں داخل ہوتے ماہیر کو دیکھ کر اس نے لفافہ جلدی سے حالی کے ہاتھ سے جھپٹ کر دراز میں ڈال دیا تھا۔ حالی قدرے پرسکون ہوگئی۔

"جلدی سے پلیٹوں میں نکال کر چائے لے آؤ۔ انکل تو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" ماہیر نے [illegible] شاپر سلیب پر رکھ کر حریم کے ہاتھ پاؤں پھلادیے۔ کیک، رول، ڈرم اسٹکس، پزا، [illegible] پلیٹوں میں نکالتے ہوئے حریم کی آنکھیں نم ہوگئی

تھیں۔ تشکر اور احسان کے احساس نے ماہیر کی قدر اور محبت کو اور بھی بڑھادیا تھا۔ احساس کے ان باتوں کا نام ہی محبت تھا۔

"بیٹے! یہ سب کیا ہے۔" بابا اور بوا دونوں خفا ہونے لگے۔

"ہم تم سے ملنے کے لیے، تمہیں دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔"

"مل بھی لیا ہے اور دیکھ بھی لیا ہے۔ حالی کو کچھ کھانے دیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔ [illegible]" حالی، حریم سے "جنگ" جیتنے کی وجہ سے ہلکی پھلکی ہوچکی تھی۔ تبھی خوب چہکنے لگی۔

"بھابھی! آپ کی صحت کیسی ہے؟" بابا، راحت بیگم کے بدلتے موڈ کو سمجھے بغیر نرمی سے پوچھنے لگے۔

"گزر رہی ہے بھائی صاحب!" انہوں نے بلا کی نحیف آواز میں کہا۔

"مولی کہاں ہے؟" حالی کو اچانک خیال آیا۔ راحت بیگم کی بیماریوں کی تفصیل سننے کا اس کا موڈ نہیں تھا۔

"سو رہا ہے۔" مہمانوں کے سامنے تو مولی کو باہر نکلنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔

"مولی کو کمرے میں زیادہ نہ رکھا کریں۔ [illegible] بیٹھے گا تو اس کے مزاج اور صحت پر [illegible]" حالی نصیحت کی پوٹلی کھول کر بیٹھ [illegible] حریم کے آنکھیں دکھانے پر [illegible] ہوگئی۔

ماہیر کے روکنے اور [illegible] کے اصرار کے باوجود بابا زری اور [illegible] گئے۔

"زرجان [illegible] واپس بھجوائی ہے۔"

"[illegible] ہے آپ کا زرجان!" راحت بیگم کے لہجے میں بلا کی چبھن تھی۔ بابا سمجھے بغیر سادگی سے بولے۔

"میرا اپنا بچہ ہے۔ اللہ اسے سکھی رکھے۔"

"اپنوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اپنے بیٹے بھی شاید اتنا خیال نہیں رکھ سکتے۔" ان کے لفظوں میں جو معنویت تھی وہ حریم اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابھی۔" بابا ان کے طنز سمجھے بغیر سہلا کر حریم کو پیار کرنے کے بعد باہر نکل گئے۔

"بات تو اپنا سمجھنے کی ہے آپا! رشتے رویوں سے "قرابت" کو ظاہر کرتے ہیں۔ کبھی کوئی کچھ بھی نہیں لگتا اور سائبان بن جاتا ہے۔ بالکل جنت بوا کی طرح کبھی کوئی بہت عزیز ہوتا ہے رگ جان سے قریب ہوتا ہے مگر اتنے فاصلے پر کہ ہاتھ بڑھانے سے بھی پاس نہیں آتا۔ میلوں کے فاصلے اور [illegible] کی دوریاں درمیان میں حائل ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے تو کہتی ہوں صرف محبت بانٹی جائے۔ [illegible] کی طرح، زرجان بھیا کی طرح اچھی یادیں [illegible] کے دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ [illegible] بھیائی "یاد" رکھنے کا حوصلہ رکھے گا۔" [illegible] فلسفہ بگھارتے [illegible] باہر نکل گئی۔

"جانے کیا الٹی فول بول گئی ہے۔" امی نے کچھ دیر سوچا تھا پھر شاید ٹرالی میں جوں کے توں رکھے لوازمات کو دیکھ کر حساب کتاب کرنے لگی تھیں کہ کتنے کا نقصان ہوا ہے۔

"میرا بیٹا تو احمق ہی رہا۔ بھلا تین افراد کے لیے اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ تاسف سے سوچتی ہوئی کچھ میں کباب ڈبو ڈبو کر کھانے لگیں۔

☆ ☆ ☆

چھلہ نہاتے ہی پہلے کی طرح تمام ذمہ داریاں حریم کے سر پر آپڑی تھیں۔ اوپر سے امی کا زیادہ تر عتاب بے چاری حریم پر نازل ہوتا۔ وجہ بھی نظر انداز کی جانے والی نہیں تھی۔ زمیلہ کی شادی کے دن قریب آرہے تھے۔ اور ادھر تیاریوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ ماہیر آفس روانہ ہوجاتا تھا۔ زمیلہ کی اپنی "حسن نکھارنے" کی مصروفیات تھیں۔ مولی ہمیشہ کی طرح کمرے میں بند رہتا تھا۔ یا سویا رہتا یا پھر کارٹون دیکھتا۔ اس صورت حال میں صرف امی کا غصہ سہنے کے لیے حریم ہی بچی تھی۔

وہ اندر باہر آتے جاتے تلملاتی رہتیں۔ اپنے ماضی کو یاد کرتیں۔ [illegible] وقت کی آسائشات کو سوچتیں۔ حریم کو [illegible] نہیں تھی ورنہ یہی جتادیتی کہ [illegible] کچھ سوچ کر "سیونگ" کرتی [illegible] اکلوتی بیٹی کے لیے بھی انہوں نے جہیز کے [illegible] دمڑی نہیں رکھی تھی مگر یہ تو صرف حریم کی بھول تھی۔ راحت بیگم نے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔

اس کی صحت پہلے سے بہت بہتر تھی اسی لیے گھر کے کام کاج با آسانی کرلیتی تھی اس وقت بھی امی کی قمیص کی تہ بائی کرکے وہ استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ امی کے کپڑے تہوں کی شکل میں اسٹینڈ پر پڑے تھے۔ زمیلہ کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ ماں کے کپڑے ہی ٹھکانے پر رکھ دیتی۔ ماہیر آفس سے آکر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ صرف چائے پی کر اوپر چلا گیا۔

موسم بدلتے ہی حبس اور گھٹن بڑھنے لگا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بے تحاشا گھٹن سے ایک دم دل گھبرانے لگا۔

"اس حبس میں بتیاں بجھائے لیٹے ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر ماہیر کے بازو کو آنکھوں سے ہٹایا۔

"ماہیر۔" حریم نے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔

"ہوں۔"

"کیا بات ہے۔" وہ کچھ پریشان ہوگئی تھی۔

"کون سی بات۔" ماہیر چونکا۔

"ماہیر!" حریم زچ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ پریشان ہیں۔"

"نہیں تو۔" وہ صاف مکر گیا۔

"آپ پریشان ہیں۔ اتنا میں جانتی ہوں شیئر نہیں کرنا چاہتے یہ بات اور ہے۔"

"تم نے کیسے جانا کہ میں پریشان ہوں۔" ماہیر لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"آپ کے دل کے سارے تار میرے دل کے تاروں کے ساتھ جڑے ہیں۔ ادھر ذرا سی بھی ہلچل ہو۔ مجھے پہلے خبر ہوجاتی ہے۔" حریم نے اس کے دل

کے مقام پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ماہیر نے نرمی سے اس کے نازک سپید ہاتھ کو تھاما چوما اور اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"کتنا اچھا دل ہے تمہارا۔ میرے دل کو شرمندہ نہیں کرتا۔" وہ کچھ پھیکے سے انداز میں بولا۔

"کیسی شرمندگی؟ میں کبھی نہیں ماہیر! کھل کر بتایئے نا۔" حریم نے ضدی لہجے میں پوچھا۔

"تم اصرار نہ کرو۔ یہ زیادہ بہتر نہیں۔"

"اگر آپ بتا دیں' یہ اس سے بھی زیادہ بہتر ہے تنہا بے چارے دل کو کیوں پریشان کرتے ہیں اس کے ہمراز کو بھی آواز دے لیں۔" حریم کا اشارہ بائیں پہلو میں دھڑکتے اپنے دل کی طرف تھا۔

"حریم!" وہ کچھ دیر تذبذب کا شکار رہا تھا۔ شاید وہ کہنے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔

"بتا دیں ماہیر! شاید آپ کی پریشانی میں کم کر سکوں۔"

"امی چاہتی ہیں۔ میں انکل سے قرض مانگوں۔ شادی کے دن قریب ہیں۔ اور تیاری کے نام پر خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔ زمیلہ کو یوں تو رخصت نہیں کرنا۔"

"بابا سے۔" حریم حیران ہی تو رہ گئی۔

"کیا سفید پوشی کا یہ بھرم ٹوٹ جائے گا۔" اس کے قدموں تلے سے گویا زمین کھسکنے لگی۔ راحت بیگم تو پہلے ہی جتاتی رہتی تھیں کہ اتنی وسیع و عریض کوٹھی میں غربت ناچ رہی تھی۔ بھوک دھمالیں ڈال رہی تھی۔ تمہارا باپ ٹٹ پونجیا افسر تھا۔ گورنمنٹ نے ریٹائر ہونے پر پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی۔ کہاں گئے ہیں' ریٹائرمنٹ کے لاکھوں روپے۔ حریم انہیں ہمیشہ کی طرح بتا نہیں سکی تھی کہ بابا نے ماں کی بیماری سے جنگ کرنے اور اس اینٹوں کی کوٹھی کو مکمل کرنے کے لیے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ باقی جو کچھ بچا تھا وہ حریم کی شادی کے لیے محفوظ کروا دیا گیا تھا۔ وہ بے چارے تو خود نجانے کیسے پینشن میں گزارا کرتے اگر زرجان ساتھ نہ دیتا تو پھر شاید۔

"اب امی کو بھلا کون سمجھائے۔ انکل کے اوپر مسائل کے دس

بیٹے کمانے والے ہیں۔ خود وہ بیمار ہیں۔ جانی کا الگ سے خرچہ ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں۔" ماہیر نے خود ہی اس کی تمام تر مشکل آسان کر دی تھی۔

"پھر آپ نے کیا سوچا ہے۔"

"اللہ بہتر وسیلہ بنانے والا ہے۔ مجھے اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے۔" وہ واقعی پرامید تھا۔

"میں تو خود اکثر سوچتی ہوں۔ کیسے زمیلہ کے لیے فرنیچر' کراکری اور الیکٹرونکس کا سامان جمع ہو گا۔"

"میری جان! یہ تمہارے سوچنے کے مسئلے نہیں۔ یہ فکریں ہمارے لیے رہنے دو۔ سوچنا ہے تو صرف میرے بارے میں سوچا کرو۔" وہ نرمی سے اس کے بالوں میں لگے کلپ کو اتار کر بولا۔ بالوں کی آبشار نے گویا پوری پشت کو ڈھانپ لیا تھا۔

"آپ کو سوچنے کے علاوہ تو حریم کے پاس دنیا کا اور کوئی کام نہیں۔" وہ خوشدلی سے مسکرائی۔ بڑے دنوں بعد تو ایسی فرصت نصیب ہوئی تھی۔

"تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں۔"

"صرف بال۔" حریم نے آنکھیں پھیلائیں۔

"پوری حریم بہت خوف صورت ہے۔" ماہیر کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ پہلے تو حریم نے بات پر دھیان نہیں دیا تھا جب غور کیا تو خفگی سے رخ موڑ گئی۔

"اب "خوف صورت" لگنے لگی ہوں۔"

"ارے کہاں۔" اس نے ... اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا ماہیر نے ... سے لگا لیا۔

"تم تو خوشی ہو' انبساط ہو' نشاط ہو' بقراط ہو اور کیا کہوں۔"

"... ماہیر!" وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"... مسئلہ چٹکیوں میں اڑا دیا ہے۔"

"وقت کی بے رحم تیز تیز چلتی مشین سے کچھ لمحے زبردستی چھیننے پڑتے ہیں۔ زندگی مشکلوں اور پریشانیوں میں ضائع کرنے والی چیز نہیں۔"

"زندگی بے کار میں بیٹھ کر محبت کے گیت الاپنے کا نام بھی نہیں۔" اس نے جان بوجھ کر ماہیر کو چھیڑا۔ وہ

اس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیر رہی تھی ایک سکون کی لہر تھی جو ماہیر کو مسرور کیے دے رہی تھی۔

"ہائے' یہ ناز' یہ نخرے' نزاکتیں' ادائیں۔ میرا دم نہ نکل جائے حریم۔" ماہیر نے دہائی دی۔

"آپ کی محبت ریشم کی ڈوروں کی پچھی جیسی ہے' ابھی ہنسی کبھی رنگ بدلتی' کبھی نرم ہوتی کبھی گرم اور کبھی بالکل سرد۔" وہ پچھلے بہت سے دنوں میں ماہیر کی بے رخی کا شکوہ کر رہی تھی۔

"یقین جانو' آفس کا اتنا ڈھیروں کام جمع تھا اور ایک خوشخبری یہ بھی ہے کہ میری پروموشن عنقریب ہونے والی ہے۔ اسی لیے زیادہ محنت اور لگن سے کام کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" حریم خوشی سے کھنکتے لہجے میں بولی۔

"پروموشن ہو گی تو سیلری اور بھی بڑھے گی۔ ہماری بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔"

"ہوں۔" حریم کے روشن چہرے نے اس کی تمام ... دی تھی۔

"ترقی کے ساتھ جاب کو مزید "وقت" بھی دینا پڑے گا۔ مگر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا وقت تمہیں پوری ایمانداری سے ملے گا البتہ مجھ مسکین کی باری پر ہر دفعہ ہری جھنڈی دکھاتی ہو۔" وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

"آپ کے یہ شکوے کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔" حریم کے گالوں پر شفق پھوٹ پڑی۔

"تم ان "شکایات" کو دریا برد کیوں نہیں کرتیں۔" بڑی یاسیت سے کہا گیا۔

"دریا برد کر بھی دوں۔ آپ کی ہر شکایت کو مسوری' میکانگ' اوتاوہ' رائن اور فرات کے دریا میں پھینک دوں یا پھر کیسپین' وکٹوریہ نیانزا' گریٹ بیئر' البرٹ اور گریٹ سلیو کی جھیلوں کے فردا فردا حوالے کر دوں۔ آپ کسی نہ کسی شکایت کو بحیرہ روم میں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے ماہیر سے قدرے دور ہٹی۔

"نزدیک آکے' قریب آکے' پاس بیٹھ کے' قریب کا سرور بخش ... جا رہے ہو۔ کیوں نہ قربت کے ان لمحوں ... رنگ بھر دیئے جائیں۔" بھوری آنکھوں میں ... تمنا شوق الفت کی تابناکی جھلملا رہی تھی۔

"... پانی کی ٹنکی کو تو بھر دوں۔ لائٹ جانے والی ہے۔ خالی ٹنکی منتظر رہی ہے۔"

"اوں ہوں۔" ماہیر جی بھر کے بدمزہ ہوا۔

"اتنے رومانٹک ماحول میں' اس قدر غیر رومانٹک گفتگو۔ پانی کی خالی ٹنکی۔ لاحول ولا قوۃ۔"

"پانی نہ ہوا تو سارے کام ادھورے رہ جائیں گے۔ ابھی برتن بھی دھونے ہیں۔" حریم کو بالا ہی بالا ڈھیروں کام یاد آنے لگے تھے جو اس کی نظر کرم کے منتظر تھے۔

"میرے ہمدم' دوست' رفیق حال اور مستقبل کے ساتھی! برتن دھونے سے اہم ہماری ترجیح' مچلتی ذات ہے۔ کیوں ہماری خواہش' تمنا' آرزو کو حسرتوں میں بدلنا چاہتی ہو۔" وہ اس کے دوپٹے کا کونا تھامے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ بے بس سی ہو کر پائنتی کی طرف ڈھے گئی۔

"بہت مطلب پرست ہیں آپ!" حریم کی دبی دبی ہنسی کمرے کی گھٹن زدہ فضا کو خوشگواریت بخش گئی تھی۔

"تم شوہر پرست ہو' محبت پرست ہو' وفا پرست ہو' کہہ دو نا۔ کہہ دو نا۔" وہ اس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ ہاں" وہ ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ بہت دنوں بعد گہری دبیز غم کی یہ چادر ہنسی کے شگافوں سے تار تار ہوئی تھی۔ دریچے میں اتری گلابی شب نے شرما کر خاموشی کا دامن کھینچ لیا۔ خاموشی جھنجلاتی' بلبلاتی رخ موڑے چلی گئی تھی دور' بہت دور' کسی اور کے دریچے میں۔

☼ ☼ ☼

"تم پھر آئی ہو۔" قاتلین بند کر کے سنہری عینک کو گلاس ٹیبل پر رکھے' آنکھیں دبا تا شاید خود سے

مخاطب ہوا تھا۔ مگر وہ جو اس کے ہمراہ تھی بڑی شان سے اٹھلا کر بولی۔

"میں ہوتی تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر قدم پر بس محفل میں تم دھیان نہیں دیتے۔ جان بوجھ کر مجھ سے گریز برتتے ہو۔ اچھا کرتے ہو بہت اچھا کرتے ہو۔ اگر ایسا نہ کرو تو لوگ پتا تمہیں کیا کہیں گے۔"

"بھلا کیا؟" اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"سنکی، ہنجطی اور۔" خاموشی نے لہجے میں تجسس بھرا۔

"اور کیا؟"

"دیوانہ۔ نرا دیوانہ۔" خاموشی چہکی۔

"وہ تو میں ہوں۔"

"اس دیوانگی کا کوئی حاصل بھی ہے۔" خاموشی کو زخم ادھیڑنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

"حاصل کسی کو ملا بھی ہے۔ گوہر مقصود بلند بخت والوں کو ملتے ہیں۔"

"تمہارے نصیب کا ستارہ بھی بڑا بلند ہے۔" خاموشی کو سچ مچ اس سے محبت تھی یا دل رکھنے کو کبھی کبھی توصیفی کلمات کہہ دیتی تھی۔

"چل ہٹ جھوٹی!"

"کب بولا میں نے جھوٹ۔ میں تو ہمیشہ سچ کہتی ہوں۔ سچائیاں بتاتی ہوں۔ تلخ حقیقتیں واضح کرتی ہوں۔ تنہائی کا اور میرا گہرا ساتھ ہے اور ہم دونوں "سچ" عیاں کرنے کو تو ہمیشہ ارد گرد بھٹکتے ہیں۔" خاموشی نے تلملا کر جواب دیا۔

"ایک "سچ" مجھے بھی بتا۔"

"پوچھو پوچھو؟" خاموشی تجسس دبائے چہکی۔

"وہ خوش تو ہے نا۔"

"بہت خوش ہے۔" خاموشی کو "سچ" بتانا پڑا۔

"وہ خوش تو زرجان خوش۔" دل نے سرگوشی کی۔

"تمہارے لیے سب سے اہم کیا؟" خاموشی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔

"اس کی ذات۔"

"اور میرے لیے سب سے اہم "پتا ہے کیا ہے؟" خاموشی اٹھلائی۔

"نہیں۔"

"تمہاری ذات۔" خاموشی نے کھنکتے لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟"

"تم نہ ہو تو مجھے بھی کوئی اور نہیں پوچھتا۔ تمہاری ماں بھائی، بھابیاں، بچے۔ صرف تم ہی تو ہو میرے ہمدم۔" خاموشی ہنسی۔

"اب تم جاؤ۔"

"کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟" خاموشی بسوری۔

"مجھے اب سونا ہے۔"

"سو کر کیا کرو گے۔" خاموشی نے منہ بنا کر پوچھا۔

"خواب دیکھوں گا۔"

"خوابوں میں کیا "وہ" آئے گی۔" خاموشی کو ہمیشہ والے حسد نے گھیرا۔

"ہاں۔"

"کیا فائدہ۔" خاموشی نے ناک چڑھائی۔

"محبت فائدہ نقصان نہیں دیکھتی۔"

"محبت کیا دیکھتی ہے۔؟" خاموشی الجھی۔

"محبت "طرف" دیکھتی ہے۔ محبوب کی "خوشی" دیکھتی ہے۔"

"تم نے "محبت" کو کیا دیا؟" خاموشی نے حیرت سے پوچھا۔

"پورے کا پورا زرجان۔" لہجے میں ایک فخر تھا۔ سرخوشی تھی۔

"تم بھی زرجان!" خاموشی ہنسی اور موبائل بجنے کی آواز سن کر منہ بسورتی بھاگی۔

"زرجان اسلام علیکم۔" دوسری طرف زمان بھائی تھے۔ اس نے بکھرے اعصاب سمیٹنے کی کوشش کی۔

"جی کہیں۔" وہ غائب دماغی سے بولا۔

"اس وقت۔" زمان بھائی چیخے۔

"بس کچھ کام تھا۔" وہ جل سا کلاک کی طرف دیکھتا اٹھ گیا۔

"ہم تمہاری طرف آئے ہیں۔ جلدی سے آؤ۔" زمان بھائی نے کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

زرجان بریف کیس اٹھائے چوکیدار کو ہدایات دیتا باہر نکل گیا تھا۔ تاروں سے سجے آسمان تلے مضبوط قدموں سے چلتا ہوا وہ اندھیرے راستے میں گم ہو گیا۔ چوکیدار بس قدرت کے اس شاہکار کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

کیا شان تھی "کیا ٹھاٹھ تھے" کیا دبدبہ تھا۔ زمین اس کے قدموں تلے تھی اور وہ کس سنگلاخ زمین کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ نگر نگر، قریہ قریہ، بستی بستی، شہر شہر، دیس دیس۔

☆ ☆ ☆

وہ ہمیشہ کی طرح بغیر بتائے بغیر حانی کو اطلاع دیے آگئی تھی۔ حانی اسے دیکھ کر بے ساختہ چیخی۔

"حریم! اب تم سے ملنے کی اتنی اہم ہو گئی۔ تمہاری شادی کے بعد ایسا ہوا ہے۔" وہ حریم سے لپٹ کر بے اختیار اس کے رخسار چومنے لگی۔

"تمہاری یاد آتی ہو "اتنی" اتنی اتنی کہ حد نہیں۔" حانی خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔

"اتنی محبت ہو گئی ہے تم سے حریم! جلدی جلدی چکر لگایا کرو نا۔" حانی تو آج خود اسے حیران کرنے کے چکروں میں تھی۔ ایسا "اظہار محبت" پہلے کبھی نہیں حانی نے کیا تھا۔

"کبھی ذہن ماضی کی طرف سفر کرنے لگتا ہے۔ وہاں بھی تو ہر جگہ "تم ہو" ہر دریچے میں تمہارا ہی چہرہ جلوہ افروز ہے۔"

حانی کے پیچھے ہلکان ہو ہو جانے والی حریم اتنا یاد آتی ہے کہ کیا بتاؤں۔" حانی رو بھی رہی تھی۔ ہنس بھی رہی تھی۔ اور خود حریم کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟" شہزادیوں جیسی آن بان والی حانی کی حریم کو ایک شہزادے کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ حریم کی پلکوں پر خوابوں کے ستارے اتر آئے "روشن" چمکیلے اور ٹمٹماتے ستارے محبت نے حریم کے روم روم کو مہکا ڈالا تھا۔ وہ اس شہزادے سے چپکے چپکے عشق کرنے لگی۔ پھر بھری برسات کی ایک شام۔ بڑی عجیب سی شام تھی۔ کچھ کہتی کچھ بولتی۔ دھنک کے رنگوں سے سجی اس شام کو یونانی دیو تاؤں جیسا حسن رکھنے والے ایک اور شہزادے نے ہمارا آنگن میں مہکار اتری سفید موتیوں جیسی بارش میں بھیگتی گلابی شام کا سارا حسن سمیٹتی حریم جمال کے عشق میں وہ پگلا دیوتا گرفتار ہو گیا۔ اسی پل "اسی گھڑی" اسی لمحے عشق لاحاصل نے اس دیوتا کے قدم تھام لیے تھے۔

ایک بل کھاتی "اٹھلاتی خاموشی پورب کی طرف سے دندناتی ہوئی آگئی تھی اور اس دیوتا کے پیروں سے لپٹتی ہوئی اس کے سنگ سنگ رخصت ہوئی۔ آج بھی وہ خاموشی "وہ تنہائی اس دیوتا کے ہمراہ ہے ہم قدم ہے۔ کبھی کبھی دل بہت دکھتا ہے حریم! ابھر ابھر آنے لگتا ہے۔ سنہری فریم میں سے جھانکتی ان سیاہ شفاف کانچ جیسی آنکھوں کی اداسیاں مار ڈالتی ہیں یوں لگتا ہے وجود مٹی مٹی ہو گیا ہے۔" حانی کے لبوں سے نوحے برآمد ہو رہے تھے۔ حریم نے اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"حانی!"

"بولو حریم!" وہ مچلی۔

"آج تو کچھ بول دو۔ ان اداس آنکھوں کے لیے ان خاموش لبوں کے لیے جنہیں تمہاری عزت اور حرمت کا بڑا پاس ہے احساس ہے۔ خیال ہے۔"

"مجھے تم سے کچھ اور کہنا ہے۔" حریم اپنی پریشانیوں کو معصوم بہن کی جھولی میں ڈالنے کا حوصلہ کیسے لاتی۔

"کیا بات ہے حریم! جو کہنا ہے بلا جھجک کہو۔" حانی نے اس کے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔

"مانگا تو میں نے آج تک اپنے شوہر سے بھی کچھ نہیں ہے۔ مانگنے کا مجھے سلیقہ نہیں آتا۔" وہ بہت اذیت میں مبتلا تھی وقت نے آج ہاتھوں میں کشکول پکڑا دیا تھا۔ حریم کا زرد پڑتا چہرہ حانی کو الجھنوں میں مبتلا کر گیا۔

"بولو حریم! کچھ چاہیے۔؟"

"زمیلہ کی شادی ہے نا۔ مجھے کچھ رقم کی ضرورت

تھی۔ "جب کھلتے ہوئے اس نے کہہ ہی دیا۔

"ہوا کے ساتھ مل کر جو کمیٹی تم نے ڈالی ہے' اب تک سوسائٹی والے دیں گے تمہیں؟"

"میرا نمبر آنے میں تو بہت دیر ہے۔" تقریباً "چار پانچ ماہ۔" حانی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"پانچ لاکھ کی کمیٹی ہے۔ کام تو تمہارا بآسانی چل سکتا تھا اگر کمیٹی مل جاتی تو۔"

"وہ کچھ جلدی نہیں مل سکتی۔" حریم نے بے صبری سے پوچھا۔ حالانکہ جانتی تھی۔ بابا نے پینشن کی رقم کو پس انداز کر کے اور حانی ٹیوشنز کے پیسوں کو بچا بچا کر ماہانہ کمیٹی ادا کرتی تھی۔ یہ رقم بابا' حانی کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے پیش نظر ایک طرح سے جمع کر رہے تھے۔ ان روپوں پر حریم کا کوئی حق نہیں تھا مگر اس وقت وہ بہت مجبور تھی۔

اس کے خدشوں کے عین مطابق راحت بیگم نے اس کی اگلی پچھلی نسلوں کی غربت اور بھوک کی داستانیں سنا ڈالی تھیں۔ اس کی عزت نفس کو تار تار کر دیا تھا۔

"ہم نے سوچا تھا۔ اکیسویں گریڈ کے آفیسر کی بیٹی ہے۔ آڑے وقتوں میں لڑکوں کی سسرال اگر مضبوط ہو تو کام آتی ہے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ میرے دل کو بھی یہی تسلی تھی۔ حریم کا باپ' عالم کا دوست بھی ہے۔ مشکل وقت میں کام آئے گا۔ دس کینال کی کوٹھی میں رہتا ہے۔ یہ نہیں پتا تھا کنگلا ہے پورے کا پورا کنگلا' افلاس کا مارا' یہ خبر ہوتی تو پہلے کچھ اور سوچ لیتی۔ اسی امید پر بیٹھی تھی۔ اپنی لڑکی کو تو ٹرک بھر کے جہیز دیا ہے۔ کچھ نہ کچھ دوسری والی کے لیے بھی جمع کر رکھا ہو گا۔ چلو اسی میں سے کچھ رقم ادھار دے دیتے۔ قرض لینا تھا۔ خیرات نہیں' لوگوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔ فٹ انکار کر دیا۔ اپنی مجبوریوں کی داستانیں سنا ڈالیں۔ بنو آج کے دور میں ہر کوئی مجبور ہے۔ رشتہ داری کا بھرم بھی رکھنا پڑتا ہے۔ داماد کی مجبوریاں بھی دیکھنی پڑتی ہیں۔ اب کون سا دور ہے کاٹھ کباڑ دینے کا' [illegible] رقم دیتے ہیں۔ گاڑی' فلیٹ اور پلاٹ وغیرہ لڑکی کے نام کرواتے ہیں۔ ہماری بھولا لائی بھی تو کیا۔ لکڑی کے سامان سے گھر بھر دیا۔ نہ نیچے جگہ بچی نہ اوپر جگہ رہی اونہہ۔" انہوں نے ایک مرتبہ پھر شائستگی اور نرمی کا چولا اتار پھینکا تھا۔ حریم شرم اور شرمندگی کے احساس سے سر نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

امی کی جلی کٹی سن کر وہ بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل آئی تھی۔ اسے یقین تھا گویا کہ حانی اس کی مشکل کو سمجھ کر کچھ آسانی پیدا کر دے گی۔

"حریم! ایک بات پوچھوں۔" کچھ جھجک کر حانی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ غائب دماغی سے بولی۔

"زرجان بھیا نے جو رقم تمہیں بھجوائی تھی' وہ کہاں گئی؟"

"ارے۔ وہ رقم۔" حریم کے ذہن میں گویا جھماکا ہوا۔

"وہ تو اسی فالتو پرزوں والے دراز میں لفافہ رکھا ہے۔"

"دم حق ہو تم بھی حریم۔" حانی نے اپنا ماتھا پیٹا۔

"ایسی بھی کیا لاپروائی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا۔"

"نہیں' وہ لفافہ کسی نے نہیں دیکھا۔" حریم نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"اول تو امی اور زمیلہ دونوں کو کچن میں داخل ہونا کسی عذاب سے کم نہیں لگتا۔ اگر [illegible] بھی جائیں تو ان کا کام فریج تک محدود ہو [illegible] بنا کر باہر نکل آتی ہیں۔ اگر لفافہ ان کی نظر میں آتا تو کم از کم خاموش رہنے [illegible]"

"حانی [illegible] دیکھ لینا۔ مجھے لگتا ہے' لفافہ کافی وزنی تھا۔ رقم معمولی نہیں ہو گی۔" حانی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"تو کیا زرجان کا احسان قبول کر لوں۔" اس کے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔

"وہ کوئی غیر تو نہیں۔" حانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہاری ذات پر ان کے اتنے احسانات ہیں' چلو ایک اور سہی۔"

"وہ۔ زرجان کیا سوچے گا۔" وہ ابھی تک متامل تھی۔ جھجک رہی تھی۔ براہ راست ایسی امداد تو اس نے زرجان سے بھی نہ لی تھی۔

"ان کی خوشی کو تم نہیں سمجھ سکو گی حریم!" حانی رنجیدہ ہو گئی۔

"مجھے سمجھنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ رقم زندگی کے کسی موڑ پر' جب [illegible] ساری ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے گا [illegible] خوشحالی ہن کی طرح برسے گی۔ تب [illegible] دیکھ لینا' زرجان کو لوٹا دوں گی ان شاء اللہ۔" وہ پرس اور چادر اٹھا کر رکی نہیں [illegible] چھوٹے قدم اٹھاتی گیٹ کی طرف [illegible] کولائی وار سنگ مرمر سے بنے برآمدے [illegible] وہیل چیئر پر بیٹھی حانی ایک ٹک اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بحیرہ عرب کے پانیوں کی طرح آنسو ٹھہر گئے تھے۔ دریائے فرات کی طرح ان میں درد کے طوفان اٹھ رہے تھے۔

"تم نے کب جانا؟ تم نے کب سمجھا؟ تمہیں کیا خبر' تمہیں کیا پتا؟ کسی کا دل' حریم جمال' تمہاری یاد میں کالا ہاری کے صحرا کی طرح سلگ سکتا ہے۔ اس دل میں ریت اڑتی ہے' صرف ریت۔ تمہیں کیا پتا؟ تمہیں کیا خبر؟"

☆ ☆ ☆

یہ رقم واقعی معمولی نہیں تھی۔ تقریباً "دو لاکھ روپے" حریم کچھ پل کے لیے تو ساکت رہ گئی تھی۔ ایک دم ہو گئی۔ ان روپوں میں اس کا بھرم پوشیدہ تھا۔ یہ رقم کسی غیبی امداد سے کم تو نہیں تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود یہ پیسے رکھنا اس کی مجبوری میں شامل ہو گیا تھا۔

اس نے ماہیر کو بغیر بتائے لفافہ امی کے حوالے کر دیا تھا۔ رقم دیکھ کر بھی ان کے منہ کے زاویے اتنے بہتر نہیں ہوئے تھے۔ حریم کو جہاں تک امید تھی۔ اس کا دل بجھ کر رہ گیا تھا۔ اداسی روم روم میں اتر گئی تھی کبھی تمام محبتیں' ریاضتوں کا ایسا صلہ [illegible] کا باعث بن [illegible]

[illegible] ہی شاخوں پر شگوفے پھوٹ پڑے [illegible] چکی تھی۔ بالکونی میں رکھے گلاب کے [illegible] کے بہار کی آمد کے متعلق حریم کو باخبر کر دیا تھا مگر اس کے دل میں صرف ایک موسم ٹھہر گیا تھا۔ خزاں کا موسم' اداسی کا موسم۔

ماہیر رات' بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ اس نے شاید کسی اور جگہ بھی جاب کر لی تھی۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ تاہم تھکاوٹ کے باوجود ایک اور احساس بھی اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ عیاں تھا۔ ظاہر ہو رہا تھا۔

"جو رقم تم نے امی کو دی ہے۔ وہ کہاں سے آئی؟"

اس کے لہجے میں عجیب سی تلخی رچی تھی۔ وہ بجائے خوش ہونے کے نجانے کیوں جرح کر رہا تھا۔ خفا ہو رہا تھا۔ غصہ کر رہا تھا۔

"میں نے کمیٹی کی رقم امی کو دی ہے۔ انہیں ضرورت تھی۔" بہت سوچ کر حریم کو مناسب سا جواز مل گیا تھا۔ پہلی مرتبہ مصلحتاً جھوٹ بولتے ہوئے اس کے لب ہولے سے کپکپائے تھے۔

"ہوں۔" وہ لب بھینچے کئی لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا جب بولا تو لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"اس گھر کی ساری ضرورتیں میری ذمہ داری ہیں تم نے ہر کسی کی "ضرورت" پوری کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کیوں لائی ہو تم انکل سے یہ رقم۔"

"پلیز ماہیر!" حریم بھی ایک دم بلند آواز میں بولی۔

"آپ نے الگ کچھ رکھا ہے مجھے۔ میں آپ کی ساری ذمہ داریوں کو برابر شیئر کروں گی۔ زمیلہ کی شادی صرف آپ کا نہیں ہمارا مشترکہ مسئلہ ہے۔ اگر مجھے کچھ نہیں سمجھتے تو تب یہ رقم میرے منہ پر دے ماریں' اپنی اوقات میں جان لوں گی۔ پھر کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

"تم کیوں نہیں میری بات سمجھتیں۔" ماہیر جھنجلا گیا۔

"بیوی کے پیسوں پر نظر رکھنے والا سمجھ رکھا ہے

مجھے۔" اس کی خودداری اور عزت نفس پر گویا تازیانہ لگا تھا۔

"بے غیرت نہیں ہوں میں، انکل کو خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔ وہ بے چارے تو پہلے ہی۔"

"یہ پیسے بابا کے نہیں۔" حریم نے سچائی ظاہر کردی۔

"اب اگر شور مچایا تو خفا ہو کر چلی جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔

"کہاں؟ کہاں چلی جاؤ گی۔؟" وہ ایک دم چونک پڑا۔

"بابا کے گھر۔" حریم اطمینان سے بولی۔

"میرا گھر چھوڑ کے۔" وہ حیران ہوا۔

"ہاں۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"وجہ؟" ماہیر سمجھ کر مسکرایا۔

"مجھے اپنا نہیں سمجھتے آپ۔ غیروں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ میں آپ کے ہر دکھ اور ہر سکھ کو شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ مگر آپ میرے اور تیرے کے چکروں میں میرا ننھا سا دل توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔" وہ بسوری تھی۔

"مجھے تمہاری محبتوں کی، الفتوں کی اور ان "مہربانیوں" کی بہت قدر ہے حریم! میں لفظوں میں بیان کر ہی نہیں سکتا کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ میں اتنا خوش نصیب ہوں، اب تو سچ مچ یقین آنے لگا ہے۔ یہ رقم میں پھر بھی نہیں لے سکتا، مجھے یوں شرمندہ مت کرو۔" ماہیر نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی چمکیلی شفاف آنکھوں میں جھانکا۔

"مگر کیوں؟" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"اس لیے کہ امی تمہارے زیورات مانگ رہی ہیں۔ جو انہوں نے شادی پر تمہیں پہنائے تھے۔ اور بہت افسوس سے تمہیں ایک بات بتاؤں، امی نے اس وقت بعد اصرار یہ زیور اسی لیے بنوائے تھے کہ زمیلہ کے لیے پھر نہ بنوانے پڑیں۔ کتنی دقتوں … کے پیسے دیے تھے اور امی بار بار اسی … رہی تھیں کہ سونے کا بھاؤ بڑھتا جا رہا ہے … وہ چاہتی ہیں تم تمام زیور انہیں واپس کر دو۔ تمہیں شادی پر زیورات دے کر انہوں نے "دکھاوا" تو کر لیا تھا۔ لوگوں پر رعب بھی ڈال لیا کہ بہو کو اتنا سونا چڑھایا ہے۔ اب بہت اطمینان سے واپس مانگ رہی ہیں۔ اسے کہتے ہیں، دور اندیشی، یا "تنگ" طویل تر منصوبہ۔" ماہیر کے لفظ لفظ میں تلخی رچی تھی۔ اسے ماں کا یہ مطالبہ قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔

"اور امی کہہ رہی تھیں۔ بہن کے لیے تمہارا دل تنگ پڑ رہا ہے۔" خود وہ بہت با اصول تھا اسے یہ "مطالبہ" امی کی تمنا سراسر بے انصافی معلوم ہو رہی تھی۔ ماہیر نے ماں سے واضح کہہ دیا تھا کہ یا تو زمیلہ کے لیے توفیق کے مطابق نئے زیور بنوالیں یا پھر ان زیورات کو برابر تقسیم کر کے آدھا حریم کو اور آدھا زمیلہ کو دیں۔ راحت بیگم کو یہ دونوں آپشن پسند نہیں آئے تھے۔ دل ہی دل میں انہوں نے بیٹے کو احمق، زن مرید اور نجانے کون کون سے خطاب سے نوازا تھا۔

"امی ٹھیک کہتی ہیں ماہیر! آپ کا بوجھ ہی ہلکا ہو گا۔ رہے زیور وہ تو بند پڑے ہیں لاکر میں۔ کیا فائدہ، بے کار میں رکھنے کا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں زمیلہ مجھے جانی کی طرح عزیز ہے اس کی شادی ہمارا پہلا فرض ہے اور ہمیں زمیلہ کی خوشی کا دھیان رکھنا چاہیے … بھی اپنے بڑے بھائی سے نجانے … امیدیں ہوں گی۔" حریم نے نرمی سے … ماہیر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں تو ڈاکہ ڈال … ہوں … حق چھین سکتا ہوں۔ اپنی بساط کے مطابق بہن کو جہیز بھی دوں گا۔ اچھی طرح … کروں گا۔ امی کو بھی میں نے دو … آفس کی طرف سے لون کے لیے اپلائی کیا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ رقم میرے پاس موجود ہیں۔ امی نے دوکان بھی بیچ دی ہے۔ میرا خیال ہے اب کسی قرض کی ضرورت نہیں ہو گی۔" ماہیر صوفے پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولنے لگا تھا۔

"دوکان۔" حریم کچھ حیران ہوئی۔

"جی۔ دوکان، اچھا خاصا کرایہ وصول ہوتا تھا۔ خیر امی کی مرضی یہ دوکان انہی کے نام تھی۔"

"اچھا۔ پھر تو تمام پریشانی ختم ہو گئی۔"

"پتا نہیں، ختم ہو گئیں پریشانیاں یا اصل ٹینشن کی ابتدا ہونے والی ہے۔" وہ ناقابل فہم انداز میں بولتا بالکنی کی طرف بڑھ گیا۔

"کپڑے نکال دو حریم۔"

"جی۔" وہ سوچوں کے بھنور سے بمشکل نکلی۔ ماہیر کو پریس شدہ قمیص شلوار دے کر وہ چائے بنانے کے لیے نیچے آگئی تھی۔

"حریم! ذرا بات سننا۔" امی نے تخت پر بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

"جی امی!" … آگئی تھی۔

"دیکھو … سے مشورہ کرنا ہے۔" امی کے لہجے … پھوٹ رہی تھی۔ حریم بے ہوش ہوتے ہوتے … انہوں نے کب اسے مشوروں کے قابل سمجھا تھا۔

"حریم! میری بچی، تم تو بہت سمجھدار ہو، عقلمند ہو۔ ماہیر کو سمجھاؤ۔ بیٹیوں کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ کانچ کی مانند۔ ذرا سی ٹھیس پر بکھر جانے والے۔ فرنیچر اور کھانے کا انتظام ماہیر نے کر لیا ہے۔ زیور تم دے دو نا۔ رہی کراکری اور مشینری تو اس کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گی۔ تم لفافہ ابھی باپ کو واپس نہ کرنا۔ مجبوری ہے، ماہیر کو یہ بات سمجھانا آسان نہیں۔ بہنوں، بیٹیوں کے بھی ارمان ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد ہو گی تو خود بخود سارے معاملے سمجھ میں آجائیں گے۔ کتابی باتوں سے مشکلات حل نہیں ہوتیں۔ ایک ہی تمہاری نند ہے، ذرا دل وسیع کر کے سوچو۔" انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر گویا التجا کی تھی۔

نجانے ان کا کون سا روپ سچا تھا۔ کبھی انگارے چبانے لگتی تھیں۔ کبھی پھول برسانے لگتیں۔ تاہم حریم کا سر از خود ہل [illegible] گیا۔

"امی! آپ فکر نہ کریں۔ مردوں کو ان باتوں کی سمجھ کہاں ہوتی ہے۔ سب کچھ آپ کی مرضی اور پسند کے مطابق ہو گا۔" حریم کے دلاسے نے ان کا چہرہ روشن کر دیا۔

"جیتی رہو … ہو۔" وہ بے یقینی سے بولیں۔

"… مت کرنا حریم! ماہیر تمہیں اور زیور بنوا دے گا۔ اس کی نوکری بہت اچھی ہے۔ ابھی تو سارے اخراجات با آسانی اٹھا رکھے ہیں۔ میرے بیٹے کا دل بڑا وسیع ہے اور اسے بیوی بھی بڑے دل والی ملی ہے۔ جبھی تو میں کہوں حریم کے جیسی کوئی نہیں۔ سدا قیفانہ زیبا رہیے۔" وہ بے ساختہ خوشی سے بکھر گئی تھیں۔ آنکھوں میں نمی لبوں پہ مسکراہٹ۔ حریم کے بڑھتے قدم لمحہ بھر کو ٹھٹکے۔

"تا قیفانہ زیبا رہیے۔"

وہ سر جھٹک کر چائے بنانے لگی تھی۔ مگر ذہن کسی اور طرف محو سفر تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ فاصلوں کا شہر واشنگٹن تھا۔ روشنیاں، فاصلے، دوریاں، فاصلے دل میں ہوں یا دیس میں، دور بہت دور کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی فاصلے زرجان کو اپنی ماں کے اور بھائیوں کے درمیان محسوس ہوتے تھے۔ وہ کبھی بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں تھے۔ حالانکہ مما نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مما کی قربانیاں، محبتیں سب ان کے لیے معمولی سی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ دونوں بھائی لندن میں اپنا بزنس سیٹ کرنا چاہتے تھے۔ صرف اس لیے کہ ان کی بیویاں خواہش مند تھیں۔ ان کے میکے والے لندن میں آباد تھے۔ سو وہ خود بھی وہاں ہمیشہ کے لیے رہنا چاہتی تھیں۔

مما کے ساتھ آخری ڈنر میں انہوں نے کئی باتیں ڈسکس کی تھیں۔ زرجان حیران تھا کہ مما نے کوئی اعتراض کیوں نہیں کیا۔ اگر مما چاہتیں تو انہیں روکنے کے سارے اختیار رکھتی تھیں۔ مگر مما نے صرف اتنا کہا۔

"جہاں رہو، خوش رہو۔ ترقی کرو، آگے بڑھو۔ وہاں

کی ایک کھڑکی کو چارٹس میں بدل دو۔ اس سے بہترین بات کیا ہو سکتی ہے۔" ایسی باتیں اب زرجان کو دکھ نہیں دیتی تھیں۔ سفر در سفر کرتے "آگے بڑھتے۔ ہر شہر میں ہر دیس میں "وہ" اس کے ہمراہ تھی۔ کبھی کسی اور شے کی کسی اور وجود کی طلب محسوس نہیں ہوتی تھی۔

ہران جھیل ہمیشہ کی طرح ہر رنگ کے ہر نسل کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہ تنہا تھا۔ اپنی ذات میں اکیلا تھا۔ ادھورا تھا شیشے کے اس شہر میں اس کی دلچسپی کے لیے کچھ بھی نہیں تھا' یہ تمناؤں کی دنیا تھی لوگ جذبے اور امیدیں لے کر اس براعظم میں داخل ہوتے تھے۔ ایک زرجان عباس تھا جو اس دیس میں "مجبوریوں" کے سنگ وقت گزار رہا تھا۔

اس کے اردگرد بہت شور تھا بہت ہنگامہ تھا۔ فیشن کے نام پر بے حیائی کا نمونہ' برہنہ عورتیں۔ "نوجوان' بوڑھے۔ کسی نہ کسی "دلچسپی" میں مصروف تھے۔ ان کی جی بہلانے کے لیے وہاں بہت کچھ تھا۔ زرجان کی دلچسپی کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

نیلے پانیوں پر تیرتی خاموشی نے تاسف سے دور بہت دور کھڑے زرجان عباس کو دیکھا تھا۔ اور پھر اٹھلاتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔

"تم آگئیں؟"

"تو اور کیا۔" خاموشی ہنسی۔

"میرا انتظار کر رہے تھے۔"

"ہاں۔"

"اسی لیے تو میں آگئی۔" خاموشی نے دور دور تک نظر دوڑائی۔

"اس ہنگامے میں بھی تم اکیلے؟ کبھی تو قسم توڑ دو۔" خاموشی نے معنی خیزی سے کہا۔

"ان ہنگاموں میں میرے لیے اٹریکشن کہاں؟"

"ہوں۔ ہوں' کبھی اردگرد نظر تو دوڑاؤ۔" خاموشی کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ امریکہ میں آکے سبھی کے مزاج شگفتہ ہو جاتے ہیں۔

"مجھے تو کسی منظر میں خوبصورتی دکھائی نہیں دیتی۔"

"تم نے کبھی دنیا کو غور سے دیکھا ہی کہاں ہے؟" خاموشی نے تاسف کا اظہار کیا۔

"میری "دنیا" میری آنکھوں میں بستی ہے۔ آس پاس کے نظاروں سے مجھے کیا لینا۔"

"اس دنیا کے حصار سے نکل کر تو دیکھو۔ روشنیاں تمہیں بلاتی ہیں۔" خاموشی ناصحانہ انداز میں بولی۔

"آج تو چاند بھی جوبن پر ہے۔"

"چندا سے کہو نا' کبھی زرجان کے دریچے میں بھی جھانکے۔"

"میں کیسے؟" خاموشی حیران ہوئی۔

"کہو نا چپکے سے' سرگوشی سے۔" اصرار ہوا۔

"بھلا کیا؟" خاموشی نے بے صبری سے پوچھا۔

"حریم دل میں بہت اندھیرا ہے۔"

"حریم دل؟ میں سمجھی نہیں۔" خاموشی نے ہونق پن کی انتہا کی۔

"دل کے مکان۔ دل کی چار دیواری میں بہت سناٹا ہے۔ اندھیرا ہے۔' چندا سے کہو نا۔ ایک شب چپکے سے میرے دل میں اتر آئے۔"

"میں کیسے کہوں؟ چندا تو بہت دور ہے۔" خاموشی نے افسردگی سے کہا۔

"اتنا دور۔ اتنا دور۔ جیسے "حریم دور ہے۔ بہت دور" اک چھوٹے سے مکان میں۔ زرجان عباس کی پہنچ سے بہت دور۔"

"چل جھوٹی! تجھے کیا پتا۔ حریم جمال تو زرجان کے دل میں ہے۔ دور کہاں...

"دور رہ کے... کس کو بہلاتے ہو۔" خاموشی خفگی سے بولی۔

"چل ہٹ! چلی بھی جا۔"

"نہ جاؤں تو پھر کیا کرو گے 'میرے بغیر۔"

"تمہیں یاد 'یاد"۔"

"تم بھی نہ زرجان! دیوانے ہو دیوانے۔" خاموشی ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔

"یادوں میں بھلا کیا ہے تمہارے پاس۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اک صورت کے سوا اک صورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" خاموشی نے گویا تمسخر اڑایا۔

"دیوانگی نے تم کو بھلا کیا دیا؟"

"محبت کرنے کا سلیقہ۔"

"تم بھی نا زرجان۔" خاموشی پھر سے ہنسی۔

"زرجان! مسٹر زرجان عباس فلیٹ نمبر 777 میں آپ کا کوئی منتظر ہے۔" موبائل فون ایک تواتر سے بج رہا تھا۔ خاموشی ناک بھوں چڑھاتی بھیگے کی طرح بھاگی۔ وہ موبائل کی طرف متوجہ تھا۔

✿

امی نے شاید خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ صرف چند دنوں میں کراکری' الیکٹرونکس کا سامان' جگہ جگہ زیورات کے ڈبے' قیمتی فرنیچر سے گویا گھر بھرا لگنے لگا تھا۔

زمیلہ کے سسرال والوں نے رسمی طور پر بھی جہیز لینے سے منع نہیں کیا تھا۔ جب تیاری مکمل ہو چکی تو وہ ٹرک سامان سے بھر کر بھجوا دیے گئے۔

صباحت خالہ نے کئی مرتبہ منع بھی کیا تھا۔

"اتنا کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ بعض لوگوں کی "نیت" نہیں بھرتی۔" مگر امی ان کی باتوں کی گہرائی سمجھے بغیر اپنی من مانی کر رہی تھیں۔ ماہیر نے مزید کسی بھی معاملے میں بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر آنے کے بعد وہ امی اور زمیلہ کو لے کر بازار چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھار امی حریم کو بھی زبردستی ساتھ لے جاتی تھیں۔ بقول ان کے حریم کی چوائس بہت اعلا تھی۔ ماہیر نے حریم کے لیے علیحدہ سے شاپنگ کی تھی۔ حتیٰ کہ راحت بیگم نے بھی ایک نفیس سی ساڑھی حریم کے لیے خریدی۔ وہ ان "عنایات" پر اتنا خوش نہیں ہوئی تھی۔ جانتی تھی موڈ بگڑا تو اگلی پچھلی ساری کسر ساس محترمہ نکال دیں گی۔

شادی میں صرف بوا آئی تھیں گھڑی دو گھڑی کے لیے۔ بابا کی طبیعت بہت خراب تھی۔ عرصہ دراز سے وہ دمہ کے مرض میں مبتلا تھے۔ جانی' بابا کی تنہائی کے خیال سے نہیں آئی تھیں۔ ادھر امی نے کئی مرتبہ آتے جاتے بوا سے پوچھا تھا۔

"جمال صاحب نہیں آئیں گے؟"

"بی بی! ان کی صحت ٹھیک نہیں۔" وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر منمنا کر رہ جاتی۔

بوا بارات والے دن آئی تھیں۔ اتنا ڈھیر سامان لے کر۔ قیمتی' نفیس تین سوٹ' ڈنر سیٹ' سینڈوچ میکر' اور ساتھ سونے کے ایئر رنگز۔ زمیلہ کو سب کچھ بہت پسند آیا۔ یہ سب بابا اور جانی نے بھجوایا تھا۔ اس خیال سے کہ سسرال میں بیٹی کی سبکی نہ ہو۔ حریم کی پلکیں اسی محبت پر نم ہو گئیں۔

امی نے زمیلہ کی ساس کو کپڑے پہنائے تو حریم دنگ ہی رہ گئی۔ نند کے لیے لاکٹ سیٹ تھا۔ وہ یوں تفاخر کے ساتھ اسٹیج سے اتر رہی تھیں گویا انہوں نے بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔ میرج ہال میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ہنسی' قہقہے' مسکراہٹیں' حریم ساڑھی سنبھالتی ایک الگ تھلگ کونے میں کھڑی ہو کر مہمان خواتین کا جائزہ لے رہی تھی۔ تبھی کچھ ناگوار آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں۔

"دادی ساس کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لڑکے کو نہ چین نہ انگوٹھی۔ افلاس کے ماروں کے گھر رشتہ کیا ہے۔ ہماری تو سبکی کروا دی۔ گھر کی بزرگ خاتون کو چادر تک نہیں دی۔ اچھے خاندانی لوگ ہیں۔" نبیل کی پھوپھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

"نہ گاڑی نہ فلیٹ نہ پلاٹ حتیٰ کہ موٹر سائیکل نہیں دے سکے۔ لکڑی کے سامان سے گھر بھر دیا۔ وہ دو صوفہ سیٹ' دینے کا فائدہ۔" دوسری پھوپھی بھی گویا دبی آواز میں پھنکاری۔

"ان کا گھر ہے یا چوروں کا ڈربا۔ دم گھٹنے لگتا ہے دو گھڑی میں۔" یہ تیسری آواز بہت ہی مانوس تھی۔ حریم نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ آواز خالہ بی کی تھی۔ زمیلہ کی دادی ساس کی۔ وہ گویا ششدر کھڑی رہ

گئی۔ شیرینی میں ڈوبے ان کے گزشتہ رویے اور الفاظ حریم کے ذہن پر گویا ہتھوڑے برسانے لگے۔

"یہ رشتہ کس کی مرضی سے طے ہوا ہے؟" پھوپھی صاحبہ جھاڑ کر پوچھنے لگیں۔

"میں نے سوچا صباحت کی بھانجی ہے۔ اس کی طرح دب کر رہے گی۔ شکل و صورت میں بھی لاجواب ہے۔ لڑکا بھی خوش، ہم بھی خوش۔" خالہ بی نے گویا اپنی پلاننگ سے بیٹیوں کو آگاہ کیا۔

"صباحت کی اور نبیل کی ماں کی بھلا جرات ہے میرے سامنے آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں۔ پوتوں کی بیویاں بھی ایسی چن چن کر لاؤں گی کہ تمام عمر بے زبان جانوروں کی طرح رہیں بک بک نہ کریں۔" خالہ بی کے ارادے تو خاصے خطرناک لگتے تھے۔ حریم نے دور کھڑی مسکین سی صباحت خالہ اور زمیلہ کی مرجھائی مرجھائی ساس کی طرف دیکھا۔

"لڑکی کی ماں تو کافی تیز طرار لگتی ہے اماں بی۔" دوسری پھوپھی نظروں میں راحت بیگم کو تولتی بول رہی تھی۔

"تو نہ۔ کس بل نکال کر رکھ دوں گی۔ اگر چوں چاں کی تو۔ گھر پر ہمارا راج ہے۔ ہماری اولاد کی جرات نہیں ہمارے سامنے بولنے کی تو پوتے بے چارے تو ہیں ہی فرماں بردار۔ اور میرا نبیل تو زیادہ ہی فرماں بردار ہے۔ اسی لیے تو سب سے زیادہ عزیز ہے مجھے۔" خالہ بی نے فخریہ کہا۔

"یا اللہ! زمیلہ کے حال پر رحم کرنا۔" حریم نے صدق دل سے دعا کی۔ رخصتی کا شور اٹھ گیا تھا۔ ماہیر نے اسے اشارے سے بلوایا تو وہ سج سج قدم اٹھاتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

فرض کی ادائیگی کے بعد جہاں ماہیر پرسکون ہو گیا تھا۔ وہیں حریم نے دیکھا راحت بیگم کچھ الجھی الجھی سی تھیں۔ آج زمیلہ کی میکے میں آمد [illegible] حریم صبح سے انہی تیاریوں میں لگی ہوئی [illegible] دیر بعد

امی بھی کچن میں آگئیں۔

"حریم! میں گوشت دھو دیتی ہوں یا سبزی بنا دیتی ہوں۔"

"نہیں امی! میں کر لوں گی۔ صرف دو افراد کا کھانا بنانا ہے۔" اس نے امی کے ہاتھ سے سبزی کی ٹوکری پکڑ لی۔

"میں فارغ بیٹھ بیٹھ کر اکتا گئی ہوں۔ یوں لگتا ہے، زمیلہ کے جانے کے بعد میری ساری مصروفیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ تم مجھے کچھ کام بتاؤ۔ لاؤنج میں تنہا بیٹھ کر میرا دل گھبرا گیا ہے۔" وہ بہت ---- گھبرائی لگ رہی تھیں۔ انہیں اپنے تاثرات چھپانا نہیں آتے تھے۔

"آپ لاؤنج میں چل کر بیٹھیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھ کر چاول صاف کر دیتی ہوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ خوشی خوشی پلٹ گئیں۔

کچھ ہی دنوں میں ان کے رویے کی یہ تبدیلی اور مسلسل تبدیلی نے حریم کو کافی حیران کر رکھا تھا۔ اپنی بیٹی کو گھر سے رخصت کرنے کے بعد انہیں کسی کی بچی کا خیال آگیا تھا۔

باتوں کے دوران کام ختم ہوا تو حریم کچن سمیٹ گئی۔ امی اب بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔

کچھ دیر بعد زمیلہ اور نبیل ہی نہیں ان کا پورا کنبہ چلا آیا تھا۔ امی اور حریم دونوں اتنے افراد دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"حریم! ان لوگوں کو تو [illegible] اٹھائے ساتھ چلے آئے ہیں۔ [illegible] کے لیے تو کھانا کم پڑ جائے گا۔" وہ [illegible] کی آمد کی خوشی بھلا کے نئی فکر میں مبتلا ہو گئیں۔ حریم خود پہلے تو خوب بوکھلائی پھر ذرا ذہن کو حاضر کر کے امی کو تسلی دینے لگی۔

"امی! آپ فکر نہ کریں۔ ماہیر آتے ہوں گے۔ میں انہیں فون کر دیتی ہوں۔ کباب، بریانی اور مچھلی منگوا لیتے ہیں۔" چاول اتنے افراد کو کم پڑ سکتے تھے سو اس نے بریانی منگوانے کا سوچا۔

"ہاں ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" وہ پلٹ گئی تھیں۔

اس نے ماہیر کو فون کیا تو پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"ارے نصیب [illegible] کیوں فون کیا ہے؟" بڑی خوشدلی سے پوچھا گیا۔

"زمیلہ آئی ہے۔"

"میں آدھے گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔" ماہیر شاید بائیک پر سوار تھا۔

"زمیلہ اکیلی نہیں ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

"نبیل نے ساتھ ہی ہونا تھا۔"

"نبیل کے گھر والے بھی ہمراہ ہیں۔" حریم نے آواز اور آہستہ کر لی۔

"اوہ..."

"کھانا کم پڑ جائے گا۔ بغیر اطلاع کے آئے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔" ماہیر نے نرمی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

حریم پھرتی سے ڈرائنگ روم میں کولڈ ڈرنکس پہنچا کر آئی۔ اب جلدی جلدی برتن لگانے تھے۔ کباب فرائی کر لیے تھے صرف مائیکرو ویو میں گرم کرنا تھے میٹھے میں کھیر تھی۔ وہ میوے بھی کاٹ چکی تھی۔ اب شوکیس سے نیا ڈنر سیٹ نکالنے کا مرحلہ باقی تھا۔ حریم بھاگ بھاگ کر اسٹور کی طرف جاتی۔ اسٹور کے ایک کونے میں حریم کا شوکیس رکھا تھا۔ جگہ کی کمی کے باعث ماہیر نے شوکیس اسٹور میں رکھوا دیا تھا۔

ابھی وہ ڈنر سیٹ نکال کر لائی تھی جب موبی بہت دنوں بعد کمرے سے نکل کر راہداری میں کھڑا ہو گیا۔ حریم کے پاس ایک لمحہ فرصت کا نہیں تھا۔ وہ موبی سے پوچھ لیتی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

"بھابھی!"

"ہاں۔" وہ رکے بغیر بولی۔ اور میز پر گلاس اور جگ وغیرہ رکھنے لگی۔

"زمیلہ آئی ہے۔"

"ہاں جی [illegible]"

[illegible] مخصوص انداز میں سہلاتی چلی گئی۔

[illegible] ہاں ہاں کرتی ہو۔" موبی نے ایک مخصوص انداز میں زمین پر پیر مارا تھا۔ حریم نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ موبی نے پھر ٹھنک کر زمین پر پیر مارا۔

"بتاؤ۔ بتاؤ۔ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں۔" وہ پلیٹیں صاف کرتی بولی۔

"کچھ بھی۔" اب وہ مخصوص انداز میں تالی بجا رہا تھا۔ حریم نے کچھ الجھی نظروں سے موبی کی طرف دیکھا تھا۔ نہ جانے کون سا احساس تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ موبی اب غصے کے عالم میں گول گول گھوم رہا تھا۔ حریم کو بعد میں احساس ہوا تھا۔ موبی غصے میں نہیں تھا۔ وہ آج بہت موڈ میں تھا۔ اور اسی حساب سے خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ تالی بجاتا' زمین پر پیر مار کر ٹھنکتا۔

"موبی! چلو اندر' کیا کر رہے ہو یہاں۔" راحت بیگم چیل کی طرح موبی کی طرف لپکی تھیں۔ پھر اسے گھسیٹتی ہوئی کمرے میں بند کر کے آگئیں۔ ان کا جسم پسینے میں گویا نہا چکا تھا۔ وہ سرخ گالوں کو دوپٹے سے پونچھتی اندر چلی گئیں۔ حریم بھی سر جھٹک کر کھانا لگانے لگی تھی۔

اسی رات زمیلہ میکے میں رات گزارنے کے لیے نبیل کی منتیں کر رہی تھی۔ نبیل شاید دادی اور ماں کی وجہ سے انکاری تھا۔ تاہم کچھ دیر بعد زمیلہ کو رات رکنے کی اجازت مل گئی تھی۔

حریم ان کے لیے چائے بنا کر لائی تو زمیلہ ماں سے بجھی بجھی آواز میں مخاطب تھی۔

"میری ایک نہیں' دو دو ساسیں ہیں۔ نبیل تو بہت اچھے ہیں مگر ماں اور دادی کے سامنے بے بس۔ ویسے میں بہت خوش ہوں۔" ماں کو تسلیاں دیتی زمیلہ پر حریم کو ٹوٹ کر پیار آگیا تھا۔ بھرم رکھنے کے چکر میں ماں کو جھوٹی تسلیاں دلاتے دیتے ہوئے بار بار اس کی

آنکھیں نم نم ہو رہی تھیں۔ جنہیں وہ بال سے چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جا رہی تھی کچھ نہ بتانے کے باوجود راحت بیگم خود بخود گویا سب سمجھ گئی تھیں۔ تبھی تو ان کے کندھے لمحہ بھر میں جھک گئے تھے۔ ماں کے دل نے سب ان کہی باتوں کو جان لیا تھا۔ اسی طرح حریم کے باپ کے کندھے بھی جھکے تھے۔ لب بھی خاموش رہنے لگے تھے۔ ہر ماں ہر باپ بیٹی بیاہ کر کے بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ زبان گویا گروی رکھ دی جاتی ہے۔

راحت بیگم کا تمام تر غرور مطلقہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ انہیں اپنی وہ زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔ طنز باتیں عریم کا دل جلانا جہیز کے طعنے دینے۔ وہ سب کچھ جو وہ حریم پر آزماتی رہی تھیں۔ وہ ہی "تحفے" ان کی بیٹی کو اس انداز میں مل رہے تھے۔

حریم واپس آ رہی تھی جب اس نے راحت بیگم کو کہتے سنا۔

"بیٹی! گھر تو تمہارا وہ ہی ہے۔ خود کو ان کی پسند کے سانچے میں ڈھال لو۔ اپنی بھابھی کو دیکھو' ایسی ہمت' برداشت اور صبر کا تمہیں بھی مظاہرہ کرنا پڑے گا۔"

حریم کے لبوں پر اک تلخ تبسم نے جھلک دکھائی۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

حریم نے بابا اور بوا دونوں کے سامنے احسان حسن کا پرپوزل رکھا تھا۔ بابا تو کچھ نیم رضامند تھے البتہ بوا نے بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی تھی۔ حریم ان کے اتنے بھرپور رد عمل پر خفیف سی رہ گئی۔

"بنو! حانی ہم پر بھاری نہیں۔ وہ "بابا" رہ گیا ہے میری حانی کے لیے۔" بوا شدید جذباتیت کا شکار ہو رہی تھیں۔

"بوا! حانی کو کسی قدر دان کی ضرورت ہے۔ ایک ہمدرد انسان جو اس کی معذوری کے ساتھ [illegible] کرے۔ اس کا سہارا بنے۔ ٹھنڈے دل سے [illegible] زندگی تنہا تو نہیں گزاری جا سکتی۔" [illegible] لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو پھر زر جان سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں۔ اتنا نیک دل' اتنا شریف' بھلا اسے کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔" بوا نے بڑی بے رحمی سے حانی کے دل کو ادھیڑا۔

"پلیز بوا!" حانی وہیل چیئر گھسیٹتی اندر آ گئی۔

"آئندہ اس بات کو منہ سے مت نکالیے۔ زر جان بھیا ہمارے لیے کیا ہیں۔ آپ نہیں سمجھیں گی بوا! نہیں سمجھیں گی۔" حانی بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"بنو! میں نے کچھ غلط کہا۔" بوا گھبرا گئیں۔

"آپ نے تو تلخ غلط بات کی ہے۔ زر جان بھیا کو سب نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ وہ ہوش و حواس سے عاری ہیں کیا۔؟ ان کے جذبات نہیں۔ احساسات نہیں۔ وہ کیا دل نہیں رکھتے اور اس دل میں کیا ہے؟ کسی نے کبھی جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔" حانی تڑخ کر بولی۔

"ہمارا کیا قصور ہے بنو! وہ تو فلک ناز نے۔"

"پلیز بوا! ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے۔" حانی حریم کے چہرے کے بدلتے رنگ [illegible] کر سرعت سے بولی۔

بوا ایک دم خفا ہو گئیں۔

"بھلا ہم کیا کریں۔ چپ شاہ کا روزہ رکھ لیں۔"

"فی الحال آپ چائے بنا کر [illegible]"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ [illegible] گئیں۔"

"حانی! پھر تم [illegible]۔ خالہ نے تم سے بات کی تھی [illegible] کے بعد حریم نے نرمی سے حانی [illegible] کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"[illegible] نہیں کر پا رہی ہوں۔ نہ جانے کیوں بابا کی تنہائی کا احساس آزردہ کیے رہتا ہے۔"

"تم اطمینان سے ہر پہلو پر غور کر لو۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" حریم نے محبت سے بہن کی پیشانی کو چوما۔

کچھ دیر بعد ماہیر لینے کے لیے آ گیا تھا۔ سارے

راستے وہ مسلسل بولتا رہا تھا۔ شاید کسی پریشانی سے پیچھا چھڑوانا چاہتا تھا۔

گھر آ کر ماہیر سیدھا اوپر چلا گیا تھا۔ حریم امی کے پاس تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ میز پر چائے کے خالی کپ پڑے تھے۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ کون آیا ہے۔

"لیفا آئی تھی۔" امی بغیر اس کے پوچھے خود ہی بتانے لگیں۔

"وہ جانے لگی تو زمیلہ آ گئی۔ نبیل [illegible] پر دبئی چلا گیا ہے۔ بڑا دل چاہ رہا تھا زمیلہ رات رک جاتی مگر اسے گھر جا کر پورے [illegible] کے لیے کھانا پکانا تھا۔ اس کی نند کو دیکھنے [illegible] آ رہے ہیں۔ اس لیے جلدی چلی گئی [illegible] کے باوجود۔" ان کی آواز بہت [illegible]

[illegible] وہ خاموشی سے سرہلاتے ان کی بات سن رہی تھی جب انہوں نے اس کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھ کر گویا اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"جی امی!" حریم جانتی تھی۔ بیٹی کے جانے سے ان کا دل بھر آ رہا ہے۔

"بیٹیاں سبھی کو پیاری ہوتی ہیں۔ یہ ہم جیسی عورتیں کیوں نہیں سمجھتیں۔ پرائی بیٹیوں کو کچوکے لگاتے' ان کے دل دکھاتے ہوئے یہ کیوں نہیں سوچتیں' ہمارے اپنے آنگن کی چڑیاں بھی ایک دن پرائی ہو جائیں گی۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا تھا۔ حریم تو گویا دھک سے رہ گئی۔

"کتنی اچھی بیٹی ہو تم! اتنے سکھ تو مجھے زمیلہ نے نہیں دیئے۔"

"یہ تو میرا فرض ہے امی! کوئی احسان تو نہیں۔" حریم نے ان کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر ہولے سے دبائے۔

"زمیلہ آئی تھی۔ بہت الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی جس طرح تم شادی کے شروع دنوں میں چپ چپ رہتی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ تم نے اپنی موجودہ زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اسی طرح زمیلہ بھی کر لے گی۔ ساری بیٹیاں سمجھوتے کے شربت کو امرت سمجھ کر پی لیتی ہیں۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ [illegible]

"[illegible] بھی ہو حریم! ایک وعدہ مجھ سے کرو' کبھی معولی سے نفرت نہیں کرو گی۔ کبھی اس سے کراہیت محسوس نہیں کرو گی۔ کبھی اسے دھتکارنا مت۔ وعدہ کرو حریم!"

"امی! آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔" حریم کے لیے امی کے یہ انداز نئے تھے۔

"بتاؤ نا معولی سے نفرت تو نہیں کرو گی۔" وہ نہ جانے کون سی یقین دہانی چاہتی تھیں۔

"نہیں امی! کبھی نہیں۔"

"شکریہ۔ تم نے میرے دل کو ٹھنڈک پہنچائی ہے۔ اللہ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے۔" انہوں نے بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر اسے دعا دی تھی۔

"یہ دعائیں ہی زندگی کا حاصل ہوتی ہیں۔ زاد راہ کے لیے آپ کی "دعا" ہی کافی ہے۔"

"جیتی رہو' خوش رہو۔ سدا آباد رہو۔" راحت بیگم کے روم روم نے گویا دعا دی تھی۔

"اب تم جاؤ' ماہیر انتظار کر رہا ہوگا۔" بیٹی کی بھیگی بھیگی آنکھوں اور خاموش لبوں نے گویا ان کے سارے کس بل نکال دیئے تھے۔ وہ پہلی والی راحت بیگم سے بہت مختلف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بالکل تو نہیں' البتہ کچھ کچھ ضرور بدل گئی تھیں۔ حریم کو زیادہ سے زیادہ اپنے قریب رکھتیں۔ ہر بات میں مشورہ کرتیں۔ صلاح لیتیں۔ گویا حریم کے بغیر ان کا دن گزرنا محال تھا۔

آج صبح لیفا چلی آئی تھی۔ امی نے زبردستی اس کے سر میں مالش کی تھی۔ حریم کے سر میں اکثر درد رہنے لگا تھا۔ امی نے اس کو کنپٹیاں دباتے دیکھ کر آواز دی تھی۔ وہ اس کے سر میں تیل کی مالش زبردستی کرنے لگی تھیں۔ لیفا اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ امی' معولی کو کپڑے چینج کروانے اندر گئیں تو لیفا معنی خیزی سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ کایا پلٹ کیسے؟"

"یقین نہیں آ رہا کیا؟" حریم بال سمیٹ کر کچن کی

طرف بڑھ گئی۔ قیفا بھی اس کے پیچھے آگئی تھی۔
"نہیں۔"
"زمیلہ کو رخصت کر کے کچھ زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی ہیں۔"
"ہوں۔" قیفا نے ہنکارا بھرا۔
"زمیلہ کی زندگی میں در آنے والی مشکلات کا اندازہ کر کے تمہاری قدر ہوئی ہے۔"
"چلو دیر آید درست آید۔" حریم مسکرائی۔
"چائے پیو گی؟"
"ضرور۔"
"تم بھی ادھر ہو۔ کب تک جاؤ گی۔" اس نے چائے کے لیے پانی چولہے پر رکھا۔
"کچھ دن اور رہوں گی۔ پھر مستقل چلے جانا ہے۔"
"اچھا۔" حریم کو خوشی محسوس ہوئی۔
"میاں جی کے پاس چلی جاؤ گی۔ یہ تو اچھی بات ہے۔"
"ہوں۔ مگر میں جانا نہیں چاہتی۔" قیفا اداسی سے بولی۔
"مگر کیوں؟"
"امی کی وجہ سے۔ ان کی تنہائی کے خیال سے کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی بیٹا ہوتا تو امی کو تنہا تو نہ رہنا پڑتا۔" وہ یاسیت سے بولی۔
"تنہا کیوں؟ ہم ہیں نا۔ پھوپھو ہمارے پاس رہیں گی۔"
"ایسا ممکن نہیں۔" قیفا نے آزردگی سے کہا۔
"کیوں ممکن نہیں۔ ہم لوگ کیا غیر ہیں۔"
"وقت کے ساتھ ساتھ رشتے اور ترجیحات بدل جاتی ہیں۔" قیفا کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی تھی۔
"مگر پھوپھو کے ساتھ ہمارا رشتہ مضبوط ہے۔ ماہیر کو پھوپھو سے بہت محبت ہے۔ تمہارے جانے کے بعد وہ پھوپھو کو تنہا نہیں رہنے دیں گے۔" حریم نے پلٹ کر اس کے شانے کو نرمی سے دبایا۔
"ایک بات کہوں؟"

"کیوں نہیں۔ اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔" چائے بن چکی تھی۔ حریم نے چھان کر مگ میں چائے انڈیلی اور مگ قیفا کو پکڑا دیا۔
"امی تمہارے معاملے میں نرم ہو گئی ہیں مقام حیرت شاید انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ وہ اب تمہارے رحم و کرم پر ہیں۔ انہوں نے سوچ لیا ہے کہ جب اکٹھے رہنا ہے تو پھر خوشگوار ماحول میں تم سے خدمت کروالی جائے۔ زمیلہ کے جانے کے بعد ان کا دست راست کھو گیا ہے۔ دوسرے زمیلہ کو بہت تگڑی قسم کی سسرال ملی ہے۔ انہوں نے زمیلہ کو طعنے دے دے کر ادھ موا کر دیا ہے کہ ان دونوں ماں بیٹیوں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ یہی بات امی ماں کو سمجھانا چاہتی تھیں مگر اپنے غرور میں انہوں نے اس وقت امی کی بات پر کان نہیں دھرے تھے۔ اب جبکہ زمیلہ کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جس کی شاید انہیں توقع نہیں تھی اسی لیے مامی نے اپنا رویہ بدل لیا ہے۔ تاہم یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے۔ وہ دل کی بری نہیں ہیں۔ بس بدلتے حالات انسان کو بدمزاج کر دیتے ہیں اب یہی دیکھ لو۔ زمیلہ کی ساس، نند کے طعنے سن سن کر انہوں نے زمیلہ کے نام مکان لکھوانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"
"کیا مطلب؟" حریم کی سانسیں گویا تھم گئی تھیں۔
"کون سا مکان؟"
"یہی جس کی چھت تلے ہم کھڑی ہیں۔"
"ہم کہاں جائیں گے۔" حریم گویا لرز کر رہ گئی۔
ماہیر کی ساری پریشانیوں کی وجوہات آنکھوں کے سامنے آ چکی تھیں۔ حریم کو زور کا چکر آیا۔

☼ ☼ ☼

"ماہیر! امی یہ مکان زمیلہ کے نام لکھوانے لگی ہیں۔" وہ آنکھوں پر بازو رکھے کمرے میں اندھیرا کیے لیٹا تھا۔ جب حریم کمرے میں داخل ہو کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"تمہیں اطلاع مل گئی ہے۔" وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔
"جی۔" وہ ضبط کی کوشش میں ہلکان ہونے لگی۔
"ہم کہاں جائیں گے ماہیر!"
"تم کیوں فکر کرتی ہو میری جان! اللہ کی دنیا بڑی وسیع ہے کہیں تو ٹھکانہ مل جائے گا۔" وہ خود بہت پریشان تھا مگر حریم کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے کچھ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔
"مذاق نہ کریں۔ میرا دل بہت آزردہ ہے۔" حریم گویا روہانسی ہو گئی۔
"تم معمولی مسئلہ نہیں ہم کہاں جائیں گے کہاں رہیں گے۔"
"کرائے کے مکان بہت مل جاتے ہیں۔ کسی ایک کو ہم بھی ٹھکانہ بنا لیں گے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"بے سکونی ٹھکانہ۔ کرایوں کے جھنجھٹ گھر بدر نیہ سب کیسے ہو گا ماہیر!" اس کے آنسو بہت ضبط کے باوجود ٹپ ٹپ گرنے لگے۔
"روتی کیوں ہو حریم! ابھی تو میں موجود ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے یہ غم یہ فکریں صرف میری ہیں۔ جب نہ رہا تو ساس بہو خود ہی پریشانیاں، غم، فکریں تنہائی رہنا۔"
"پلیز ماہیر!" حریم چیخ پڑی۔
"کتنی مرتبہ کہا ہے۔ فضول مت بولا کریں۔ میرا دل لرزا کر رکھ دیتے ہیں۔"
"ایک تو اتنا سا دل ہے تمہارا۔ بات بے بات کانپنے لگتا ہے۔ اسے مضبوط کرو حریم۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں محض اس کی ٹینشن دور کرنے کی غرض سے بول رہا تھا۔ حالانکہ اس کی اپنی نیندیں اچاٹ ہو چکی تھیں رات رات بھر کروٹ کے بل سوچتا رہتا ہے۔ اتنے لالچی لوگ ہوں گے خالہ کے سسرال والے۔ انہیں پہلے اندازہ نہیں تھا۔ ورنہ زمیلہ کا رشتہ کم از کم ماہیر وہاں نہ ہونے دیتا۔
"تم روتے ہوئے کتنی خوبصورت لگتی ہو۔ مجھے پہلے اندازہ نہیں تھا۔ ورنہ کبھی کبھی تمہیں رلانے کی

کوشش ضرور کرتا۔" ماہیر نے اس کے گالوں پر پھسلتے تمام تر آنسو سمیٹ لیے۔
"تمہیں تو مجھے رلانے کی کوشش مت کیجیے گا۔" وہ بلکتے ہوئے انداز میں بولی۔
"تم تو خود روئی ہو۔" ماہیر نے اسے چھیڑا۔
"اپنی مرضی سے روئی ہوں۔"
"اچھا۔ یہ بتاؤ، تمہیں کس بات پر زیادہ رونا آسکتا ہے۔" ماہیر کا اپنا بھی دھیان اس سنجیدہ ترین مسئلے سے ہٹ چکا تھا۔
"اگر مجھے کوئی ڈانٹے تو میں بہت روؤں گی۔" حریم نے سوچ کر بتایا۔ وہ خود بھی کچھ دیر کے لیے اتنی اہم پریشانی کو بھول چکی تھی۔ یہ سب ماہیر کی قربت کا اعجاز تھا۔ حریم سارے دکھ، ساری الجھنیں ماہیر کو دیکھ کر بھول جاتی تھی۔
"اس کے علاوہ۔"
"اگر مجھے چوٹ لگے گی تو میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں گی۔" وہ معصومیت سے بولی۔
"تمہیں آئندہ زندگی میں کس بات پر زیادہ دکھ ہو گا۔" ماہیر بازوؤں کا تکیہ بنائے اس کی چمکیلی دھلی دھلائی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔
"اگر خدانخواستہ میری ممتا کو تڑپنا پڑے تب میں صبر اور ضبط کا مظاہرہ نہیں کر سکوں گی۔" حریم کی آنکھیں پھر سے گیلی ہونے لگیں کسی نومولود کی سسکی نے اسے بے ساختہ رلا دیا۔
"یہ بتاؤ اگر میں نہ رہا تو تمہیں کتنا دکھ ہو گا۔"
"پلیز ماہیر۔" حریم کچھ مشتعل ہو گئی۔
"جب مارو گی آپ کو میں جان سے مار دوں گی۔"
"سچ بتاؤ نا حریم!" ماہیر نے اصرار کیا۔
"کتنے دن تک یاد رکھو گی۔"
"ماہیر۔" وہ غصے سے اٹھ کر باہر جانے لگی تھی۔ ماہیر نے سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"بتاؤ۔" اس نے پھر سے حریم کو چھیڑا۔
"تم کیا بتاؤ گی۔ میں بتاتا ہوں۔" وہ اس کے چکیلے

ریشمی بالوں میں ہاتھ پھیرتا کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"اتنی یادیں چھوڑ کر جاؤں گی۔ تمہارے آس پاس کہ چاہ کر بھی پیچھا نہ چھڑا سکو گی۔"

"ماہیر!" حریم کے لب پھڑپھڑائے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ماہیر سچ گھبرا گیا۔

"یار میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"چاہے کسی کے دل پر کیا گزرے' آپ کا مذاق ٹھہرا۔"

"سوری یار' ویری سوری۔" ماہیر نے اسے گدگدانا چاہا۔

"معاف کر دو نا۔ یہ لو کان بھی پکڑ لیے۔ کیا ناک بھی پکڑوں۔" وہ حریم کے دونوں کان پکڑے پوچھ رہا تھا۔ حریم خفا خفا سی ہنس پڑی۔

"یوں ہنستی رہا کرو۔ تمہاری ہنسی میں میرے لیے زندگی ہے۔" وہ مخمور سا اسے دیکھے گیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" حریم بری طرح جھینپ گئی۔

"اول روز کی طرح دکھتی ہو۔ معصوم حسین' کھلی کھلی آنکھوں سے حیرانی سے دیکھتی ہوئی۔ گویا کوئی نومولود بچہ پالنے میں سے جھانک رہا ہو۔۔۔ دنیا کو حیرانی سے دیکھ رہا ہو۔۔۔ شاید یہ سوچتا ہو کہ میں کن لوگوں کے بیچ آ گیا ہوں۔ یہ میرے رہنے کی جگہ تو نہ تھی۔ مجھے تو کسی محبت کے باغ میں ہونا چاہیے تھا۔ جس پر چبھتی دھوپ کا کبھی سایہ نہ پڑتا۔ بادل اپنے پر ہر وقت پھیلائے رکھتے دائمی الفتیں میرے ارد گرد ہوتیں مجھے دشواریوں اور سختیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا لوگوں کے دھوپ چھاؤں جیسے رویے میرا معصوم شفاف اور بے ریا دل نہ دکھاتے۔"

"آپ کو ایک "فن" بہت اچھی طرح آتا ہے۔" حریم کے عارضوں پر تپش دہکنے لگی۔

"مجھے تو بہت سے فن بہت ہی اچھی طرح آتے ہیں۔ کہو تو سارے جوہر دکھا دوں؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔ حریم کو لگا اس کے ارد گرد پھولوں کے کئی گنج

مسکرا اٹھے ہیں۔ وہ بہت کم کم مسکراتا تھا اور اس کی مسکراہٹ دیوانگی کی حد تک پاگل کر دینے کی کشش رکھتی تھی۔

"ایک بات تو بتائیں۔"

"صرف ایک بات' میں تو ساری رات جاگنے اور باتیں سنانے کے لیے تیار ہوں۔ تم کئی ہزار باتیں پوچھ سکتی ہو۔" وہ خوشدلی سے بولا۔ اس وقت وہ ساری فکریں گویا بھلا چکا تھا۔

"کبھی آفس میں کسی کولیگ کے ساتھ۔۔۔" وہ دبی دبی مسکان لبوں کے گوشوں میں دبائے لمحہ بھر کو رکی۔

"کیا۔؟" ماہیر نے آنکھیں پھیلائیں۔

"کبھی آفس میں کسی ساتھی خاتون کے ساتھ دل لگی کی ہے۔"

"تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔" ماہیر مصنوعی صدمے سے بے حال ہوا۔

"ایک بات پوچھی ہے۔" حریم ہنسی۔

"آپ کو ایسا ہرگز نہیں سمجھتی۔ غم مت کھائیے۔"

"نہیں۔ کبھی نہیں۔"

"یقین نہیں آتا۔" حریم نے اسے چھیڑا۔

"یہ جو میرا دل ہے نا۔ اک طوفان سے بھرا ہوا ہے۔" ماہیر نے بھوری آنکھوں میں شوخی کے سارے رنگ بھر لیے۔

"طوفان۔" حریم حیران ہوئی۔

"تمہاری محبت کا طوفان۔ جو ہر پل ٹھاٹھیں مارتا۔ تم ایک اطمینان سے میرے دل پر فتح مندی کا جھنڈا گاڑتا آسان نہیں۔۔۔ فتح زمین ہے اس دل کی۔ اس میں صرف تمہاری حکومت ہے روز روز ہم حکومتیں نہیں بدلا کرتے۔"

"اس سخاوت کا شکریہ۔" حریم کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اس فصاحت اور بلاغت کا بھی شکریہ میں نے آج تک ایسا شخص نہیں دیکھا' جو لفظوں کی بنت سے دلوں پر بہت حسین اور گہرے نقش و نگار بناتا ہے۔

زندگی کے حسن کو گھن لگانے والے بہت ہوتے ہیں۔ زندگی کے حسن کو نہاں کرنے والے بھی بہت ہوتے ہیں اور زندگی کے اصل رنگوں سے آشنا کرنے والا کوئی کوئی ہوتا ہے۔ میں نے انسانیت سے پیار کرنے والے صرف دو مرد دیکھے ہیں۔ ایک آپ جو میرا سائبان ہو۔ زندگی کے ساتھی ہو اور اک ایسا مرد ہے۔ جس سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ اک بے غرض سا مرد حسن ہے اور اس کے دل میں اللہ کے بندوں کے لیے بڑا درد بھرا ہے۔" حریم تصور کی کشتی میں سوار بہت دور چلی گئی تھی۔

"اے حریم! آج شام جلدی نہیں دریچے میں اتر آئی۔" ماہیر کی نظریں بالکنی کی کھڑکی پر اتری شام پر تھیں۔

"ہاں شاید۔"

"سو پھر سوتے ہیں نا۔" وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لے چکا تھا۔ حریم قدرے پھڑپھڑائی۔

"امی کو دوا دینی ہے۔" اسے اچانک اپنے بھولے ہوئے کام یاد آنے لگے۔

"خادم کس لیے ہے۔ تم آرام کرو میں دودھ اور دوا دے آؤں گا۔ تھک جاتی ہو نا حریم!"

"نہیں تو۔ تھکن کیسی' اپنے گھر کے کام ہیں۔" حریم نے لاپروائی سے کہا۔

"میں نے تمہیں کوئی سکھ نہیں دیا۔ جی تو چاہتا ہے' تمہیں مہارانی بنا کر رکھوں۔ نوکروں کی فوج تمہارے ارد گرد ہو' مگر یہ خالی والٹ۔"

"میں خدا نخواستہ کیا لولی لنگڑی ہوں۔ سارے کام خود کر سکتی ہوں۔ مجھے نوکروں کی فوج بھرتی کروا کر افورڈ لینا ہے کسی نے۔" وہ خوشدلی سے بولی تھی۔ ماہیر کے احساس اور خیال رکھنے کے یہ انداز حریم کی ساری تھکن اتار دیتے تھے۔

"تم پر کاموں کا اضافی بوجھ ہے۔ کیا اتنا بے خبر سمجھتی ہو۔ یہ ماسی مکار آئے دن سیلری پیکیج بڑھانے کی ڈیمانڈ کرنے لگتی ہے۔" ماہیر کو ماسی پر شدید تاؤ آیا۔ آج پھر ماسی صبح صبح راستہ روکے کھڑی

تھی۔

"زمیلہ مسئلہ ہے۔ سب سے بڑی پرابلم ہے۔ وہ دیواروں کی طرح تنگی ہے اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔" حریم کو اچانک اس چھت کے اپنا ہو جانے کے خیال نے بری طرح متوحش کر دیا۔

"امی نے ہمارے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا۔"

"زمیلہ کے آنسو انہیں کچھ اور سوچنے دیتے تو تب وہ کسی اور طرف دھیان دیتیں۔" ماہیر بھی لمحہ بھر کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"بیاہی بیٹیاں اپنی پریشانیوں کی ساری پوٹلیاں سسرال سے اٹھا لاتی ہیں۔ یہ کہ بغیر سوچے میکے میں ہر آہٹ پر چونکتی ماں۔ دہلیز پر نظریں ٹکائے باپ تو کسی خوشگوار خبر کا منتظر ہوتا ہے بیٹی کی صرف مسکراہٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آنسو انہیں توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ انہیں لمحہ بھر میں عمر رسیدہ بنا دیتے ہیں۔ جس طرح امی کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ شانے ڈھلک گئے تھے۔ وہ تو صرف کچھ دنوں میں برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھیں۔ زمیلہ کی آنکھ کے آنسو ان کے لیے ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ لمحوں میں گر جانے والی دیوار۔" حریم غمزدہ سی سوچے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے باپ کے بوڑھے چہرے پر پھیلی بے بسی اب راحت بیگم کے چہرے پر دکھائی دینے لگی تھی۔

"نہ ساس کو جھکا دیا نہ بالی اکلوتی نند کے لیے ایک چھلا تک نہیں نصیب ہوا۔ کیا اتنے حالات خراب تھے بھائی صاحب۔" مہندی کی رات بابا سے راحت بیگم بڑی معصومیت سے مخاطب ہوئی تھیں۔ بابا کے چہرے پر زردیاں گھنڈ گئی تھیں وجود شرمندگی کے عالم میں تھر تھرانے لگا تھا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ پیشانی عرق ندامت سے تر تھی اور وہ لب سیے چپ چاپ ایک اندھیر کونے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ایسے ہی اندھیرے اب راحت بیگم کے ارد گرد چکرانے لگے تھے۔ مگر ان اندھیروں کی لپیٹ میں حریم کا وجود بھی

آنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

بڑے دنوں بعد آج وہ نفیسہ پھوپھو کے گھر آئی تھی۔ گھر پر ہو کا عالم تھا۔ حریم نے بڑے کمرے میں جھانکا۔ پھوپھو اور فیفا اس کی توقع کے مطابق بڑے کمرے میں تھیں۔ ڈھیروں سامان بکھرا پڑا تھا۔ فیفا تیزی سے کپڑوں کے ڈھیر سمیٹ رہی تھی اُسے دیکھ کر خیرسگالی کے طور پر مسکرائی۔

"او حریم! رک کیوں گئیں؟"

"آپ کہیں جا رہی ہیں پھوپھو!" وہ اس قدر حیران ہوئی تھی کہ سلام کرنا ہی بھول گئی۔

"ہاں بیٹی۔" پھوپھو نے کپڑوں کے ڈھیر کو ایک طرف رکھ کر حریم کے لیے جگہ بنائی۔

"یہ سب ان دونوں کی ملی بھگت ہے مجھے کچھ بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ بالا ہی بالا فیفا نے اور سہیل (داماد) نے تمام معاملہ نبٹایا ہے۔" وہ اداسی سے کہہ رہی تھیں۔

"خیریت تو ہے؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔" حریم ہونق پن سے فیفا کی طرف دیکھنے لگی تھی جو کہ بے تحاشا ہنسے جا رہی تھی۔

"سہیل نے میرا اور امی دونوں کا ویزا بھجوایا ہے۔ ان کا اپنا تو کوئی ہے نہیں۔ بزرگوں کی خدمت کرنے کا انہیں بڑا ارمان تھا مگر امی کو داماد سے خدمت کروانا پسند نہیں، جانا نہیں چاہتی تھیں۔ بڑی دشواری کا سامنا کر کے منوایا ہے۔" فیفا نے اس کی حیرانی دور کی۔

"یہ تو اچھی بات ہے پھوپھو! آپ فیفا کے پاس رہیں گی۔ دونوں کے دلوں کو اطمینان رہے گا۔" حریم شگفتگی سے بولی۔

"خاک اچھی بات ہے۔ بڑھاپے میں پردیس جاؤں، اپنے دیس کو چھوڑ دوں۔" پھوپھو ناراضی سے گویا ہوئیں۔

"جانا تو آپ کو پڑے گا۔ سہیل نے اتنی محبت سے بلوایا ہے۔"

"اس کی محبت پر کوئی شک نہیں اللہ نے بیٹوں سے بڑھ کر داماد دیا ہے۔" نفیسہ پھوپھو نے محبت سے کہا۔

"ارے! باتوں میں لگ گئی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھا ہے۔ حریم چپکے سے نکل مت جانا۔ تمہارے لیے "انگوری" لے کر آتی ہوں۔" نفیسہ پھوپھو لشتم پشتم کچن کی طرف بھاگیں۔

"کب تک روانگی ہے۔"

"دو مہینے تک۔" فیفا نے بتایا حریم استری پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"میں تمہاری کچھ ہیلپ کروا دیتی ہوں۔"

"حریم! رہنے دو، ابھی کر لیتی ہوں۔ پلیز شرمندہ نہ کرو۔" فیفا جھلا کر اسٹینڈ کی طرف بڑھی۔

"ابھی دیکھنا، فٹا فٹ تمہاری پیکنگ ہو جائے گی۔"

"کپڑے پریس میں کر لوں گی۔ تم بیگ میں یہ کتابیں اور رسائل وغیرہ رکھ دو۔" فیفا نے کچھ سوچ کر آسان سا کام حریم کو بتایا۔

"کپڑے کیوں نہیں؟"

"رات کو استری کروں گی۔" فیفا بڑی سی کپڑوں کی گٹھڑی کو الماری میں ٹھونس آئی۔

"امی کہاں ہیں؟"

"سونی کے پاس۔"

"سونی ٹھیک تو ہے؟" فیفا نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں! پہلے سے بہتر ہے۔"

"فیفا! ایک بات پوچھوں؟" حریم نے کچھ جھجک کر آہستگی سے کہا۔

"ہاں! بنا جھجک پوچھو۔"

"زوباریہ تمہاری دوست تھی؟"

"زوباریہ۔" فیفا ایک دم چونکی۔ "تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"زمیلہ نے۔"

"او۔" فیفا نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"کیا کچھ بتایا ہے؟"

"زیادہ نہیں، بس اتنا کہ تم ماہیر اور زوباریہ پندرہ سے سولہ سال اکٹھے رہے ہو۔ کتنی اہم جماعت۔" حریم نے سرسری انداز میں بتایا۔

"ہوں۔" فیفا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نمودار ہوئے۔

"زوباریہ پہلے میری سہیلی تھی بہت گہری۔ اکلوتی فرینڈ۔ پھر اس نے زمیلہ کے ساتھ دوستی کر لی۔ میری سنگت چھوڑ دی۔" فیفا کسی یاد کے زیر اثر مضطرب ہو گئی تھی۔

"جانتی ہو کیوں؟" فیفا گویا اس ماحول سے کچھ پل کے لیے کٹ کر رہ گئی تھی۔

"کیوں؟" حریم کے لبوں سے سرگوشی نما آواز نکلی۔

"ماہیر کے لیے۔ ماہیر تک پہنچنے کے لیے سیڑھی کی تلاش تھی اسے۔ جو زوباریہ کو ماہیر تک پہنچانے میں ایک پل کا کام کرتی۔ کسی ایسے وجود کی ضرورت تھی زوباریہ کو۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"زوباریہ کو زمیلہ نام کی سیڑھی میسر ہو گئی۔ اس نے میرے ساتھ پندرہ سولہ سالہ تمام تعلقات ختم کر لیے۔ تب میری اور ماہیر کی بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہوا کرتی تھی۔ زوباریہ کو بہت حسد رہتا تھا کہ ماہیر مجھے اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے۔"

"پھر۔" حریم کے ہونٹ ذرا اور کو وا ہوئے۔

"بڑا جنونی قسم کا عشق لاحق ہو گیا تھا زوباریہ کو ماہیر سے تب وہ تمہارے ساتھ منسوب تھا اور اس بات کو صرف گھر کے افراد جانتے تھے۔ زوباریہ اس جنون میں پاگل ہو رہی تھی۔ دوران تعلیم ہی شادی کرنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کو خبر ہوئی تو وقت شاید ہاتھوں سے پھسل چکا تھا ایک مڈل کلاس کے لڑکے کو اس کی ماں کیسے اپنا داماد بنا لیتی جس کی ابھی تعلیم بھی ادھوری تھی۔ انہوں نے شاید بیٹی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ زوباریہ نے دو مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ جب زوباریہ کی ماں بیٹی کے ہاتھوں بس اور مجبور ہو گئی تو اس نے ماہیر سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ نہ جانے کب کیسے اور کہاں اس نے ماہیر کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ زوباریہ کی ماں کو حریم جمال کا ماہیر عالم [illegible]

پھر ایک دن کیا ہوا۔ زوباریہ کی ماں میڈم تابندہ لش پش کرتی لمبی سی گاڑی میں چلی آئی چمکتی دمکتی ساڑھی پہنے خوشبوؤں میں لپٹی اس دراز قد مغرور عورت کو دیکھ کر امی جان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ امی ہر چمکتی دمکتی شے سے بڑی جلدی متاثر ہو جاتی تھیں۔ میڈم تابندہ خالی ہاتھ نہیں آئی تھیں۔ پھلوں اور مٹھائیوں کے ٹوکروں سمیت آئی تھیں۔ ملازمائیں بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھائے گاڑی سے نکال کر تخت پر ڈھیر کر رہی تھیں۔ مہنگے ترین کپڑے، زیور کے ڈبے، مردانہ کپڑوں کے الگ سے شاپر، پرفیوم نجانے کیا کچھ ڈبوں میں ابھی بند پڑا تھا۔ امی اور زمیلہ کے چہرے جوش و جذبات سے رنگ بدل رہے تھے۔ ان کے گمان دھیان میں بھی نہیں تھا کہ زوباریہ کی ماں میڈم تابندہ ابھی کیا کہنے والی ہیں۔

میڈم تابندہ نے اک نظر کپکپاتی ہو کھلاتی امی اور زمیلہ پر ڈالی۔ اپنے پرس سے وہ ایک مخملی ڈبیا نکال رہی تھیں۔ ہیرے کی جگمگاتی انگوٹھی نے ان کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ انگوٹھی بہت خوبصورت تھی۔ ہیرے اس میں جگر جگر کر رہے تھے۔ روشنیاں ویسے بھی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی چندھیانے لگی تھیں۔ انگوٹھی مردانہ تھی۔ بڑی اعلا سوچ رکھنے والے ڈیزائنر نے تیار کی تھی شاید۔ ادھر میڈم تابندہ ان کے قدموں سے دھیرے دھیرے زمین کھینچ رہی تھیں۔

"آج سے ماہیر عالم اور زوباریہ درانی ایک دوسرے سے منسوب ہوئے۔ اس بات کو پکے "کاغذ" پر لکھ لیں۔"

امی اور زمیلہ گویا ششدر سی اس عورت کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی' جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے... وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ' سنبل اور ثمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں ثمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے' اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔

۱۸

اٹھارہویں قسط

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم اگلے ہی دن یونیورسٹی جانے لگو گی۔" رومیلہ نے تحمل کے برابر میں گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔

"ہاں صبح جب تحمل کا فون آیا ہے کہ میں تمہیں پک کرنے آرہی ہوں تو میں بھی حیران رہ گئی۔" سنبل نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

"حالانکہ میں نے شام کو فون پر ذکر کیا تھا کہ میرا کل آنے کا ارادہ ہے۔" تحمل نے موڑ کاٹنے کے لیے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں لیکن میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں تھکن اتنی ہوگی کہ تمہارا ارادہ ڈگمگا جائے گا۔" رومیلہ پرسوچ انداز میں بولی تو تحمل روڈ پر سے نظر ہٹا کر اس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر کہنے لگی۔

"کیا بات ہے؟ کیا تم لوگ چاہ نہیں رہے تھے کہ میں ابھی آؤں۔" اس کی بات پر رومیلہ نے پلٹ کر ایک نظر سنبل کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو "اب کیا کریں۔"

"اب تو بتانا ہی پڑے گا وہاں جا کر بھی پتا چلنا ہی ہے۔" سنبل نے مجبوری سی شکل بنائی۔

"خیریت تو ہے۔" تحمل ٹھٹک گئی۔

"وہ جو تم نے خرم کو تھپڑ مارا تھا وہ بات پوری یونیورسٹی کو پتا چل چکی ہے کسی نے اس منظر کی موی بنا کر فیس بک میں ڈال دی ہے۔" رومیلہ نے بہت مختصر سے انداز میں بڑی سنجیدہ سی بات اس کے گوش گزار کی تاکہ تحمل اس بات کو اس شدت سے محسوس نہ کر سکے جس شدت سے وہ یونیورسٹی میں گردش کر رہی تھی پھر بھی بات اتنی معمولی نہیں تھی کہ تحمل کو کچھ احساس ہی نہ ہوتا وہ یہ سن کر حقیقتاً" الجھ گئی فوری طور پر وہ کچھ بولی بھی نہیں مگر اس کی پیشانی پر پڑے بل اس کی ناگواری کو ظاہر کر رہے تھے کچھ دیر سنبل اور رومیلہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں پھر آخر رومیلہ بولی۔

"خرم تو تب سے یونیورسٹی ہی نہیں آیا ہے اور اتفاق سے تم بھی نہیں آسکیں تو۔۔۔ سب سمجھ رہے ہیں کہ۔۔۔" رومیلہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی کہ کن الفاظ میں اسے یونیورسٹی میں مقبول تبصروں سے آگاہ کرے مگر تحمل نے اس کی ادھوری بات سے پورا مطلب اخذ کرتے ہوئے اس کا جملہ خود ہی مکمل کر دیا۔

"کہ ہم دونوں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔" سنبل اور رومیلہ کی خاموشی نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی تو تحمل کو شدید قسم کی کوفت کا احساس ہوا پھر بھی وہ ان دونوں کو ہل دیکھ کر خود کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے بے زاری سے بولی۔

"سوچنے دو جو بھی سوچتے ہیں کچھ دن بات کر کے بھول جائیں گے۔" تحمل کو نارمل انداز میں ری ایکٹ کرتا دیکھ کر سنبل کی تھوڑی سی ہمت بڑھ گئی وہ اسے مزید حقیقتوں سے آگاہی بخشنے کو بولی۔

"لیکن وہ موی جس کسی نے بھی ڈالی ہے اس نے وہ اچانک۔۔۔ فلم بندی کی بلکہ ایسا لگ رہا ہے جیسے پوری تیاری کے ساتھ کوئی پہلے سے وہاں موجود تھا تاکہ یہ سب شوٹ کرسکے۔"

"کیا بات کر رہی ہو؟" تحمل حیرانی سے بولی تو سنبل اور رومیلہ خود بخود اسے ساری تفصیل بتاتی چلی گئیں حالانکہ ان دونوں نے طے کیا تھا کہ تحمل کو سرسری سے انداز میں بتائیں گے ورنہ وہ عادت کے مطابق بھڑک اٹھے گی مگر ایک تو اس سارے معاملے کے پیچھے جس کا ہاتھ تھا اسے تحمل جانتی نہیں تھی اور خرم کی طرف سے ایسی کسی حماقت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ بہ ضرورت تھی ایسی کوئی حرکت کر کے اپنا تماشا بنانے کی۔

چنانچہ تحمل کو اس حساب سے غصہ نہیں آیا تھا جتنا خرم کی کسی حرکت پر آسکتا تھا مگر ایک جھنجلاہٹ اس پر سوار ہوگئی تھی جو کہ بالکل فطری تھی۔

بھلے ہی رومیلہ اور سنبل نے اسٹوڈنٹس کا ردعمل بہت ڈھکے چھپے الفاظ میں بتایا تھا مگر تحمل کو اتنا اندازہ تو تھا کہ لوگ ایسے قصے ایسی جگہوں پر کس طرح نمک مرچ لگا کر چٹخاروں کے ساتھ اچھالتے جاتے ہیں اس پر سونے پر سہاگا سنبل کا بار بار ایک ہی جملہ دہرانا۔

"مجھے تو خرم کی خاموشی سے ڈر لگ رہا ہے پتا نہیں وہ کیا کرنے والا ہے اتنی خاموشی سے وہ تھپڑ کھا کر کیسے بیٹھ سکتا ہے وہ کوئی نہ کوئی قدم تو ضرور اٹھائے گا۔" سنبل آنکھ سے رومیلہ کو اشارہ کر رہی تھی کہ وہ تحمل کو خرم کے اظہار محبت کے متعلق بتا دے مگر رومیلہ نظر انداز کیے جا رہی تھی۔

اس کے خیال میں ایک دن میں اتنی ساری حیران کن باتیں ایک ساتھ بتا دینا ٹھیک نہیں اگر فیس بک میں یہ موی نہ ہوتی تو بات اور تھی مگر اب فی الحال تحمل کے سامنے یہ ذکر چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔

اور پھر خرم کے بار بار ذکر پر وہ چڑ بھی گئی تھی جبھی زچ ہو کر بولی۔

"وہ جب جو کچھ کرے گا تب دیکھ لیں گے تم تو اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی اس فکر میں آدھی رہ جاؤ گی۔"

"لیکن تحمل۔۔۔" سنبل نے کچھ کہنا چاہا لیکن تحمل نے ٹوک دیا۔

"یہ بتاؤ تم لوگوں نے موی دیکھی ہے کیا اس میں اس لڑکے کے ٹکرانے اور میرے اوپر پیپسی گرنے کا سین بھی کلیئر نظر آرہا ہے۔" اس کے سوال پر وہ دونوں ہی کچھ ہچکچا گئیں۔

"ہاں۔۔۔ نظر آرہا ہے۔" مگر سنبل اٹکتے ہوئے بولی تو تحمل نے فوراً لب بھینچ لیے جبکہ رومیلہ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"لیکن ان سب چیزوں پر کوئی دھیان نہیں دے رہا سب کی توجہ کا مرکز تو وہ زوردار تھپڑ ہے جو تم نے خرم کو مارا تھا اسی لیے تو وہ موی جب سے فیس بک میں ڈالی ہے خرم یونیورسٹی نہیں آرہا اس لیے جو کچھ بھی اس میں نظر آرہا ہے وہ اس کے لیے باعث شرم ہے تمہارے لیے نہیں۔"

"لیکن خرم آج تو یونیورسٹی آیا ہے۔" پارکنگ میں اپنی گاڑی کھڑی کرتے ہوئے تحمل نے سنجیدگی سے کہا تو رومیلہ اور سنبل دونوں اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگیں۔

خرم کی گاڑی اپنی مخصوص پارکنگ میں موجود تھی ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سنبل نے آنکھ سے اشارہ بھی کیا کہ اب تحمل کو اس کے اظہار کے متعلق سب بتا دو مگر رومیلہ ہلکے سے سر نفی میں ہلا کر رہ گئی۔

تحمل کا موڈ کافی خراب لگ رہا تھا خرم کی گاڑی دیکھ کر وہ جس طرح اسے دیکھتی رہ گئی تھی وہ اس کے تذبذب میں ہونے کو بخوبی ظاہر کر رہا تھا۔

آخر خرم اتنے دن بعد آیا تھا ابھی تو ویسے ہی یہ یونیورسٹی کا ہاٹ ٹاپک تھا خرم کے آنے پر تو اس ذکر کو کچھ اور زور و شور سے ابھرنا تھا یہ سوچ کر ہی تحمل کی کوفت میں اضافہ ہوتے جا رہا تھا مگر اب یہاں تک آجانے کے بعد وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی اور پھر وہ جب بھی آتی اس صورت حال کا سامنا تو کرنا ہی تھا پھر آج کیوں نہیں۔

تحمل گہرا سانس کھینچتی اپنی جگہ کا دروازہ کھول کر اتر گئی تو سنبل اور رومیلہ نے بھی تیزی سے اس کی تقلید کی۔

"اگر تمہارا موڈ نہیں ہے تو کل آجانا۔" رومیلہ بولی تحمل صرف نفی میں سر ہلا کر رہ گئی تو وہ تینوں خاموشی سے آگے بڑھنے لگیں۔

تحمل نے خود پر اٹھنے والی ہر نظر کو ٹھٹکتا دیکھ کر اپنے قدموں کی رفتار معمول سے بڑھا دی مگر جیسے ہی وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوئی ارد گرد گزرتے جتنے بھی لوگ تھے رک کر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

نمل کی رفتار اتنی تیز ہو گئی تھی کہ رومیلہ اور سنبل کو اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنا پڑ رہا تھا لیکن جیسے ہی نمل کلاس میں داخل ہوئی اس کے قدموں کو بریک لگ گئے۔

کلاس کی کچھ لڑکیاں جن سے اس کی اچھی خاصی بات چیت بھی تھی اسے دیکھتے ہی نعرہ لگانے والے انداز میں بڑے جوش سے ہم آواز ہو کر بولیں۔

"تھا جس کا انتظار وہ شاہکار بھی آ گیا۔"

نمل کوشش کرنے لگی کہ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل رہیں وہ خوامخواہ کا غصہ دکھا کر یا ناگواری ظاہر کر کے انہیں باتیں بنانے کا مزید موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

وہ سب تو اس صورت حال سے حظ اٹھا رہے تھے وہ جتنا چڑتی انہیں اتنا ہی مزا آتا جبکہ جتنا وہ سنجیدہ رہ کر بے نیاز نظر آتی اتنا ہی وہ اس واقعے کو جلد بھول بھال جاتے حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے مکمل طور پر لوگوں کے ذہنوں سے محو کرنا تو ناممکن تھا مگر اتنا ہی بہت تھا کہ لوگ اس بارے میں باتیں کرنا ہی چھوڑ دیں مگر اس مقام تک پہنچنے کے لیے اسے کئی مراحل سے گزرنا تھا جن میں سرفہرست ان لڑکیوں کے سوالوں کا جواب تھا جو اس کے گرد جمع ہونے لگیں۔

"کہاں غائب تھیں اتنے دنوں سے۔"

"ہم سب کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"پہلے تو اس مووی کو دیکھنے کے بعد تمہیں سراہنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"ہاں بھئی! کیا زوردار تھپڑ مارا ہے تم نے۔"

"وہ بھی خرم حسن کو!"

"جس سے یونیورسٹی کے لڑکے تو کیا پروفیسرز تک ڈرتے ہیں۔"

"مگر میری سمجھ میں تو یہ نہیں آیا تم نے اسے مارا کیوں وہ تو تمہیں بچانے آیا تھا۔"

"ارے وہ سب چھوڑو یار۔" ایک لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر ان سب لڑکیوں کی بھانت بھانت کی بولیوں کو بند کیا اور عین نمل کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا جیسے وہ کوئی بہت ہی خاص بات پوچھنے جا رہی ہو [illegible] ساری لڑکیاں بڑے تجسس اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"یہ سب ریئل میں ہوا ہے یا تم دونوں نے یونیورسٹی میں مقبول ہونے کے لیے یہ سارا ڈرامہ رچایا ہے۔" وہ بڑے تجسس خیز لہجے میں پوچھ رہی تھی نمل سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتی رہی تو وہ یہ سمجھی کہ نمل اس کی بات نہیں سمجھی اس لیے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو نا کلاس کے پہلے ہی دن تم نے اس کی کمپلین کی تھی اور اب یہ پھر بظاہر تو تم دونوں ندی کے دو کنارے لگتے ہو پھر اچانک یہ کنارے مل کیسے گئے۔" اس کے جملے کا ہلکا پن اور معنی خیز لہجہ نمل کی تیوری پر بل ڈال گئے۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"بھئی میں کہاں بکواس کر رہی ہوں خود [illegible] اپنی منگنی میں پوری کلاس کو انوائیٹ کیا ہے وہ بھی محض دو دن بعد۔" نمل کی ناگواری الجھن میں تبدیل ہونے لگی۔

وہ لڑکی بڑے اعتماد سے بول رہی تھی جھوٹ بولنے یا من گھڑت سنانے والی کوئی گھبراہٹ اس کے چہرے پر نہیں تھی۔

سنبل اور رومیلہ جو نمل سے تھوڑا ہی پیچھے کھڑی تھیں سوالیہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"میں سمجھی نہیں۔" نمل نے صاف پوچھ لینا ہی مناسب سمجھا۔

"سمجھ میں تو ہمارے بھی نہیں آ رہا۔ ایک طرف تو اتنا زوردار تھپڑ مارا ہے اور دوسری طرف اگلے ہی ہفتے اس کے ساتھ منگنی کر رہی ہو۔ وہ بھی اتنے اہتمام سے کہ پوری کلاس کو انوائیٹ کر لیا حالانکہ کلاس کے لڑکوں سے تو تمہاری بات چیت تک نہیں ہے۔" نمل کے اب بھی [illegible] آیا تھا البتہ رومیلہ اور سنبل دھک سے رہ گئی تھیں سنبل کو تو لگ رہا تھا اتنی بڑی بات وہ مذاق میں [illegible] سکتی تھی ساری لڑکیوں کی پرشوق نظریں نمل پر جمی تھیں یہ ضرور ایک اور بے ہودہ حرکت تھی جو [illegible] جانب سے کی گئی تھی مگر اس بار نام نمل کا استعمال کیا گیا تھا۔

جبکہ رومیلہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

خرم نے اس سے نمل [illegible] کا ایڈریس وغیرہ لینا چاہا تھا تاکہ اپنے والدین کو رشتے کے لیے بھیج سکے۔ اسے یہ یقین تو نہیں آ رہا تھا کہ اتنی جلدی نمل کی منگنی بھی طے ہو گئی اور اس کی ماں تک نے نمل سے ذکر نہیں کیا مگر اسے یہ ضرور لگ رہا تھا کہ یہ افواہ نہیں ہے۔

دو دن بعد منگنی ہو رہی تھی یا نہیں اس بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اسے یہ ضرور یقین تھا کہ خرم اگر [illegible] سے یونیورسٹی نہیں آیا ہے تو بھی گھر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھا رہا ہو گا۔ ضرور اس نے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے اور اسی کے نتیجہ میں یہ اس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔

ان تینوں کو ہی اپنی اپنی جگہ ساکت دیکھ کر ان لڑکیوں نے پھر بات شروع کی۔

"پہلے تو میں نے جب انویٹیشن کے بارے میں پڑھا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا۔"

"ہاں میں بھی یہی سمجھی کہ کسی نے مذاق کیا ہے۔ مگر خرم نے آ کر جس طرح اپنی کلاس میں مٹھائی بٹوائی ہے اس کے بعد تو یقین نہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔" نمل ایک دم چونک اٹھی۔

"تو یہ شوشا چھوڑا ہے خرم نے اپنا انتقام لینے کے لیے۔"

نمل کا خون رگوں میں ابلنے لگا۔

اس کی ہمت کیسے ہوئی اتنی بڑی بات کہنے کی۔

اس طرح کسی کے ساتھ اس کے نام کو منسوب کیے جانا ویسے ہی نمل کے لیے ناقابل برداشت تھا اس پر خرم کی طرف سے ایسے اقدام پر تو اس کا غصہ نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔

وہ لڑکیاں ابھی بھی بول رہی تھیں مگر نمل کو سوائے سائیں سائیں کے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا البتہ رومیلہ اور سنبل یہ سننے کے بعد کہ خرم نے مٹھائی تقسیم کرائی ہے دم بخود کھڑی ان کے مذاق اور طنز سن رہی تھیں۔

"اب ہمارے سامنے حیران ہونے کی ایکٹنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے ایک ساتھ تم دونوں نے اتنے دن چھٹیاں کیں اور ایک ساتھ ہی آج یونیورسٹی آئے ہو اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے تو اتنا ڈرامہ کیوں ہو بھئی۔"

"بلکہ تمہیں بھی خرم کی طرح مٹھائی لے کر آنا چاہیے تھا۔"

"ویسے سچ سچ بتاؤ یہ سب ہے کیا؟ ابھی تو تھپڑ مارا تھا اور اب اسی سے منگنی کر رہی ہو۔"

"کیا مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تھی اور وہ کیسے دور ہوئی؟"

"یا میرا اندازہ ہی ٹھیک ہے تم دونوں کا خاموش افیئر چل رہا تھا لیکن یونیورسٹی میں مشہور ہونے کے لیے خود ہی مووی بنا کر۔۔۔" بہت ہی معنی خیز انداز میں آنکھیں نچاتے ہوئے جملے کو دانستہ ادھورا چھوڑ دیا گیا نمل کو تو پہلے ہی

شدید غصہ آیا تھا "فقیر" جیسا گرا ہوا لفظ سن کر اسے اپنی شریانیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"شٹ اپ! زبان سنبھال کر بات کرو۔ غلطی سے نہ میری کوئی منگنی ہو رہی ہے اور نہ ہی میں نے کسی کو انوائیٹ کیا ہے یہ سب کسی کا تھرڈ کلاس مذاق ہے۔

بلکہ کسی کا نہیں' یہ سب یقیناً" خرم کا کیا دھرا ہے ایسی گری ہوئی حرکت اس کے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔" نمل غصے کی شدت سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رومیلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کلاس سے باہر کھینچنا شروع کر دیا۔

"چھوڑو مجھے رومیلہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" نمل اس کے ساتھ کھنچتے ہوئے بری طرح تلملائی مگر رومیلہ رکی نہیں بلکہ نمل کی باتیں سن کر لڑکیاں جو عجیب عجیب رد عمل کا مظاہرہ کرنے لگی تھیں ان کے تبصرے سننے سے پہلے ہی سنبل بھی ان دونوں کے پیچھے باہر آ گئی اور نمل کو رکنے کے لیے زور لگاتا دیکھ کر اس نے بھی ایک جانب سے نمل کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھسیٹنے لگی۔

"نمل چپ رہو اور چلو ہمارے ساتھ۔" سنبل نے دانت پیستے ہوئے کہا کلاس کے باہر ادھر سے ادھر گزرتے اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر ان تینوں نے ہی اپنی اپنی زور آزمائی کو قابو میں کر لیا تھا مگر نمل کے دونوں بازو ابھی تک ان دونوں کے ہاتھوں میں تھے جیسے انہیں ڈر ہو نمل ابھی بھی ہاتھ چھڑا کر کلاس کی لڑکیوں کے پاس پہنچ جائے گی۔

ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل کر آخر نسبتاً" ایک تنہا گوشے پر پہنچ کر نمل نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑوا لیے کیونکہ ان دونوں کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی اگر نمل اپنے بازو نہ بھی چھڑواتی تو بھی وہ چھوڑنے ہی والی تھیں۔

"تم دونوں نے مجھے ان سے بات کرنے کیوں نہیں دی میرے اس طرح بھاگ آنے پر تو وہ سب یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ میری منگنی واقعی خرم کے ساتھ ہو رہی ہے۔" نمل بپھر کر بولی تو رومیلہ سنجیدگی سے اس کی شکل دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"صرف وہی یہ نہیں سمجھ رہیں بلکہ میں بھی یہی سمجھ رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" نمل چڑ گئی۔

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ تمہاری منگنی واقعی خرم کے ساتھ ہو رہی ہے وہ بھی دو دن بعد تبھی خرم نے مٹھائی بٹوائی ہے ورنہ اس کا دماغ اتنا خراب نہیں کہ اتنی بڑی بات مذاق میں کہہ دے تاکہ کل کو خود اسی کا مذاق بن جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے پرسوں میری منگنی ہے اور مجھے پتا ہی نہیں ہے۔" نمل تنک کر بولی۔

"ایسا کوئی ناممکن تو نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں ہے کہ ماموں (عظمت علی) تمہیں بتا کر ہی تمہارا رشتہ کریں مجھے کون سا بٹھا کر میری رائے لی گئی تھی مجھ سے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا تمہیں بتانا تک ضروری نہیں سمجھا۔" رومیلہ کی بات ایسی تھی کہ نمل کا غصہ قدرے کم ہو گیا مگر وہ رومیلہ سے متفق تب بھی نہیں تھی تبھی سر نفی میں ہلاتے ہوئے رسانیت سے کہنے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ جو کچھ بھی ہے مجھے پریشان کرنے کے لیے خرم کی اڑائی ہوئی افواہ ہے میں اس بات کی کمپلین کروں گی تاکہ ..."

"کمپلین کرنے سے پہلے کنفرم تو کرو اصل میں میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا خرم اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر بھیجنا چاہ رہا تھا اس نے تمہارا ایڈریس بھی مانگا تھا اور ..."

"کیا؟" نمل چیخ پڑی تو رومیلہ تیزی سے بولی۔

"میں نے اسے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور مجھے تو یہی لگا کہ وہ تمہارے کینڈا سے آنے کا انتظار کر رہا ہے۔

لیکن اب مجھے لگ رہا ہے اس نے اپنے آپ سب کچھ پتا کر کے اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیج دیا ہو گا۔" رومیلہ کے تیز تیز کہنے پر نمل بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔ جب کہ دیر سے خاموش کھڑی سنبل نے لب کشائی کی۔

"اس نے رومیلہ کے سامنے اپنی محبت کا اقرار کیا ہے۔ He loves you" سنبل بڑی سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی مگر نمل کو اس کا انداز سراسر چھیڑتا ہوا لگا تھا تبھی اپنے غصے پر ضبط کرتے ہوئے چبا کر بولی۔

"اس نے کہا اور تم دونوں نے مان لیا۔"

"مجھے نہیں پتا کہ مجھے اس کی بات پر یقین کرنا چاہیے یا نہیں۔ لیکن میں نے یونیورسٹی کے بالکل شروع کے دنوں میں ہی کہہ دیا تھا کہ وہ تمہاری ذات میں غیر معمولی دلچسپی لیتا ہے۔" رومیلہ نے بے تاثر لہجے میں کہا تو نمل نے ایسے آنکھیں سکیڑیں جیسے خود کو کوئی بہت سخت بات کہنے سے روک رہی ہو۔

اسے اتنا سیریس دیکھ کر سنبل کچھ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

"اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو یہ تو تمہارے لیے خوشی کی بات ہے۔" نمل نے ایک دم آنکھیں کھول کر ایسے اسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو اور یہ بات سنبل کو بھی سلگا کر جرح کرنے والے انداز میں کہنے لگی۔

"خرم کوئی ایسا گرا پڑا نہیں ہے جو تم ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو اول تو کسی لڑکی کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے کہ کوئی اسے چاہتا ہے۔

خاص طور پر تب جب وہ کوئی چھچھورپن دکھانے کی بجائے پراپر طریقے سے رشتہ لے کر آ رہا ہو۔"

"اور جو کچھ وہ اب تک کرتا رہا ہے کیا وہ چھچھورپن نہیں ہے۔" نمل بگڑ کر بولی۔

"نمل تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس کی بنیاد پر تم اتنے یقین سے کہہ سکو کہ اس لڑکے کو تمہیں چھیڑنے کے لیے خرم نے ہی بھیجا تھا۔

اور اس ایک بات کے علاوہ اب تک خرم نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اتنا قابل گرفت بھی نہیں کہ تم اس کے لیے دل میں اتنی نفرت رکھو۔"

"میرے خیال سے ہم بے کار کی بحث کر رہے ہیں۔ نمل تم ممانی (رشیدہ) کو فون کرو تاکہ پتا چلے کہ اصل صورت حال کیا ہے۔" رومیلہ نے ایک دم بیچ میں بول کر ان دونوں کی ہی توجہ دوسری جانب مبذول کرانی چاہی۔ مگر نمل اپنے سابقہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

"امی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے ایسا کچھ اگر ہوتا تو امی اب تک مجھے بتا چکی ہوتیں۔ اگر کسی سے بات کرنے کی ضرورت ہے تو صرف خرم سے کیا سوچ کر اس نے یہ خرافات بکی ہیں۔" نمل کہہ کر رکی نہیں بلکہ ڈیپارٹمنٹ کی طرف ایسے پلٹی تھی جیسے خرم کو تلاش کرنے جا رہی ہو۔

"نمل کیوں اپنا تماشا بنانا چاہتی ہو۔ لوگوں کے بیچ میں تم اس سے کیا بات کرو گی۔ میری مانو پہلے ممانی کو فون ..." نمل رومیلہ کی بات کو بھی ان سنی کرتی جارحانہ انداز میں آگے بڑھتی رہی۔

سنبل اور رومیلہ پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہی ہوں اس کے پیچھے جاؤ اور اسے روکو۔

مگر دونوں میں ہی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی خرم ویسے ہی ہر وقت دوستوں کے جمگھٹے میں گھرا ہوتا تھا۔ تو آج تو صورت حال بھی مختلف تھی پتا نہیں اس کی ارد گرد کتنا رش ہوگا اور نمل کو اس کے روبرو دیکھ کر جو لوگ متوجہ نہیں بھی ہوں گے وہ بھی کھنچے چلے آئیں گے۔

یہی سب سوچتے ہوئے وہ دونوں اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

جبکہ نمل سمت کا تعین کیے بغیر تیز تیز قدموں سے چلتی ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اسے یہ نہیں پتا تھا کہ خرم اس وقت اسے کہاں ملے گا نہ ہی یہ ہوش تھا کہ اس کے ساتھ اس وقت کون کون ہوگا اس کا ذہن تو بس بے تحاشا سوالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ اسے تلاش کرنے کے لیے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتی اسے ڈیپارٹمنٹ کے باہر ہی خرم نظر آ گیا۔

وہ بھی متلاشی نظروں سے ایسے ادھر ادھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو نمل واپس پلٹ کر تیز تیز چلتی اس کے پاس پہنچی اور بڑے جارحانہ انداز میں بولی۔

"یہ سب کیا ہے خرم؟" اس کی آواز پر خرم چونک کر پلٹا تھا۔

وہ اسے ہی ڈھونڈتا باہر آیا تھا۔ نمل جس طرح ان لڑکیوں کے سامنے شادی سے انکار کر کے کلاس سے باہر نکلی تھی وہ انداز دیکھ کر لڑکیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی ان میں سے دو تین لڑکیاں جو خرم کی ظاہری پرسنالٹی کی وجہ سے اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں اور اس وقت اس کی منگنی کا سن کر بہت بے چین ہو گئی تھیں فوراً" خرم کے پاس جا پہنچیں اور نمل کے رد عمل کے متعلق بتا کر استفسار کرنے لگیں۔

خرم کو بھلا انہیں صفائی دینے کی کیا ضرورت تھی وہ محض ہنس کر ٹال گیا مگر ان کے کہے کے مطابق کہ نمل کو ڈیپارٹمنٹ کے باہر جاتا دیکھا ہے اس سے بات کرنے کے لیے اسے وہیں ڈھونڈنے نکل آیا مگر وہ تو [illegible] مڑ گیا تھا یہ تو اچھا ہوا نمل نے خود ہی آ کر اسے پکار لیا۔

خرم اس وقت اتنا سرشار تھا کہ نمل کے لہجے اور تاثرات پر غور ہی نہ کر سکا۔

اس نے جو چاہا تھا اب کچھ عین اس کی خواہش کے مطابق ہو گیا تھا اتنی جلدی نمل کے والدین نے رشتہ منظور کر کے منگنی کی تاریخ بھی دے دی تھی اور وہ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد آیا تو اپنے اسی خود اعتماد انداز کے ساتھ ہی آیا۔

اس کی لائی ڈھیروں مٹھائی نے واقعی تہلکہ مچا دیا تھا سب ہی اس کے پاس حیران ہو کے چلے آ رہے تھے اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ یہ سب کیسے ہوا۔

اگر یہ سچ تھا تو اس مووی میں کیا تھا اور اگر وہ سچ تھا تو یہ کیا ہے؟

خرم کسی کو بھی جواب دیے بغیر ان کی حیرانی سے لطف اندوز ہوتا محض ہنس کر انہیں ٹال دیتا۔

سب سے زیادہ سکون تو اسے سمیر کے گروپ کو مٹھائی پیش کر کے حاصل ہوا تھا۔

سمیر کے پاس جا کر اس نے خود سے ڈبا پیش کیا تھا جواب میں سمیر کو مبارک باد تو خیر کیا دینی تھی البتہ اس کی خاموشی اس کے لاجواب ہونے کو ظاہر کر گئی۔

وہ تو انتظار میں تھا خرم آئے تو اس کی وہ عزت افزائی کریں کہ دوبارہ آنے کا ارادہ نہ کرے مگر نمل کے ساتھ

منگنی کا اعلان کر کے اس نے تو پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر خرم کی روح تک شانت ہو گئی تھی وہ اپنے اسی پر کیف لمحوں کو محسوس کرتا تسکین بھرے انداز میں نمل کی طرف پلٹا تو اسے دیکھ کر کچھ لمحوں کے لیے سب بھول ہی گیا کہ کچھ دن پہلے اسی لڑکی نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا اور اسے جی بھر کر ذلیل کیا تھا۔

کہتے ہیں اندر کا موسم خوب صورت ہو تو باہر کی ہر چیز خوب صورت لگتی ہے شاید یہی وجہ تھی کہ اس پل نمل پر نظر پڑتے ہی وہ کہیں کھو سا گیا تھا۔

لائٹ گرین کلر کے سادہ سے سوٹ میں بالوں کی سیدھی سی چوٹی بنائے وہ بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی جیسی ہمیشہ لگتی تھی اس نے آج کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا اور نہ ہی نیا پن تھا پھر بھی اس پل وہ خرم کو بہت منفرد لگی تھی۔

شاید غصے کی وجہ سے اس کے چہرے پر پھیلی سرخی نے اسے ایک عجیب سی شادابی بخش دی تھی یا موسم اتنا خوشگوار ہو رہا تھا کہ اس کا نکھرا نکھرا وجود بھی اس ہلکی ہلکی ہوا اور نرم گرم دھوپ کا حصہ لگ رہا تھا۔

دو دن بعد اس لڑکی کے ساتھ اپنے گھر میں اس کی منگنی ہونے والی تھی اس خیال نے کچھ لمحوں کے لیے اس کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کیا تھا مگر محض کچھ لمحوں کے لیے کیونکہ نمل کے تیز لہجے نے اس پر چھاتے خمار کو ایسے اتارا تھا جیسے کسی ہوا سے بھرے غبارے میں سوئی چبھو کر پھس سے کر دیا جائے۔

"یہ بکواس کی ہے تم نے یونیورسٹی میں۔" نمل سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے نہایت سختی سے بولی تو خرم پلکیں جھپکاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا تاکہ تھوڑی دیر پہلے وہ جس کیفیت سے گزرا تھا اس کا شائبہ تک اس کی آنکھوں اور لہجے میں نہ ہو۔

"میں نے تو کوئی بکواس نہیں کی۔" اس نے محض خود پر چھائے جمود کو توڑنے کے لیے زبان کھولی ورنہ وہ حقیقتاً سمجھا ہی نہیں تھا کہ نمل کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

"یہ بکواس نہیں تو اور کیا ہے کہ دو دن بعد ہماری منگنی ہو رہی ہے۔" نمل چیخ کر بولی۔

اب کی بار خرم نے چونک کر بغور اسے دیکھا تھا جب ان لڑکیوں نے آ کر کہا تھا کہ نمل تو مان ہی نہیں رہی کہ اس کے ساتھ تمہاری منگنی ہو رہی ہے تب اس نے زیادہ یقین نہیں کیا تھا۔

صنف مخالف کی اپنے اندر دلچسپی کو وہ خود بھی بہت اچھی طرح سمجھتا تھا وہ ان لڑکیوں کی باتوں کو مبالغہ آرائی کے غلاف میں لپٹی جلن ہی سمجھا تھا۔

البتہ یہ جان کر کہ نمل بھی یونیورسٹی آ گئی ہے اس سے ملنے چلا آیا تھا مگر اس کی طرف سے اس قسم کے رد عمل کی تو اسے توقع ہی نہیں تھی۔

اس کے چہرے پر مذاق یا خواہ مخواہ انجان بننے کی کوشش کرنے والی اداکاری کی رمق تک نہیں تھی اس کے برعکس وہ بڑے تپے ہوئے لہجے میں سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"دو دن بعد واقعی ہماری منگنی ہو رہی ہے اس لیے میں نے ایسا کہا ہے مجھے بھلا جھوٹی افواہ اڑانے اور فضول بکنے کی کیا ضرورت ہے۔" خرم نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو فوراً" کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر جانے کس چیز نے اسے ایک دم بولنے سے روک دیا۔

یا تو رومیلہ کی تھوڑی دیر پہلے کی کہی بات نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کیا تھا یا خرم کے چہرے پر پھیلا سکون اس کی صداقت کو ظاہر کر رہا تھا۔

بہرحال کچھ بھی تھا وہ جتنی خود اعتمادی سے اس سے جرح کرنے آئی تھی اس میں دراڑیں پڑ گئی تھیں تبھی جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں اتنا دم نہیں تھا۔

"تم... تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا بلکہ تم انجان بننے کا ڈرامہ کر رہی ہو۔ میرے والدین تو باقاعدہ تمہارے گھر آئے تھے رشتہ مانگنے۔

اور تمہارے فادر عظمت خلیل نے خود اس رشتے کی منظوری دی ہے وہ تو فوری شادی کی خواہش کر رہے تھے مگر میرے پیرنٹس فی الحال صرف منگنی پر آمادہ ہوئے ہیں وہ بھی بڑی مشکل سے کیونکہ وہ ہمارے نئے گھر میں منگنی کرنا چاہ رہے تھے۔ منگنی تو وہ خیر نئے گھر میں ہی کر رہے ہیں مگر اب شفٹنگ کا کام بڑی افراتفری میں ہو رہا ہے جو کہ ڈیڈ کے مزاج کے بالکل برعکس ہے مگر اتنی جلد بازی صرف تمہارے فادر کے پرزور اصرار پر ہو رہی ہے۔" خرم بڑی تفصیل سے بولا مگر یہ بات نہیں بتائی اس کے والد سے زیادہ فرقان حسن، خرم کے پرزور اصرار پر اس افراتفری کی منگنی کے لیے تیار ہوئے ہیں۔

نمل کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ خرم کی کہی ساری باتیں جھوٹ ہوں مگر دماغ اسے جھنجوڑ رہا تھا کہ کل سے اب تک عظمت خلیل نے اسے بلا کر اس کی کلاس نہیں لی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اتنے مصروف ہیں کہ انہیں اپنا غصہ نکالنے کا وقت نہیں مل رہا۔

بلکہ وہ اپنی بجڑاس اس کی زندگی کا فیصلہ کر کے اس کے پیچھے ہی نکال چکے ہیں اب انہیں اس سے کچھ کہہ کر یا اس کی سن کر اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ بے یقینی سے خرم کو دیکھے گئی تو خرم نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے قدرے شوخی سے کہا۔

"یقین نہیں آ رہا نا خواب ایسے بھی پورے ہوتے ہیں۔" خرم نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو نمل چوکتے ہوئے تلملا گئی۔

"تم نے مجھ سے پوچھے بغیر اپنے پیرنٹس کو میرے گھر کیسے بھیج دیا۔"

"کیونکہ مجھے لگا تم انکار کر ہی نہیں سکتیں تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" خرم نے مسکراتے ہوئے محض اسے جلانے کے لیے کہا تو وہ واقعی بری طرح سلگ گئی۔

"میں تب تو کیا اب بھی انکار کر سکتی ہوں اور کر رہی ہوں۔"

"ہماری کوئی دو دن بعد منگنی وگنی نہیں ہو رہی اپنے گھر میں بھی بتا دو اور یونیورسٹی میں بھی۔" نمل کے صاف انکار پر خرم چاہتے ہوئے بھی اپنی مسکراہٹ کو مدھم پڑنے سے نہ روک سکا۔

"انکار کرنا تھا تو اپنے والدین کے سامنے کرتیں میرے سامنے اتنا بھاؤ کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" خرم نے طنزیہ انداز میں کہا تو نمل کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا اس کے والدین نے اسے موقع ہی کب دیا تھا جو وہ اپنی رائے کا اظہار کرتی۔ گو کہ یہ بات خرم کے سامنے کہنا اسے اپنی بے عزتی لگی اسے یہ سوچنے کا موقع دے کر مزید خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ یہ فیصلہ نمل کی رضامندی سے ہوا ہے اور وہ محض اس کے سامنے بھرم دکھا رہی ہے۔

"میرے والدین نے یہ فیصلہ میرے پیچھے کیا ہے۔ میں کینیڈا گئی ہوئی تھی اگر وہ مجھ سے پوچھتے تو میں اسی وقت انکار کر دیتی۔" نمل کے دو ٹوک لہجے پر ایک پل کے لیے خرم کے اندر سناٹا چھا گیا۔

یہ لڑکی کتنی بار اسے ذلیل کر چکی تھی ہر بار پہلے سے زیادہ بے عزتی کا احساس ہوا تھا اس وقت بھی اس نے یہ سوچ کر خود کو بھڑکنے سے روکے رکھا کہ وہ کون سا اس سے محبت میں شادی کر رہا ہے وہ تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اچھا ہی ہے اگر وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہے اس طرح تو اس کے جذبہ انتقام کو اور تسکین ملنی چاہیے۔

خرم نے خود کو سمجھاتے ہوئے فوراً ہی اپنا لہجہ شوخ بنا لیا۔

"یار کیوں ڈرامہ کر رہی ہو مان لو تم نے اپنی خوشی سے اس رشتے کو قبول کیا ہے مجھے تو پتا ہی ہے کہ ساری لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں ایک اگر تمہارا حال دل بھی پتا چل جائے گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"شٹ اپ..."

"مجھ پر چلانے سے کیا ہو گا بھئی تم خود بتاؤ کیا یہ ماننے والی بات ہے کہ تمہارے ماں باپ نے تم سے پوچھے بغیر تمہاری شادی طے کر دی اور تو اور منگنی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی اور تمہیں خبر تک نہیں۔

اول تو مجھے یہ ہی یقین نہیں ہے کہ تم کینیڈا گئی ہوئی تھیں جب میرے پیرنٹس تمہارے گھر آئے تھے تب تمہارے والدین نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی کہ تم ملک سے باہر گئی ہوئی ہو۔

چلو خیر میں مان لیتا ہوں کہ تم یہاں نہیں تھیں مگر آج کے دور میں تو فاصلے بالکل سمٹ گئے ہیں وہ پاکستان میں بیٹھ کر بھی تمہاری رائے لے سکتے تھے یا تمہارا انتظار ہی کر لیتے مگر وہ تو اتنی جلد بازی دکھا رہے تھے جیسے تم کسی کے ساتھ بھاگنے کا ارادہ رکھتی ہو۔" خرم کا تمسخرانہ انداز کسی زناٹے دار تھپڑ کی طرح اسے لگا تھا۔

اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی مگر وہ خرم کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی اس لیے اپنی رو ہانسی ہوتی آواز پر قابو پاتے ہوئے سرد لہجے میں بولی۔

"اچھا اس بحث کو رہنے دو کہ اس شادی میں میری مرضی شامل ہے یا نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم یہ شادی کیوں کر رہے ہو۔ اس تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے؟" نمل نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنے اعتماد سے کہا جیسے اس سے پوچھ نہ رہی ہو بلکہ وہ خود ہی اس حقیقت کو جانتی ہو بس اس کے منہ سے سننا چاہتی ہو۔

خرم غیر ارادی طور پر اس کی آنکھوں میں دیکھتا چلا گیا بہت خوب صورت تھیں اس کی آنکھیں۔ بہت بڑی اور بہت گہری۔ اتنی گہری کہ ان میں دیکھنے والا خود کو ان میں ڈوبتا محسوس کرنے لگے۔

اور ان پر تنی سیاہ گھنی پلکوں کی جھالر ایسے ان آنکھوں پر سایہ فگن تھی جیسے کسی گہری جھیل کے ارد گرد گھنے درختوں کی قطار ہی ہو جو اس جھیل کو ہر چبھتی ہوئی روشنی سے بچا کر اسے ایک عجیب طرح کی ٹھنڈک بخش رہی ہو اور اس کی گہرائی میں اضافہ کرتے ہوئے اسے مزید پراسرار بنا رہی ہو۔

جسے دیکھنے والا دور سے ہی اس میں اتر کر اس کے اسرار و رموز کو جاننے کے لیے بے چین ہو جائے۔

"نہیں بلکہ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

خرم کے گمبھیر لہجے پر ثمل سن ہو گئی۔
اس جواب کی اسے قطعاً توقع نہیں تھی ایسا نہیں تھا کہ وہ خرم کے منہ سے یہ سب سن کر بہت خوش ہو گئی تھی یا یہ اقرار سن کر اسے خرم کے ساتھ اپنی شادی طے پائے جانے پر اطمینان ہو گیا تھا۔
خرم کے رویوں سے اختلاف بدستور اپنی جگہ قائم تھا اسے صرف شدید قسم کی حیرانی ہوئی تھی۔
اور یہ بھی ایک حقیقت تھی اس سے اس قسم کی بات کبھی کسی نے کہی نہیں تھی کسی کے منہ سے اپنے لیے اظہار محبت سننا اس کے لیے ایک بالکل انوکھا اور عجیب نیا سا تجربہ تھا۔
اس کے خوشگوار اور ناخوشگوار ہونے پر غور کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ابھی تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
اس کے چہرے پر شرم و حیا کا کوئی رنگ نہیں ابھرا تھا اور یہ بات خرم نے ایک پل میں نوٹ کرلی تھی۔
اس کا ارادہ ثمل سے کوئی اظہار محبت کرنے کا نہیں تھا نہ ہی وہ یہ شادی اس کی محبت میں گرفتار ہو کر کر رہا تھا یہ جملہ تو بالکل بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا شاید وقتی طور پر وہ اس کے حسن کا زیر بار ہو گیا تھا۔
یا شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس پر اتنا بگڑنے اور غصہ کرنے والی لڑکی اگر اس کے منہ سے ایسی کوئی بات سنے تو اس کا رد عمل کیا ہو گا۔
لاشعوری طور پر وہ اس کو شرماتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا گویا اسے اپنے سامنے سرنگوں کر کے اپنی انا کو تسکین پہنچانا چاہتا تھا مگر جب اس کے چہرے پر خرم کے حسب خواہش کوئی رنگ نہیں اترا تو خرم کا رومانس جھاڑنے کا سارا نشہ اتر گیا۔
ایک طرح سے جب وہ خرم کو اسے تسخیر کرنے کی خوشی نہیں دے رہی تھی تو خرم کیوں اس کے سامنے ہارنے کا غرور اسے بخشتا۔
تبھی خرم نے ایک پل میں اپنے چہرے کے تاثرات تبدیل کرتے ہوئے تمسخر اڑانے والے انداز میں کہا۔
"کیا تم یہ سننا چاہتی تھیں کہ خرم حسن تمہارے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرے
تمہیں یہ تو پتا چل ہی گیا ہو گا کہ کسی نے ہماری مووی فیس بک میں ڈال دی ہے بس اسی کا حساب برابر کرنے کے لیے تمہارے گھر اپنے پیرنٹس کو بھیج دیا تھا تاکہ لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔
ورنہ تمہارے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے تو میں اور بھی کئی طریقے اپنا سکتا تھا اس کے لیے تمہارے جیسی معمولی سی لڑکی سے شادی کر کے اسے اتنا خاص بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔" ثمل جو ایک شاک میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پینترا بدلنے پر اس کی اٹکی سانس بحال ہو گئی۔
حالانکہ خرم کا انداز اسے سراسر ہتک آمیز لگتا تھا مگر اس قسم کے جملے [illegible] سے عجیب نہیں لگتے تھے جبکہ جو بات تھوڑی دیر پہلے اس نے کہی تھی اسے برداشت کرنا [illegible] تھا جبکہ خرم مزید وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگا۔
"اب اس ایک تھپڑ کی قیمت تمہیں ساری زندگی چکانی ہو گی۔" ثمل جو تھوڑی دیر پہلے عجیب و غریب قسم کے احساسات کا شکار ہو گئی تھی طیش میں آتے ہوئے اس کی زبان ایک دم کھل گئی۔
"اس غلطی میں کبھی مت رہنا کہ میں زندگی بھر تمہیں برداشت کروں گی۔ یونیورسٹی میں مٹھائی بانٹ دینے سے ہماری شادی نہیں ہو گی۔
دو دن بعد جس منگنی کا تم خواب دیکھ رہے ہو وہ بھی محض خواب ہی رہے گا۔" ثمل نے بظاہر بڑے مضبوط لہجے میں کہا مگر خرم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"اگر تمہارا انکار اتنا اہم ہوتا کہ دو دن بعد ہونے والی متوقع منگنی کو روک سکتا تو تمہارے والد تمہارے علم میں لائے بغیر اقرار ہی نہیں کرتے۔" بیچارا اکثر وہ ہوتا ہے اور اگر اسے مکمل نظر انداز کر دیا جائے تو مقابل بلبلا اٹھتا ہے جیسے اس وقت ثمل اس کی بات سن کر تڑپ اٹھی تھی اس نے بغیر سوچے کہ وہ واقعی اس شادی سے انکار کر بھی سکے گی یا نہیں بڑے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔
"ابو نے حقائق جانے بغیر اس رشتے کی ہامی بھری ہے جب میں ان کے سامنے انکار کروں گی تو وہ ایک پل میں اس رشتے کو ختم کر دیں گے۔
کیونکہ تم سے شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ انسان زہر پی لے۔" ثمل زہر خند لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے پلٹنے لگی تو خرم نے سختی سے اس کا بازو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔
"سوچ سمجھ کر بولا کرو آج کے بعد تمہیں اپنے کہے ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہو گا۔" اس کی انگلیاں ثمل کی ہڈیوں میں گڑ گئی تھیں تکلیف کے باعث اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی مگر اس کا غصہ ہر احساس پر حاوی ہونے لگا۔
خرم کی اس بے باکی پر دل تو چاہ رہا تھا ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دے مگر ثمل کی کہی بات سن کر خرم کافی طیش میں آ چکا تھا اسے اندیشہ تھا تھپڑ کے جواب میں وہ بھی کوئی نازیبا حرکت کر گزرتا۔
لہٰذا ثمل خود پر ضبط کرتے ہوئے محض اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی جس میں اسے مکمل طور پر ناکام دیکھ کر خرم کے چہرے کا تناؤ ایک دم غائب ہو گیا وہ اپنی اسی سابقہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ تپانے والے انداز میں بولا۔
"اتنی نازک سی تو ہو کیوں میرے جیسے فولاد سے ٹکرا رہی ہو ایسا کرو پوری یونیورسٹی کے سامنے میرے پاؤں پکڑ کر اپنے تھپڑ کی معافی مانگ لو میں یہ رشتہ ختم کر دوں گا کیونکہ تمہاری جیسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے میں مجھے خود بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے صرف اور صرف اسے جلانے کے لیے بولا تھا۔
ورنہ تو اسے خود بھی معلوم تھا ثمل جیسی خوددار اور ضدی لڑکی پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہو گی وہ بھی سب کے سامنے۔
"میں تمہارے پاؤں پکڑوں گی اور نہ ہی تمہارے ساتھ شادی کروں گی تم یہ حسرت لیے مر جاؤ گے۔" ثمل کا چہرہ غصے اور تکلیف سے بالکل لال ہو گیا تھا مگر پہلی بار اس کے لہجے کی سختی سے خرم خائف نہیں ہوا۔
وہ ایک ہاتھ سے مسلسل اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر خرم کا ہاتھ تو کیا ایک انگلی تک اپنی جگہ سے ہلانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اس کے چہرے پر پھیلی سرخی اس کی بے بسی کی مکمل عکاسی کر رہی تھی۔
ایسے میں ثمل کے خالی خولی جملے بھلا خرم کو کیا تکلیف دیتے بلکہ اس کا دھمکی آمیز لہجہ خرم کو ہنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔
اس کی ہنسی ثمل کو جلا کر خاک کر گئی تھی دل تو چاہ رہا تھا کہ اس کے منہ پر تھوک دے مگر وہ عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔
وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی پرفیوم کی تیز خوشبو سے ثمل کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی ایسے میں ثمل کی ایک غلط حرکت اسے کسی بھی حد تک جانے پر اکسا سکتی تھی۔
البتہ اپنی بے بسی کا احساس اسے روہانسا ضرور کر گیا تھا مگر اس نے کمال مہارت سے اپنے تاثرات چھپا رکھے تھے وہ اس کے سامنے آنسو بہانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

آخر خرم نے خود ہی اس کا بازو چھوڑتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں کون کس کی حسرت لیے مرتا ہے' مستقبل کی مسز خرم حسن۔" اس کے بازو چھوڑتے ہی نمل فورا" پانچ چھ قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ جانے کون سے موذی مرض میں مبتلا ہو۔

اس کا طرز تخاطب نمل کو سرتاپا سلگا گیا تھا مگر وہ مزید اس کے پاس کھڑے ہو کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے محض جان چھڑانے والے انداز میں کہتی پلٹ گئی۔

"تم دیکھو' میں تو جانتی ہی ہوں۔" نمل یونیورسٹی میں مزید نہ رکنے کا فیصلہ کرتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی جہاں سنبل اور رومیلہ کو پہلے سے موجود پا کر وہ پل بھر کو حیران ہوئی مگر فورا" ہی اس کی حیرت ختم بھی ہو گئی۔

وہ دونوں اس کے مزاج سے اتنی اچھی طرح واقف تھیں کہ انہیں بغیر کہے ہی پتا چل گیا تھا کہ نمل اب فورا" گھر جانے کا ارادہ کرے گی۔

وہ دونوں بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھنے لگیں تو نمل بے ساختہ بول اٹھی۔

"تم دونوں کیوں میری وجہ سے اپنی پڑھائی ڈسٹرب کر رہی ہو۔"

"ہم تو پھر بھی پڑھ رہے ہیں تمہاری تو سرے سے کوئی پڑھائی ہی نہیں ہو رہی۔" سنبل نے موضوع سے پہلو تہی کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

"اور میری پڑھائی آٹھ دس دن بعد چھٹنے ہی والی ہے۔" رومیلہ کے لہجے میں پہلی بار یہ بات کہتے ہوئے کوئی حسرت نہیں تھی۔

نمل اتنے ذہنی انتشار کے باوجود اسے ٹھٹک کر دیکھنے لگی' بہت ہی مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹ کے کنارے پر ابھر کر اتنی تیزی سے غائب ہو گئی کہ رومیلہ اور سنبل تو کیا خود اس کے ہونٹوں کو بھی پتا نہیں چلا کہ وہ مسکرائی ہے۔

سنبل کو گھر پر ڈراپ کرنے کے بعد جب اس نے گاڑی رومیلہ کے گھر کی طرف موڑنی چاہی تو رومیلہ نے منع کر دیا۔

"میں تمہارے ساتھ ہی تمہارے گھر چلوں گی۔" نمل صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔

راستے میں اس نے خرم کے ساتھ ہوئی گفتگو کا مختصر احوال سنا ہی دیا جسے سننے کے بعد سنبل اور رومیلہ دونوں ہی نہایت سنجیدہ ہو گئی تھیں اس لیے نمل کو یہ بھی پتا تھا کہ رومیلہ اس کے ساتھ کیوں جانا چاہ رہی ہے۔

وہ خود عظمت خلیل سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ رومیلہ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا الٹا اسے شدید منہ کی کھانی تھی۔

نمل تو ان کے ساتھ تلخ کلامی کرنے اور سننے کی عادی ہو چکی تھی جبکہ رومیلہ سے یہ لب و لہجہ یقینا" ناقابل برداشت ہوتا پھر بھی نمل نے اسے منع نہیں کیا اس سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں تھا جس کی پردہ داری کی جاتی۔

گھر پہنچنے پر نمل نہ چاہتے ہوئے بھی رشیدہ کے سامنے اپنی ناراضی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی مگر رشیدہ کے چہرے پر پھیلی بے بسی دیکھ کر اس نے موضوع کو طول دینے سے خود کو ضرور روک لیا۔

رومیلہ کے مرہون منت تھوڑی دیر تو ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ مگر پھر گفتگو گھوم پھر کر نمل کی شادی پر آ رکی۔

رشیدہ نے اسے خرم کے والدین کے آنے سے لے کر عظمت خلیل کے بغیر خرم کو دیکھے اور طے رشتے کی ہامی بھر لینے والی تمام باتیں تفصیل سے بتا دیں۔

مگر حیرت انگیز طور پر نمل کو اس دفعہ بھی غصہ نہیں آیا وہ عجیب یا سیت بھری نظروں سے رشیدہ کو دیکھتی رہی۔

اسی لیے تو خرم پر اس کا انکار کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اس کے والد نے اس کی شخصیت کو خود ہی دو کوڑی کا کر کے خرم کے سامنے اس کے ہر لفظ کا مطلب بے معنی کر دیا تھا۔

جس لڑکی کا والد رشتہ قبول کرتے وقت اگلے ہفتے بارات لانے کی بات کر رہا ہو اس لڑکی کی اور اس کے انکار کی بھلا لڑکے والوں کی نظر میں کیا وقعت رہ جائے گی۔

خرم کا مغرور سا انداز اسی لیے تو ہر خوف و خطرے سے آزاد تھا کہ اگر اس کے انکار یا اقرار کی اتنی حیثیت ہوتی تو یہ فیصلہ اس کی بے خبری میں ہرگز نہ ہوتا اور نہ ہی اس کے والد اس کی شادی کے لیے اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرتے۔

نمل غیر حاضر دماغ کے ساتھ بیٹھی رشیدہ اور رومیلہ کی گفتگو سنتی رہی مگر رات کے کھانے کے وقت جب عظمت خلیل گھر آئے تو نمل ایک دم اس خود ترسی سے باہر نکل آئی اور جا کر ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔

عظمت خلیل فیصلہ کر کے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ انہیں اب نمل پر کسی قسم کا غصہ بھی نہیں آ رہا تھا اور اسی لیے وہ اس کے ساتھ بحث کر کے اپنا وقت بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

نمل نے بات شروع ہی کی تھی کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ایک جملے میں اسے خاموش کر دیا۔

"اگر تم نے اس شادی سے انکار کیا تو میں تمہاری ماں کو طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔" اتنا بڑا لفظ استعمال کرتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی ان کا چہرہ متغیر ہوا تھا نہ ان کا لہجہ کانپا تھا۔

وہ صرف کہہ نہیں رہے تھے وہ واقعی ایسا کر بھی سکتے تھے نمل سکتے کے عالم میں انہیں دیکھے گئی اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں ان کی بے حسی کو دیکھ کر۔

ایک عورت جس نے ان جھڑکیوں اور بے نیازی کے باوجود اتنے سال ان کی خدمت کرتے ہوئے خاموشی سے گزار دیے اس عورت کو وہ محض اپنی اولاد کو نیچا دکھانے کے لیے اس عمر میں زندہ درگور کر سکتے تھے۔

عمر کے اس حصے میں ان کے سر میں خاک ڈالنے پر تلے ہوئے تھے اس کی معذوری و بے بسی کا احساس ہونے کے باوجود اسے رسوا کرنے پر کمربستہ تھے۔

نمل شاک میں کھڑی تھی اور وہ اپنا حربہ کامیاب ہوتا دیکھ کر سکون سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے ان کی غرور سے تنی گردن چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ انہوں نے بغیر لڑے ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔

نمل ان کے جانے کے بعد بھی جانے کتنی دیر ایسے ہی کھڑی رہتی کہ رشیدہ کی سسکیوں کی آواز اسے دوبارہ ہوش میں لے آئی وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھی۔ مگر انہیں چپ نہ کرا سکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ان سے کیا کہے زبان گنگ ہو گئی تھی جبکہ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی۔ میری وجہ سے..... میری وجہ سے تمہیں ہمیشہ کتنی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور آج۔۔۔ آج۔" آنسو میں شدت آنے پر ان سے جملہ بھی پورا نہیں ہوا۔

نمل چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی تو رومیلہ ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"نہیں ممانی آپ کی وجہ سے نہیں بلکہ میری وجہ سے آج نمل کے ساتھ یہ سب ہو رہا ہے نہ وہ میری خاطر کینیڈا جاتی اور نہ اسے خرم سے شادی کرنی پڑتی۔" نمل چونک کر رومیلہ کو دیکھنے لگی اس کا کہا لفظ "خرم سے شادی" کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے اعصاب پر جا لگا تھا بے اختیار اسے صبح خرم کا کہا یاد آ گیا۔

"مستقبل کی مسز خرم حسن!"

اس کا وہ بازو بری طرح جلنے لگا جسے خرم نے اپنی آہنی گرفت میں لیا ہوا تھا رشیدہ اور رومیلہ، نمل کو فراموش کیے ایک دوسرے کو بے قصور اور خود کو نمل کا قصوروار قرار دے رہے تھے۔

جبکہ نمل آستین اوپر کر کے اپنے بازو کو دیکھنے لگی جہاں ابھی تک خرم کی سخت گرفت کی وجہ سے سرخی مائل نشان بنا ہوا تھا۔

"تم سے تو میں کبھی شادی نہیں کروں گی خرم بلکہ تمہارا حشر بھی ایسا ہی کروں گی۔" نمل اس کی انگلیوں کے نشان کو دیکھتے ہوئے زیر لب ایسے بولی جیسے اپنے بازو پر بنے نشانوں سے نہیں بلکہ خرم سے مخاطب ہو۔

☆☆☆

نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد فوری طور پر زوبیہ کو سارا ماحول بڑا عجیب لگا تھا سارا دن عجیب بھاگ دوڑ میں گزرا اور رات کو تھکن کے باوجود وہ گہری نیند نہ سو سکی۔

عجیب سی بوریت کا احساس ہو رہا تھا جو صرف اسے ہی نہیں بلال اختر اور عائشہ اختر کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔

عائشہ اختر تو برملا اپنی بے زاری کا اظہار کر رہی تھیں جبکہ بلال اختر بظاہر تو خاموش تھے مگر ان کے چہرے پر ایک کوفت نمایاں تھی۔

تقریباً ہفتے بھر بعد کہیں جا کر ساری چیزیں ترتیب سے لگیں تو مکان کچھ کچھ گھر لگنے لگا۔

بہت دنوں بعد عائشہ اختر نے ملازمہ کو ہٹا کر خود کھانا پکایا تو کھانے کی میز پر ان تینوں کو ہی ایک خوشگوار سا احساس ہوا۔

"بس اب کل سے تم ہی کھانا پکاؤ گی۔" بلال اختر نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا تو عائشہ اختر انہیں مصنوعی خفگی سے دیکھنے لگیں۔

"میری سارا دن کی محنت کا آپ مجھے یہ صلہ دے رہے ہیں کہ انعام کی بجائے مجھے سزا مل رہی ہے۔" ان کے انداز پر زوبیہ تک کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"لیکن ممانی پاپا صحیح کہہ رہے ہیں کوکنگ آپ کو ہی کرنی چاہیے آج واقعی کھانا کھا کر مزا آیا ہے۔" زوبیہ کی بات پر وہ فاخر بھرے انداز میں مسکرانے لگیں۔

"ایسا کرو زوبیہ کو کھانا پکانا سکھا دو ویسے بھی اس کے پاس سارا دن کرنے کے لیے کچھ ہوتا بھی نہیں۔" بلال اختر نے پلیٹ ذرا سی آگے کرتے ہوئے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔

"جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے میری اتنی حسین بچی کو کچن میں جا کر اپنا رنگ کالا کرنے کی۔ ویسے بھی یہ دوبارہ مصروف ہونے والی ہے میں کسی نئے کالج میں اس کا ایڈمیشن کرا رہی ہوں یہ گھر میں بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتی۔" عائشہ اختر نے کہا تو زوبیہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

بلال اختر نے ان کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ صرف انہیں دیکھ کر رہ گئے تو عائشہ اختر بھی واپس موضوع کی طرف آتے ہوئے بولیں۔

"مگر یہ بات تو ہے اتنے سالوں بعد کھانا پکا کر مجھے بھی مزا آیا ہے میں سوچ رہی ہوں کبھی کبھی کچن پر نظر کرم کر ہی لیا کروں۔"

"بہت خوب پھر ایسا کریں کل پر شین رائس بنا لیں۔" بلال اختر خوش دلی سے بولے تو عائشہ اختر کل کے لیے مزید مینو ترتیب دینے لگیں جبکہ زوبیہ خاموشی سے کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی مگر ابھی وہ ڈائننگ روم کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ بلال اختر کے سرگوشیانہ انداز میں اس کا نام لینے پر آگے بڑھنے کی بجائے وہیں دیوار کے پاس رک گئی۔

"زوبیہ کی حالت کافی بہتر لگ رہی ہے نا۔" بلال اختر رک کر عائشہ اختر کے جواب کا انتظار کرنے لگے مگر وہ خاموش رہیں تو خود ہی کہنے لگے۔

"میرا گھر بدلنے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ زوبیہ کے رویے میں فرق نظر آ رہا ہے وہ کافی پرسکون لگ رہی ہے اور پھر جو گھر ہم نے لیا ہے یہ بھی اتنا برا تو نہیں ہے۔ ہاں اگر تھوڑا ڈھونڈ کر لیتے تو اس سے اچھا مل جاتا لیکن ٹائم نہیں تھا میں فوراً سے بیشتر اس گھر کو چھوڑنا چاہتا تھا۔

تمہیں ابھی میرے فیصلے سے اختلاف ہے۔ لیکن آگے چل کر تم خود مانو گی کہ میں نے صحیح قدم اٹھایا تھا۔"

عائشہ اختر بغور بلال اختر کو دیکھتی رہیں پھر بمشکل گویا ہوئیں۔

"اگر زوبیہ کی بیماری کی وجہ آپ اس گھر کو سمجھتے ہیں تو پھر تو آپ مجھے بھی اس کی بیماری کا ذمہ دار سمجھتے ہوں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" بلال اختر کچھ چڑ گئے۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں آپ یہی سوچتے ہیں نا کہ اس گھر کی وجہ سے ہماری بیٹی کو بدحواسی لگی ہے تو اس کا ذمہ دار آپ مجھے ہی سمجھتے ہوں گے نا۔" عائشہ اختر کا لہجہ عجیب سا تھا جیسے خود اپنے آپ پر ہنس رہی ہوں مگر ہنسی میں رونے کا عنصر بھی شامل ہو۔

"میں زوبیہ کا ماحول بدلنا چاہتا تھا اس کا تعلق گھر سے نہیں ہے۔" بلال اختر نے کھڑے ہوتے ہوئے حتمی لہجے میں قدرے غصے سے کہا اور قدم آگے بڑھا دیے تو زوبیہ بھی تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی مبادا وہ اسے کھڑا ہوا نہ دیکھ لیں۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ کافی دیر تک ان کی گفتگو پر غور کرتی رہی پتا نہیں کیا مطلب تھا ان کی باتوں کا اس میں پوچھنے کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی اس کے پوچھنے پر وہ بتا دیتے۔

البتہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بلال اختر کی اس غلط فہمی کو ضرور ختم کر دے کہ اس گھر میں آ کر زوبیہ کی حالت میں کوئی سدھار آ گیا ہے۔

پہلے دن تو اسے بھی یہی لگا تھا کہ یہاں اردگرد کہیں شائستہ خالہ کا سایہ نہیں ہے مگر اگلی ہی رات اس خوش فہمی نے بڑی آسانی سے دم توڑ دیا۔

وہ اپنے باتھ روم میں بیسن کے سامنے کھڑی منہ دھو رہی تھی جب پانی کا چھینٹا منہ پر مارنے کے بعد اس نے سیدھے ہوتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

آئینے میں شائستہ خالہ کا وہی بھیانک چہرہ نمودار ہوا تھا اور پل بھر میں ہی غائب بھی ہو گیا تھا۔

زوبیہ نے فوراً پلٹ کر دیکھا مگر پیچھے کچھ بھی نہیں تھا اس نے ایک بار پھر آئینے کی جانب دیکھا مگر وہاں بھی اب سوائے اس کے اپنے عکس کے کچھ نہیں تھا۔

زوبیہ اپنا چہرہ تولیے سے پونچھے بغیر تیزی سے باتھ روم سے نکل آئی اور کمبل میں دبک کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد جب اس کی پھولی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں تب اس نے اس عکس پر غور کرنا شروع کیا تو ایک بڑی عجیب سی بات اس کے سامنے آئی۔

وہ بیسن پر جھک کر منہ دھو رہی تھی جب وہ سیدھی ہوئی تو آئینے میں اسے اپنی جگہ شائستہ خالہ نظر آئی تھیں اس کا اپنا چہرہ تو آئینے میں تھا ہی نہیں۔ بس شائستہ خالہ اس کی بجائے آئینے میں موجود تھیں۔

کچھ دیر تو وہ اس عجیب و غریب منظر پر غور کرتی رہی مگر کوئی سرا ہاتھ آتا تو کچھ سمجھ میں بھی آتا چنانچہ وہ تھک کر پاس رکھے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر چہرہ پونچھتے ہوئے سونے لیٹ گئی۔

یہ اور بات تھی کہ سوتے میں بھی اسے خواب میں بھی وہی بھیانک چہرہ دکھائی دیتا رہا۔

کبھی وہ کسی سنسان اندھیری سڑک پر دوڑ رہی ہوتیں تو کبھی انگاروں پر چل رہی ہوتیں اور زور زور سے چیخ رہی ہوتیں۔

خواب میں وہ زوبیہ کو بھی بری طرح جھنجھوڑتے ہوئے بالکل پاگل لگ رہی تھیں۔

زوبیہ کی بار بار آنکھ کھلتی رہی بڑی مشکل سے آخر صبح ہوئی تو وہ بغیر منہ ہاتھ دھوئے محض کپڑے بدل کر کمرے سے باہر آ گئی۔

عائشہ اختر نے اس کے ستے چہرے کو دیکھ کر یہی سوچا کہ ان کی طرح اسے بھی نئی جگہ پر نیند نہیں آئی اس لیے انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا اور اگر کرتیں بھی تب بھی کون سا زوبیہ کو انہیں سچ بتانا تھا اس نے تو اب ایسی باتیں کہنی ہی چھوڑ دی تھیں جو سامنے والے کی سمجھ میں نہ آئیں اور جنہیں سامنے والا سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرے۔

✡ ✡ ✡

نمل کا کانپا ہوا جسم خرم کو اندر تک شانت کر گیا تھا جب سے اس نے خرم پر ہاتھ اٹھایا تھا تب سے اس کے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی جو آج نمل کے چہرے پر پھیلی بے بسی دیکھ کر ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

یونیورسٹی میں دوستوں کا حیرانی بھرا رد عمل اور اب نمل کا غصے بھرا انکار سب کچھ عین اس کی خواہش کے مطابق تھا کیونکہ اسے یقین تھا نمل کے انکار سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

عظمت خلیل سے ملا نہیں تھا مگر انہوں نے اس سے ملے بغیر جس طرح اتنی آسانی سے اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کیا تھا اسے مد نظر رکھتے ہوئے خرم ان کی حاکمانہ فطرت کو بہت اچھی طرح سمجھ گیا تھا اور ایسے لوگ ایک بار جو فیصلہ کر لیتے عموماً اسے بدلتے نہیں تھے۔

اسی لیے اسے یقین تھا نمل چاہے گھر جا کر کتنا ہی رو پیٹ لے شادی بہرحال نہیں رکوا سکتی تھی۔

خرم سرشار سے انداز میں اپنے دوستوں میں آ کر بیٹھ گیا گو کہ وہ کئی دن کی غیر حاضری کے بعد آیا تھا مگر آج اس کا کوئی کلاس لینے کا دل نہیں چاہ رہا تھا اسے تو بس سب کے بیچ میں بیٹھ کر اپنی فتح کا جشن منانے میں دلچسپی تھی۔

ہارون اور نادر تھوڑی دیر اس کا ساتھ دے کر لیکچر اٹینڈ کرنے چلے گئے تھے جبکہ حمید اور وکی بدستور اس کے ساتھ براجمان تھے انہیں بھی بڑا مزا آ رہا تھا لوگوں کی مبارک باد اور حیرانیاں وصول کرنے میں وہ دونوں ایسے اترا رہے تھے جیسے ان دونوں نے ہی تو یہ معرکہ سر کیا ہو۔

لیکن رنگ میں بھنگ ڈالا مسز فرقان کا غصے بھرا فون آیا تو اسے چاہتے ہوئے بھی وہاں سے اٹھ کر گھر آنا پڑا۔

مسز فرقان گھر پر بری طرح جھنجھلائی ہوئی تمام ملازموں اور مزدوروں پر چلائے جا رہی تھیں اسے دیکھتے ہی اس پر بھی اسی لہجے میں برس پڑیں۔

"خرم میں نے تمہیں کل رات ہی منع کر دیا تھا کہ تم صبح یونیورسٹی نہیں جاؤ گے مگر میری تو اس گھر میں کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔

تمہارے ڈیڈ کو منع کرتی رہی کہ منگنی کی تاریخ اتنی قریب کی مت رکھیں مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ پھر انہیں یہ سمجھاتی رہی کہ اگر منگنی رکھنی ہے تو کم از کم نئے گھر میں نہ رکھیں گھر کی شفٹنگ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے مگر انہوں نے یہاں بھی میری نہیں سنی۔

کم از کم میری اتنی بات تو ماننی چاہیے کہ اتنی مصروفیت کے ٹائم پر تم اور تمہارے ڈیڈ اپنے روٹین کے کام چھوڑ کر میرے ساتھ شفٹنگ میں میری مدد کرا دیں آخر میں اکیلی کیا کیا دیکھوں۔" مسز فرقان حسب عادت بغیر رکے

شروع ہو گئی تھیں۔

خرم پرسکون انداز میں انہیں بغور دیکھتا رہا اور ان کی بات ختم ہونے پر خوش دلی سے ہنس دیا۔

"ریلیکس ماما! Why are you so tense میں سب سنبھال لوں گا۔" خرم کا اطمینان دلانا انہیں اور بھڑکا گیا وہ مزید غصہ کرنے لگیں تو خرم بظاہر سنجیدہ ہوتے ہوئے فوراً حرکت میں آگیا۔

مزدور سامان ٹرک میں لوڈ کر کے نئے گھر میں لے جانے کے لیے تیار کھڑے تھے سامان سے بھرا ایک ٹرک پہلے ہی گھر پہنچ چکا تھا جس کے ساتھ ان کے بھروسے کا ایک بہت پرانا ملازم بھی گیا تھا اس کے جانے سے مسز فرقان کو کافی دقت ہو گئی تھی اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہاں پر سامان کس طرح چڑھوائیں پہلے کون سے کمرے کا فرنیچر بھیجیں، تبھی انہوں نے غصے میں خرم کو فون کیا تھا اور اب خرم کے آجانے پر انہوں نے اس ملازم کو واپس گھر بلا لیا تھا اور خرم کو نئے گھر پہنچنے کے لیے کہہ دیا تو خرم فوراً ہی وہاں سے نکل گیا، وہ نیا گھر اس دن کی نسبت آج بالکل الگ لگ رہا تھا۔

بلال اختر کے گھر کا سارا سامان جا چکا تھا بس کچھ غیر ضروری سامان وہ چھوڑ گئے تھے جسے فی الحال گھر کے پچھلے حصے میں بنے سرونٹ کوارٹرز میں ڈلوایا جا رہا تھا۔

ایک ایک کمرے کو اچھی طرح صاف کر کے اس میں سامان رکھنا شروع کر دیا گیا تھا۔

مجموعی طور پر کام بہت تھا اور گھر بھی بہت پھیلا ہوا تھا مسز فرقان کی بوکھلاہٹ واقعی بے جا نہیں تھی۔

"یہ جو غیر ضروری سامان وہ لوگ چھوڑ گئے ہیں اسے گھر کے پچھلے حصے میں ڈالنے کی بجائے سیدھا پھنکوا کیوں نہیں دیتے؟" خرم نے ایک مزدور کو دیوار پر سے ایک پرانی سی سینری اتارتے ہوئے دیکھ کر ٹوکا تو وہ پلٹ کر خرم کو دیکھنے لگا۔

"آپ کی والدہ کہہ رہی تھیں سارا سامان فی الحال پیچھے ڈلوا دو کیا پتا اس میں ان کی کوئی ضروری چیز رہ گئی ہو اور وہ لوگ واپس لینے آئیں۔"

"تو یہ تو ان کی غلطی ہے نا کہ وہ اپنی ضروری چیزیں کیوں چھوڑ گئے اب ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے اس [illegible] ایکسٹرا کام بھی کریں۔

کوئی ضرورت نہیں ہے اس سینری کو پیچھے لے جانے کی۔ لے جا کر گھر سے باہر پھینک دو کل جمعدار اٹھا کر لے جائے گا۔"

"مگر صاحب..."

"میں کہہ رہا ہوں نا تم سے، لے جا کر پھینک دو۔" خرم نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر حکمیہ انداز میں کہا تو وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا جبکہ سیڑھیوں سے اترتا ایک مزدور جو ان کی گفتگو سن رہا تھا خرم کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"صاحب کیا اس ڈبے کو بھی پھینک دوں یہ اوپر کمرے میں پڑا تھا اس میں کچھ کاغذات وغیرہ ہیں یہ تو لگتا ہے واقعی غلطی سے رہ گیا ہے۔"

خرم اس کے ہاتھ میں موجود گتے کے ڈبے کو دیکھنے لگا وہ پیکنگ کے لیے منگایا ہوا کارٹون تھا جو اوپر سے ضرور کھلا ہوا تھا مگر اطراف میں باقاعدہ ٹیپ لگے تھے۔

یعنی ایک نئے ڈبے کو بنا کر اس میں خاص طور سے سامان رکھا گیا تھا۔

"یہ مجھے دے دو تم جا کر دوسرا [illegible]"

وہ مزدور ڈبا خرم کے سامنے رکھ کر واپس سیڑھیاں چڑھ گیا۔

خرم نے جھک کر اسے کھولا اور اس میں پڑے بہت سارے کاغذات میں سے چند ایک نکال لیے وہ مختلف اوراق پر بنے مختلف اسکیچز تھے جنہیں بنایا تو بڑی مہارت سے گیا تھا مگر جن میں مناظر بڑے عجیب و غریب پیش کیے گئے تھے۔

پنسل اور پین سے بنائے گئے مختلف اسکیچز میں خون، قتل اور تشدد نمایاں تھا۔

ایک بہت ہی بھیانک قسم کی لڑکی اکثر اوراق پر موجود تھی جبکہ ایک منظر پر ایک لڑکی کے سر سے خون نکل رہا تھا تو دوسری تصویر میں ایک لڑکا خون میں لت پت تھا اور زمین کھود رہا تھا جیسے قبر کھود رہا ہو۔

کچھ صفحوں پر تو قلم ایسے گھسیٹا گیا تھا کہ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

البتہ کچھ ڈرائنگز دیکھ کر خرم کا سانس کھینچ کر رہ گیا جہاں دو لڑکے ایک لڑکی پر بڑے وحشیانہ انداز میں حملہ آور تھے۔

خرم سر اٹھا کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا کہیں کسی نے اسے ایسی بے ہودہ مصوری کے فن پارے دیکھتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا تبھی خرم کو وہی مزدور دوبارہ آتا دکھائی دیا جو یہ ڈبا اٹھا کر لایا تھا۔

"سنو! یہ ڈبا تم کون سے کمرے سے لائے ہو؟" خرم نے اسے آواز دیتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب جی! جس کمرے میں آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کا سامان رکھنا ہے۔" خرم کچھ دیر کے لیے اس مزدور کو دیکھتا رہ گیا۔

اسے اچھی طرح پتا تھا وہ کمرہ بلال اختر کی بیٹی کا تھا اس کی ذہنی حالت کے بارے میں بھی وہ تھوڑا بہت سن چکا تھا لہٰذا یہ اندازہ لگانے میں اسے زیادہ دقت نہیں ہوئی کہ یہ مصوری کے شاہکار ان کی بیٹی کے ہی کارنامے ہیں۔

خرم نے ایک نظر واپس ان کاغذات پر ڈالی اور پھر انہیں ڈبے میں ڈالتے ہوئے اسی مزدور سے کہا۔

"یہ ڈبا وہیں کوارٹرز میں ڈال دو جہاں گھر کا دیگر سامان رکھا ہے بلکہ اگر اس کمرے میں اور بھی کوئی سامان ہو تو وہ بھی باہر پھینکنے کی بجائے پیچھے کوارٹرز میں رکھ دینا۔" خرم نے ڈبے کو بند کر کے مزدور کی طرف کھسکا دیا۔

ثمل کسی روبوٹ کی طرح اپنی منگنی کے لیے تیار ہوئی تھی ہر طرح کے احساسات سے عاری بالکل مشینی انداز میں۔

رومیلہ اور سنبل صبح سے اس کے پاس آ گئی تھیں مگر تسلی کے الفاظ ان کے پاس بھی نہیں تھے خرم نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس ایک تھپڑ کا حساب ثمل کو زندگی بھر چکانا تھا ایسے میں بھلا وہ کس بات کو بنیاد بنا کر خوش فہمی کا شکار ہوتیں اور ثمل کو دلاسا دیتیں۔

صبح خرم کی والدہ آکر ثمل کو منگنی کا بیش قیمت شاندار جوڑا اور اس کی میچنگ جیولری، پرس اور جوتے دے گئی تھیں۔

وہ ثمل کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئی تھیں اسے اس قدر سراہا تھا اور اس کے ساتھ اتنی محبت سے پیش آئی تھیں کہ رشیدہ کے خدشات بہت حد تک کم ہو گئے تھے انہوں نے مسز فرقان کے جانے کے بعد کافی دیر تک بیٹھ کر ثمل کو سمجھایا تھا۔

"ہر ایک کے اظہار کا طریقہ الگ ہوتا ہے کچھ لوگ اپنی انا کے دائرے میں اس قدر قید ہوتے ہیں کہ اپنی پسند کو کھل کر ظاہر نہیں کرتے۔ مجھے لگتا ہے خرم بھی ایسا ہی ہے تمہیں غصے میں دیکھ کر اسے بھی غصہ آگیا ہوگا اس لیے اس نے اس طرح بات کی ہوگی۔

ورنہ اس کے والدین کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ اس کا تعلق بہت اچھی فیملی سے ہے وہ یقیناً "شادی جیسے مقدس رشتے کو کسی انتقام کی بھینٹ نہیں چڑھائے گا۔"

اگر اکلوتا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ ضدی اور ہٹ دھرم ہو بھی گیا ہے تو بھی وقت کے ساتھ ساتھ اس میں فرق آجائے گا۔"

"ہاں جیسے ابو میں آگیا ہے نا۔" ان کی نصیحت نمل بڑی بے زاری سے سن رہی تھی آخر جب اس سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بول پڑی۔

مگر رشیدہ برا مانے بغیر اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اپنے باپ کی وجہ سے سارے مردوں سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے تم خرم کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔"

"میں اس کے ساتھ رہوں گی ہی نہیں تو خوش اور ناخوش رہنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" نمل نے زہر خند انداز میں کہا تو رشیدہ نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔

خرم کے متعلق کوئی بھی مثبت اور غیر مثبت بات اس کے تنفس کو بڑھا رہی تھی اور گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

وہ نہیں چاہتی تھیں کہ نمل کے چہرے پر پھیلا تناؤ کوئی محسوس کرے اور لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

تمام مہمانوں کے اکٹھا ہونے پر وہ سب خرم کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"یہ کیا الٹا طریقہ ہے بجائے اس کے کہ لڑکے والے آئیں ہم الٹا ان کے گھر جا رہے ہیں۔" رومیلہ کو خود کوفت ہو رہی تھی ایک تو نمل اسے عزیز بہت تھی لہٰذا وہ اس کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی دوسرے یہ کہ وہ خود اس صورت حال سے گزر چکی تھی۔

زبردستی کی منگنی اور شادی کسی اژدہا کی طرح دل و دماغ کو جکڑ کر مفلوج کر دیتی ہے یہ بات رومیلہ سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔

"جب صبح خرم کی مدر تمہارے گھر آئی تھیں تمہیں انہیں صاف انکار کر دینا چاہیے تھا۔" گاڑی میں نمل کے برابر میں بیٹھتے ہوئے سنبل نے تلخی سے کہا۔

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو اگر یہ بات ماموں تک پہنچ گئی تو وہ لوگوں کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں کریں گے۔" رومیلہ نے ڈپٹنے والے انداز میں مگر دھیمی آواز میں کہا تو سنبل سر جھٹک کر رہ گئی۔

ابھی تک آنے والے سارے مہمان صرف نمل کی خوب صورتی کی تعریفیں کر رہے تھے مگر خرم کے گھر پر جیسے ہی تمام گاڑیاں رکیں سب لوگوں کی تمام کی تمام توجہ اس شاندار محل نما گھر کی طرف مبذول ہو گئی۔

پل بھر کے لیے تو رومیلہ اور سنبل بھی سب کچھ بھلا کر گھر کی شاندار عمارت اور لائٹوں کے ذریعے کی گئی اس کی شاندار سجاوٹ کو دیکھ کر پلک تک جھپکنا بھول گئیں۔

"کیا بات ہے نمل کیا اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے تم نے۔" رومیلہ کی بھابی نے اپنی گاڑی سے اتر کر نمل کے قریب آتے ہی بڑے بھونڈے سے انداز میں کہا۔

نمل کی تنی ہوئی بھنویں بالکل ہی سکڑ گئیں تو رومیلہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اسے آگے گھسیٹنے لگی۔

مگر گیٹ تک پہنچنے تک سارے ہی رشتے دار بھابی والی بات بہت بہتر انداز میں اس کے گوش گزار کرتے رہے مگر نمل نے سر اٹھا کر ایک بار بھی کو ٹھی کی طرف نہیں دیکھا۔

☆ ☆

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

وہ تین دن سے اپنی اس کیفیت پر سخت پریشان تھا۔ اور آخرکار آج ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں اندر سے کنڈی لگائے اپنے بیڈ پر موجود تھا۔ ایک خوب صورت رائٹنگ پیڈ و قلم لے کر اس نے کاغذ پر چند جملے لکھے۔ لیکن پھر وہ شاید مطمئن نہیں ہوا اس نے پیڈ پر سے کاغذ کو پھاڑا اور توڑ موڑ کر ایک طرف اچھال دیا۔ پھر اس نے کچھ تحریر کیا' لیکن وہ کاغذ بھی کمرے میں گرے تھے۔ دوسرے کاغذات کے ساتھ جا ملا' کافی دیر تک یہ ہی صورت حال برقرار رہی' پھر شاید اس کی تسلی ہو گئی جو تحریر وجود میں آئی تھی۔ وہ شاید اس کی مرضی کے عین مطابق تھی۔ تحریر مکمل کرنے کے بعد اس نے کاغذ کو پھاڑا اور احتیاط سے تہ کرنے کے بعد اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر پھرتی سے کمرے میں بکھرے ہوئے مڑے تڑے کاغذات کو جمع کر کے ایک شاپنگ بیگ میں ڈالا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد وہ شاپنگ بیگ کچرے کے ایک ڈھیر کی نذر ہو چکا تھا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سورج افق کے پار دور ستانے چلا گیا تھا۔

اس کے قدم تیزی سے ایک طرف اٹھتے جا رہے تھے اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ چچا اکرم کے مکان کے سامنے موجود تھا۔

گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ان تین دنوں میں بڑی تگ و دو کے بعد وہ اس بات کا پتا چلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ یہ ہی کمرہ اس کا مطلوب نظر تھا۔

اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں تو جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر آ گئی۔ یہ مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیلا تھا جو اس کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اس نے وہ ڈھیلا اٹھایا' پھر جیب میں سے کاغذ کو نکالا۔ ڈھیلا کاغذ کے درمیان میں رکھ کر کاغذ کو احتیاط سے اس کے اردگرد لپیٹا اور پھر مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں اردگرد گھومیں۔ پھر اس کا ہاتھ گردش میں آیا اور مٹی کا وہ ڈھیلا کاغذ سمیت اڑتا ہوا کھڑکی سے اندر جا گرا۔

مریم جب معمول کو نوٹس تیار کر رہی تھی کہ کھٹک کی آواز آئی اور اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر وہ جیسے اڑتی ہوئی کھڑکی تک جا پہنچی۔ پچھلے پندرہ میں دنوں سے وہ سخت کشمکش و پیچ کا شکار تھی۔ رات کے تقریباً اسی وقت روزانہ کھٹک کی یہ شناسا آواز معمول بن چکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ مٹی کا ایک ڈھیلا جس کے اردگرد خوب صورتی سے لپٹا ہوا کاغذ اور کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ' لیکن باوجود ہزار کوشش کے وہ یہ جاننے سے قاصر تھی کہ یہ حرکت ہے کس کی؟ کون ہے جو اپنے جذبات و احساسات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے اور پھر مٹی کے ایک ڈھیلے کو پیغام رساں کو تربناتے ہوئے ان لفظوں کو کمرے کے عین وسط میں پہنچا دیتا ہے۔

شروع شروع میں تو اس نے کاغذ کو پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اسے خواہ مخواہ طیش آ جاتا تھا اور کاغذ پرزے پرزے ہو کر واپس کھڑکی کے باہر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ تشویش کے ساتھ ساتھ اسے اس معاملے سے دلچسپی سی پیدا ہوتی چلی گئی۔ پچھلے چار' پانچ روز سے روزانہ موصول ہونے والا پیغام اس نے بار بار پڑھا' الفاظ بے شک مختلف ہوتے تھے' لیکن لب لباب یہ ہی ہوتا تھا کہ کوئی اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔

دو دن کی مسلسل سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ کاغذ کی طرف جھپٹنے کی بجائے اگر وہ فوری طور پر کھڑکی تک پہنچ جائے تو شاید اس حرکت کا محرک جان سکے تو وہ ایک ہی جست میں کھڑکی تک آ پہنچی تھی اور پھر وہ ساکت رہ گئی۔

نیم تاریک گلی میں کھڑا وجود تیکھے نقوش کا مالک وہ خوب صورت نوجوان اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا' وہ ایک ٹک کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظریں مریم کی نظروں سے ٹکرا گئیں اور مریم کا پورا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نوجوان کی مقناطیسی نگاہوں سے کوئی غیر مرئی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ جنہوں نے

اسے پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ بالکل بے خودی سی ہو کر رہ گئی۔ لیکن پھر اس نے ایک جھرجھری سی لے کر جیسے خود کو سنبھالا دیا اور اپنی کیفیت پر غور کرنے لگی۔ ایک عجیب و انوکھا احساس تھا جس سے وہ آج تک ناآشنا تھی۔ پھر اچانک اس کے وجود میں ایک سرکش لہری اٹھی۔ اسے اس نوجوان پر شدید غصہ آیا۔

”آخر اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بلاوجہ اسے پریشان کرے۔ میرا کمرہ کسی کے باپ کی جاگیر تو ہے نہیں کہ جس کا دل چاہے لفافے پھر اٹھا کر پھینکتا پھرے۔ ہونہہ۔“

اس نے غصے سے سر جھٹکا اور اس کے چہرے پر بکھر آنے والے بال اس کے شانوں پر آ گئے۔ اس نے نفرت سے اس نوجوان کو گھورا اور پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ کھڑکی کو بند کر دیا۔

وہ واپس اپنی مخصوص نشست کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک گول گول لپٹے ہوئے سفید کاغذ سے اس کی نظریں الجھ کر رہ گئیں۔ اس نے چلتے چلتے رخ تبدیل کیا اور وہ کاغذ اٹھا لیا اسے کھول کر مٹی کا ڈھیلا الگ کیا اور پھر اس کی نظریں اس پر بکھری' تحریر پر پھسلتی چلی گئیں۔

پتا نہیں کیوں وہ الفاظ اس کے دل و دماغ پر عجیب سا سحر طاری کر رہے تھے۔ اس کے وجود میں اچانک اٹھنے والی نفرت کی سرکش لہر ان الفاظ کی مٹھاس اور ٹھنڈک کے مارے ماند پڑتی چلی گئی۔ اب وہ بالکل پرسکون تھی۔ اور ان الفاظ کو ایک بار پھر غور سے پڑھ رہی تھی۔

سیدھا سیدھا اظہار محبت تھا۔ لیکن الفاظ کا بہاؤ اور ان کا استعمال نہایت خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ جو آخرکار اس پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ اس کی دھڑکنوں کی لے تبدیل ہو رہی تھی۔

پہلی بار اس نے ان لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے جذبوں اور ان کی گہرائی کو محسوس کیا۔ اب اسے یہ الفاظ برے نہیں لگ رہے تھے۔ اسے غصہ بھی نہیں

آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن کے پردوں پر وجیہہ صورت نوجوان کی پرچھائیں کی طرح نمودار ہوئی' بالکل یوں جیسے کوئی عکس لہراتا ہے۔ اس نے بے ساختہ کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے قدم کھڑکی کی طرف اٹھنے لگے۔

اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا' لیکن خالی گلی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ عکس نیم تاریک ماحول کے پردوں میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے بے چینی سے ادھر ادھر نظریں گھمائیں' لیکن اس کا دور دور تک نام و نشان نہیں ملا۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں موجود اس خط کی طرف دیکھا' پھر دوسرے ہاتھ میں موجود مٹی کے چھوٹے سے ڈھیلے کی طرف۔ مٹی کا وہ چھوٹا سا ڈھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نہایت آہستگی سے کھڑکی کو بند کیا اور پھر سست قدمی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ پر آ گری۔

کاغذ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس تحریر کو بغور پڑھا۔ اس کا ذہن کہیں سے کہیں اسے اڑائے پھر رہا تھا۔ آج وہ نئے جہانوں کا سفر کر رہی تھی۔ نئے جذبوں سے آشنا ہو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا لیکن یہ سب کچھ برا تو نہیں تھا۔

کافی دیر تک وہ گم صم خیالوں کے جزیرے میں بھٹکتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور اس کی پلکوں کے ریشمی غلاف آہستہ آہستہ گرتے چلے گئے۔ وہ سو چکی تھی' یوں کہ کاغذ کا وہ سفید ٹکڑا اس کے سینے پر دھرا تھا اور کے دونوں ہاتھ اس کے اوپر یوں رکھے تھے جیسے اسے خدشہ ہو کہ یہ کاغذ کہیں اس سے چھن نہ جائے۔

☼ ☼ ☼

شہروز سخت پریشان تھا۔ پندرہ' بیس دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد آج اسے مریم کی جھلک نظر آئی تھی اور اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ وہ یہ ہی سمجھا تھا کہ اس کے الفاظ اپنا کام کر گئے۔ لیکن جو رد عمل اسے نظر آیا وہ خاصا حوصلہ شکن تھا۔

ساری رات اس نے کروٹیں بدلتے گزار دی تھی۔ وہ ایک پل نہیں سو سکا تھا۔ آخر کیا کرے اس کی سمجھ

میں نہیں آرہا تھا اور اب گاؤں سے باہر برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے بیٹھا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ "آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔"

جیسے کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔ اس نے بے چینی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "یا خدا! تو تو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے "تو ہی کوئی "راستہ نکال" تو ہی میرے دل کو سکون و قرار بخش سکتا ہے۔" لیکن اس کی ناکام و نامراد نظروں کو کوئی جواب نظر نہ آیا۔ اس نے آسمان سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا تو ہاتھ میں درانتی پکڑے اور گلے میں دوپٹہ لٹکائے اسے ایک نسوانی وجود نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔

گاؤں کی طرف سے نظر آنے والی پگڈنڈی پر وہ الہڑ دوشیزہ رانی تھی۔ چاچا فیض بخش جٹ کی بیٹی جو یقیناً" اپنے کھیتوں میں سے جانوروں کا چارہ کاٹنے کے لیے اس طرف آرہی تھی۔

جس طرح کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے اس کے دماغ میں روشنی کی ایک کرن سی چمکی۔

حیرت ہے کہ پھر دل سے کرن پھوٹ رہی ہے
اس غم کے افق پر تو ستارہ ہی نہیں تھا

اس کے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا چکا تھا اور اس منصوبے میں مرکزی کردار رانی کا تھا۔

جوں ہی وہ اس کے قریب آئی اس نے اسے بے ساختہ پکارا۔

"رانی۔۔ ایک منٹ ذرا ادھر آؤ میری بات سننا۔"

اور چھوٹی چھوٹی لہراتی بل کھاتی رانی عین اس کے سامنے آرکی اور پھر کافی منت سماجت کے بعد رانی اس کی مدد کے لیے راضی ہو ہی گئی۔

"ہرّے۔۔" اس کے دل نے نعرہ لگایا۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

جب وہ وہاں سے اٹھا تو بالکل مطمئن تھا۔ اس کے دل و دماغ میں پریشانی کا نام و نشان [illegible] وہ اپنے سر کا تمام بوجھ رانی کے [illegible] پر منتقل کر چکا تھا۔ پھر وہ دھیمے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔

✿ ✿ ✿

مریم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے قدم گاؤں سے باہر جانے والی پگڈنڈی پر اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کچھ خوف زدہ بھی تھی۔ اس کی ایک آواز پر جان قربان کرنے والے تین بھائی "انتہائی محبت کرنے والے بابا اور مہربان ماں جن سے کبھی آج تک اس نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور بولتی بھی کیوں! آج تک ایسی نوبت بھی تو نہیں آئی تھی۔ سب کی آنکھ کا تارہ تو تھی وہ سب ہی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اور آج پہلی بار وہ ان سب کو دھوکا دے کر انجانی راہوں پر گامزن تھی۔ ایک احساسِ جرم اس کے ضمیر پر ٹہوکے دے رہا تھا۔ لیکن وہ جذبہ جو اسے گھر کی چار دیواری سے باہر کھینچ لایا تھا۔ ضمیر کی اس کمزور آواز سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔

جوانی کے چند منہ زور جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں اور عمر کا ایک مخصوص حصہ ہر مرد اور ہر عورت پر ضرور آتا ہے۔ جہاں اپنے آپ کو سنبھالنا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں۔۔ اور وہ عمر کے اسی دور سے گزر رہی تھی جہاں ذرا سی بے احتیاطی "ذرا سی لغزش" انسان کو اندھی کھائی میں پھینک سکتی تھی [illegible] سب باتوں سے بے نیاز چلی جا رہی تھی۔

اس کے قدم [illegible] لڑکھڑائے ضرور تھے۔ لیکن پھر [illegible] آئے اور وہ استقامت کے ساتھ [illegible] اس کی منزل برگد کا وہی بوڑھا درخت [illegible] شہروز آج بھی موجود تھا اور پھر [illegible] کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

[illegible] لمحے کو مریم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔۔ اردگرد چھائے ہوئے سناٹے کو محسوس کر کے اس نے گھبرا کے چاروں طرف دیکھا۔ جلد ہی اس کی نظریں ایک متحرک وجود پر ٹھہر گئیں۔۔ وہ رانی تھی جو کچھ ہی فاصلے پر کھیت میں چارہ کاٹتے کاٹتے

کھڑی ہو گئی تھی اور اب اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے ہاتھ لہرا کر مریم کا حوصلہ بڑھایا اور مریم کے ہونٹوں سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔

اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک ذی روح کی موجودگی کا احساس اس کے دل و دماغ کو تقویت بخش گیا۔ اب وہ پورے اعتماد سے شہروز کی نظروں سے نظریں ملائے بیٹھی تھی۔ پھر شہروز کے لبوں سے لرزتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

"مریم۔۔ تم اپنے نام کی طرح پاکیزہ" معصوم اور خوب صورت ہو" آج تم میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ آج تم نے [illegible] مجھے زندگی کی نوید دے دی۔ میں اپنی خوشی [illegible] ہوں۔ یقین مانو جس دن سے میں نے تمہیں دیکھا ہے مجھے دین دنیا کا کوئی ہوش نہیں رہا [illegible] زندگی کا مقصد صرف اور صرف تم بن گئی [illegible] حصول میری زندگی اور تمہاری جدائی میری موت ہے۔ میری یہ سانسیں تمہارے ہی نام کا ورد کرتی ہیں اور اگر تم نے ان کی زبان سے اس نام کو الگ کیا تو سانسوں کی یہ ڈور ٹوٹ جائے گی۔ پلیز مریم اب مجھ سے جدا مت ہونا۔"

اور مریم اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہ "الفاظ" تو نہیں تھے یہ تو کوئی جادو تھا اور جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔

مریم پر یہ جادو پوری طرح چل چکا تھا۔ سو وہ بولتی بھی تو کیا۔

پھر شہروز نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے اور سنگ مرمر کی طرح سفید لیکن نرم و نازک مریم کا خوب صورت ہاتھ تھام لیا۔ اس نے آہستہ آہستہ مریم کے ہاتھ کو اوپر اٹھایا اور پھر مریم کی ہتھیلی کی پشت شہروز کے ہونٹوں کے لمس سے دہک اٹھی۔

✿ ✿ ✿

افسردہ و ملول شہروز چارہ کا بڑا گٹھڑ بندھوا رہا تھا۔ بہت بڑی چادر کے اندر بھینسوں کے لیے تازہ کاٹا ہوا سبز چارہ [illegible] ہوا تھا۔ چادر کے دو پلو شہروز کے ہاتھ میں تھے اور دو رانی کے ہاتھ میں "دونوں نے اپنی اپنی طرف کھینچ کر اندازہ لگایا۔ چارہ چادر کے اندر اچھی طرح جم ہو چکا ہے۔

شہروز نے [illegible] مضبوط گرہ لگائی اور دھپ سے [illegible] بیٹھ گیا۔ وہ بہت غم زدہ نظر آرہا تھا۔ رانی [illegible] کی مدد سے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ صاف کیا اور چارے کے گٹھڑ پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو شہروز کسی نہ کسی طرح تو تمہیں انہیں راضی کرنا ہی ہو گا۔ اگر تمہارے والدین تمہارا ساتھ نہیں دیں گے اور مریم کے ساتھ رشتہ مانگنے کے لیے نہیں جائیں گے تو معاملہ کیسے حل ہو گا۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں رانی! میں اپنی پوری کوشش کر چکا ہوں" لیکن میرے گھر والے اس رشتے پر ہرگز تیار نہیں "کیونکہ ان کے نزدیک چچا اکرم اور ہماری مالی حیثیت کا فرق زمین آسمان کا ہے۔ ان کی ذات اور ہے ہماری اور لہٰذا وہ کسی بھی صورت اس بات پر راضی نہیں ہیں۔ میں سخت پریشان ہوں کہ آخر اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے بہت سوچ بچار کے بعد ہی میں اس نتیجے میں پہنچا ہوں۔

تمہیں اللہ کا واسطہ تم حرف بہ حرف تمام صورت حال اور اس کے بعد اس کا جو حل میں نے تلاش کیا ہے مریم کو بتاؤ اور اسے اس بات پر راضی بھی کرو۔" شہروز نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"نہ بابا نہ "میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی اور میں یہ ذمہ داری لے ہی نہیں سکتی۔ کل کلاں اگر کسی کو پتا چل گیا کہ اس ساری کہانی میں میرا بھی ہاتھ تھا تو میرا بابا تو مجھے کچا ہی کھا جائے گا۔ خدا کا واسطہ شہروز تم مجھ سے اتنی خطرناک باتیں نہیں کرو۔ تمہارے ارادے ٹھیک نہیں اور جو قدم تم اٹھانا چاہ رہے ہو اس میں کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔" رانی نے گھبراہٹ آمیز انداز میں اپنی بات مکمل کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گھبرا کر گٹھڑ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چھ۔۔ چھوڑو۔۔ مجھ۔۔ چھوڑو پاگل

ہو گئے ہو یہ کیا کر رہے ہو۔" رانی کا انداز مزید گھبراہٹ آمیز تھا۔ رانی کا جملہ مکمل ہوتے ہی شہروز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور اس کا سر اس کے قدموں پر جا پڑا تھا اور وہ زاروقطار رو رہا تھا اور رانی عجیب بے بس انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔ ایک طرف شہروز کی بے چارگی اور دوسری طرف اس کی سہیلی اور اس کے خاندان کی عزت، وہ چند لمحوں تک کشمکش و پیچ کا شکار رہی۔ پھر اس نے شہروز کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ شہروز نے چہرہ اوپر اٹھایا تو آنسو اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

"اچھا بابا اچھا، میں پوری کوشش کروں گی کہ تمہاری بات مریم کی سمجھ میں آجائے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو اور یہ گٹھڑ مجھے اٹھواؤ۔"

"وہ مارا..." شہروز کے دل میں ایک نعرہ مستانہ گونج اٹھا۔ اس نے جلدی جلدی آنکھیں صاف کیں اور پھر دوسرے ہی لمحے چارے کا جہازی سائز گٹھڑ رانی کے سر پر منتقل کر دیا۔

رانی انتہائی تیز رفتاری سے وہ گٹھڑ اٹھائے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی اور شہروز وہیں کھڑا ہوا دور ہوتی رانی کی طرف تک رہا تھا۔ اب اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقص کناں تھی۔

☼ ☼ ☼

نینوں کی مت مانیو رے
نینوں کی مت سنیو
نیناں ٹھگ لیں گے
جگتے جادو پھونکیں گے
نیندیں بنجر کر دیں گے
بھلا مانس دیکھے نہ پرایا نہ سگا رے
نینوں کو توڑنے کا چسکا لگا رے
نینوں کا زہر نشیلا رے
نینوں کی زبان پہ بھروسا نہیں آنا
لگن کی عزت نہ رسید نہ لکھا
نیناں ڈس لیں گے
ڈس لیں گے

بہت پیاری ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، کپاس کے لہلہاتے کھیت جن پر پیلے پیلے رنگ کے کھلے ہوئے پھول لاؤڈ اسپیکروں کی طرح نظر آرہے تھے اور کہیں کہیں ان پھولوں کے ساتھ گول گول کپاس کے ٹینڈے بھی نظر آرہے تھے، جبکہ کسی کسی پودے پر کہیں کہیں روئی بننا بھی شروع ہو گئی تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ سیدھے کھڑے ہوئے یہ پودے وجد کے عالم میں تھے۔ جھوم جھوم کر رقص کر رہے تھے۔

گہرے سبز رنگ کے پانچ کونوں والے یہ بڑے بڑے پتے پودوں کے اس رقص کے ساتھ میوزک کا کام دے رہے تھے پتوں کے کھڑکھڑانے کی یہ آواز کانوں کو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

کھیت کے کنارے برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے اس وقت دو جوان دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہے تھے۔ ان میں سے ایک مریم اور دوسرا شہروز تھا۔ لیکن اس بے ترتیبی کا سبب دونوں طرف مختلف تھا۔

شہروز کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی خوشی کی وجہ سے تھی، اس کا مطلوب نظر اس کے سامنے تھا اور اس کی والہانہ نظریں مریم کے چہرے پر طواف کر رہی تھیں۔ اس کا یوں اس کے ایک بلاوے پر چلے آنا اس پر ایک عجیب سا نشہ طاری کر رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس غرور اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا تھا۔

لیکن دوسری طرف مریم کی دھڑکنیں گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے اعتدال پر نہ رہی تھیں۔ رانی کی کہی ہوئی ایک بات اس کے لیے کسی ایٹم بم سے کم ثابت نہ ہوئی تھی۔

برگد کا یہ بوڑھا درخت پچھلے ایک مہینے سے اس کی محبتوں، جذبوں اور ان جذبوں میں چھپی سچائیوں کا گواہ تھا۔ اس نے اس بوڑھے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر گھنٹوں شہروز سے باتیں کی تھیں۔ وہ کبھی اتنا پریشان نہیں ہوئی تھی جتنا آج تھی۔

رانی کی کہی ہوئی باتوں کے دھماکے اس کے جسم و جان کو لرزائے دے رہے تھے۔ ستم یہ کہ شہروز نے بھی ان باتوں کی تائید کرتے ہوئے مریم کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور مریم کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ملے۔

اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا، لیکن جو بھی باتیں اس نے اب تک سنی تھیں کوئی دوسرا راستہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا اور وہ کسی حد تک شہروز کی باتوں کی قائل ہو چکی تھی۔

"دل... لیکن شہروز..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں ہمارے پاس یہ ہی ایک آخری راستہ بچا ہے۔ اگر تم نے میرا ساتھ دو دیا پھر مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جانا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو شہروز میں تو یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ کیا تمہارے پاس مستقبل کی کوئی پلاننگ بھی موجود ہے یا یہ صرف ایک جذباتی فیصلہ ہے۔"

مریم نے شہروز کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو شہروز گویا ہوا۔

"مستقبل بھی اللہ کی کرم نوازی سے اچھا ہی رہے گا۔ بس تم میرا ساتھ دو اور جیسا میں نے سمجھایا ہے بالکل ویسا ہی کرو، میرے پاس رقم کا زیادہ انتظام نہیں ہے لیکن ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، پڑھا لکھا ہوں، اللہ نے عقل بھی دے رکھی ہے۔ تمہیں بھوکا نہیں ماروں گا۔"

"رقم کی تم فکر نہ کرو، کچھ نہ کچھ انتظام میں بھی کر ہی لوں گی۔"

"تو پھر دیر کس بات کی؟ کل صبح سورج نکلنے سے پہلے میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔" اور پھر مریم وہاں نہ رکی اور شہروز دور جاتی ہوئی مریم کی پشت پر نظریں جمائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

☼ ☼ ☼

"چائے والا بھائی جان... روٹی ہے، نان ہے، چاول ہے، تازہ ناشتا صاحب حلوہ پوری کا ناشتا۔" بھانت بھانت کی آوازیں، طرح طرح کی بولیاں اور بے ہنگم شور کے درمیان ایک خوب صورت چیز کیری تھامے کریم کلر کی سفید چادر میں لپٹی مریم اس وقت بھی اس ماحول بہت حسین لگ رہی تھی۔

اور پلیٹ فارم پر اس کے ساتھ چلتا ہوا شہروز اردگرد کے ماحول سے بے نیاز مریم کے سراپے کو گھورتے ہوئے یوں چل رہا تھا جیسے اس کی دنیا مریم سے شروع ہو کر مریم پر ختم ہوتی ہو۔

مریم کی طرح پاک ہیں آنکھوں کے جھروکے
ہم دیکھتے ہیں تم کو فرشتوں کی نظر سے

لیکن دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ شہروز کی نظروں میں پیار تھا، خلوص تھا، یا کوئی اور ہی جذبہ کارفرما تھا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ البتہ اس کی وارفتگی اور اس کا انہماک بہت سے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر گیا تھا۔

ایک بڑے میاں نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑی بی کو ٹہوکا دیا اور بولے۔

"ہائے ہائے... قسم سے جوانی یاد آگئی۔"

"بس رہنے دو، آپ کو تو آج تک اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ ایک محبت بھری نظر گھر میں ہی مجھ پہ ڈالی ہو۔ ایسی دیدہ دلیری آپ کے بس میں کہاں؟" بڑی بی اور بڑے میاں کی یہ تکرار مریم سے چھپی نہ رہ سکی تھی اور اس کے قدموں کی رفتار خودبخود تیز ہو گئی۔ وہ دو، تین مرتبہ پہلے بھی شہروز کو ٹوک چکی تھی، لیکن شہروز تو جیسے اس میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

پلیٹ فارم کے آخری کنارے کے قریب ایک خالی بینچ نظر آیا تو وہ دونوں اس پر جا بیٹھے۔

"دیکھو نا تمہارا یہ انداز پلیٹ فارم پر کسی سے بھی چھپا نہیں رہ سکا۔ لیکن تم ہو کہ تمہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ اب تو میں ہمیشہ کے لیے تمہارے ساتھ ہوں، پھر ایسی بھی کیا بے چینی؟"

مریم کی بات سن کر شہروز جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی

جذباتی ہو رہا ہوں۔ اچھا تم یہیں بیٹھو میں ٹکٹوں کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے شہروز پلیٹ فارم کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ٹن ٹن گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور مسافروں میں افراتفری کا سماں پیدا ہو گیا۔ گھنٹی کی آواز شاید کسی ٹرین کی آمد کا اعلان تھا۔ دور سے ٹرین کی وسل سنائی دی اور گہما گہمی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مریم نے پریشانی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ جلد ہی شہروز اسے ایک جانب سے آتا دکھائی دیا تو اس کی جان میں جان آگئی۔ شہروز ٹکٹس لے آیا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین بھی پلیٹ فارم پر آ لگی اور وہ دونوں اپنی اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔

اگلے دن نو بجے کے قریب ٹرین کے پہیوں نے جس پلیٹ فارم کو چھوا وہی ان کی منزل تھی۔ یہ کراچی کینٹ کا اسٹیشن تھا۔

ٹرین سے اترنے کے بعد انہوں نے سیڑھیاں چڑھ کر پل کراس کیا اور پلیٹ فارم سے باہر نکل آئے۔

بالکل سامنے لوہے کے پول سے لگا کر ان کے ساتھ زنجیریں باندھی گئی تھیں جو شاید ہیوی گاڑیوں کا راستہ روکنے کے لیے تھیں۔ مریم کے پیچھے پیچھے اس کا ہینڈ کیری لڑکھڑاتا چلا آ رہا تھا۔ زنجیروں کے درمیان میں موجود راستے سے ہوتے ہوئے جب وہ آگے نکلے تو سامنے ہی ریزرویشن آفس کے ساتھ ہی ایک جگہ پر پلاسٹک کی بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مریم نے نظریں اٹھا کر دیکھا وہ سوئٹس شاپ تھی وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شہروز دکان میں جا کر دو کولڈ ڈرنک لے آیا۔ اس نے ایک کولڈ ڈرنک مریم کے ہاتھ میں تھمائی اور اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مریم تمہارے پاس کوئی نقدی یا اس قسم کی کوئی چیز تو موجود نہیں ہے۔"

"ہاں ہے کیوں؟"

"اصل میں، میں تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں بتانا بھول گیا، یہ کراچی ہے رکشہ ٹیکسی یا گاڑی کسی بھی سگنل پر رکے تو [illegible] سرے
لگتی ہے اور بندے کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ یہاں معمول کی بات ہے۔ اگر کچھ ہے تو بہتر ہوگا کہ وہ سب کچھ میرے حوالے کر دو۔ قریب ہی بینک میں میرا اکاؤنٹ بھی ہے اور لاکر بھی۔ بہتر ہوگا کہ اگر ایسا کچھ ہے تو اسے ہم یہیں محفوظ کر دیں تاکہ بوقت ضرورت ہمارے کام آسکے۔"

مریم نے کندھے سے لٹکا ہوا بیگ اتارا اور اسے کھول کر ایک بڑا سا پھولا ہوا خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اس میں سات لاکھ ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے قدم جمانے کے لیے یہ خاصی معقول رقم ہے۔ اس کے علاوہ زیورات کے کچھ سیٹ ہیں۔"

پھر اس نے ہینڈ کیری کھولا اور سرخ رنگ کے چار خوب صورت باکس نکال کر شہروز کے حوالے کر دیے۔

شہروز اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ خوب صورت باکس زیورات کے لیے مخصوص ہیں۔ اس نے ایک باکس کھول کر دیکھا تو اس میں گولڈ کا ایک خوب صورت سیٹ جگمگا رہا تھا جو خاصا وزنی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے باکس بند کیا اور مریم سے مخاطب ہوا۔

"تم تھوڑی دیر یہیں بیٹھو میں یہ [illegible] اکاؤنٹ میں ڈال کر اور زیورات لاکر میں رکھ کر [illegible]"

"زیادہ دیر تو نہیں لگے گی؟" مریم نے پریشان انداز میں پوچھا۔

"بس یوں گیا اور [illegible]"

اور پھر شہروز [illegible] والے اسٹیشن کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

✡ ✡ ✡

"بھائی عالم معاملہ مشکوک ہے۔" فاضل نے تقریباً پندرہویں دفعہ اپنی بات دہرائی۔

"اچھا یار پھر بتاؤ کیا کروں؟ کتنی بار بتاؤ گے۔" عالم نے جل کر کہا۔

"پیشے کے لحاظ سے دونوں دو نمبر کام کرتے تھے اسی

کام کے سلسلے میں وہ آج اوکاڑہ سے کراچی پہنچے تھے۔ آتے وقت ان کی سیٹیں شہروز اور مریم کے قریب ہی تھیں۔ عالم اور فاضل کی پشت مریم اور شہروز کی طرف تھی۔ شہروز اور مریم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ان میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے، لیکن وہ دونوں پوری طرح ان کی طرف متوجہ رہے تھے۔

عالم نے تو پھر بھی کسی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، لیکن فاضل اس معاملے میں پوری طرح سے سرگرم نظر آ رہا تھا۔ وہ تمام راستے ان کی طرف خصوصی توجہ دیتا آیا تھا اور بار بار عالم سے کہتا رہا تھا۔

"بھائی عالم معاملہ مشکوک ہے۔" کچھ ان دونوں کی گفتگو اسے صاف سنائی دی [illegible] وہ دونوں کے نام سے واقف ہو چکا تھا اور [illegible] کسی حد تک سمجھ گیا تھا۔ پتا نہیں اس [illegible] میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ وہ ان کی باتیں [illegible] کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ پھر اچانک [illegible]

"عالم معاملہ مشکوک ہے۔"

کسی حد تک تو عالم بھی ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا [illegible] چڑ گیا تھا۔

"اگر معاملہ مشکوک ہے بھی تو ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔"

"یہ ہی تو تمہیں نہیں پتا عالم۔ یہ بہت بڑا بزنس ہے تم دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔"

شہروز اور مریم بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے اور وہ دونوں لوئر کلاس کے مسافر خانے کی سیڑھیوں پر کھڑے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ فاضل کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے باہر نکلے اور گیٹ کی جانب چل دیے۔

"عالم۔"

"جی بھائی فاضل۔"

"تم یہیں رکو ابھی یہ چھوکرا باہر نکلے گا تم اس کا پیچھا کرنا میں یہاں کے معاملات سنبھالتا ہوں۔"

"ہاں چھوڑو بھائی فاضل۔ جو بھی ہے جیسا بھی ہے انہیں ان کے حال پہ چھوڑو بھوک سے برا حال
ہو رہا ہے، کچھ کھانا دانا کھاتے ہیں، کولڈ ڈرنک پیتے ہیں وہ دیکھو دونوں کتنے مزے سے کولڈ ڈرنک پی رہے ہیں۔"

"عالم۔"

"جی بھائی فاضل۔"

"جیسا میں کہتا ہوں ویسا کرو۔"

"ٹھیک ہے بھائی فاضل۔"

"میں واپس جا رہا ہوں، جیسا میں نے سمجھایا اس میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

عالم کی ڈیوٹی دوسری طرف لگا کر فاضل واپس مڑ گیا۔ یوں عالم فاضل الگ الگ محاذوں پر مورچہ زن ہو گئے۔

✡ ✡ ✡

روشنیوں اور رنگوں کے شہر کراچی میں رونق اور گہما گہمی عروج پر تھی۔ روشنیاں جل اٹھی تھیں اور چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن مریم کے دل و دماغ پر اب اندھیرے چھانے لگے تھے۔ صبح کے نو سے رات نو تک کا ٹائم اس نے اسٹیشن پر ہی گزار دیا تھا۔ شہروز گیا تھا تو واپس نہیں آیا تھا۔ مریم نے ادھر ادھر گھوم پھر کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ وہ بار بار بکنگ آفس، پلیٹ فارم اور مسافر خانے کا چکر لگاتی، لیکن پھر مایوس و نامراد واپس آ کر وہیں بیٹھ جاتی۔

ایک بار بیرونی دروازے سے باہر جا کر بھی دیکھ آئی تھی۔ انجانا شہر، انجانے لوگ، انجانے چہرے، گاڑیوں کا اژدہام، ٹریفک کا شور، یہ سب اس کے حواس مختل کیے دے رہا تھا۔ وہ گھبرا کر واپس لوٹ آئی اور اس کی یہ گھبراہٹ فطری سی بات تھی۔ وہ تو کبھی اتنی دور اکیلے سفر پر گئی ہی نہ تھی۔ اپنے گھر، اپنے شہر، اپنے ماں باپ سے سینکڑوں میل دور بے یار و مددگار حالت میں وہ گھبراتی نہ تو اور کیا کرتی۔

اس کی یہ بے چینی اور بدحواسی فاضل کی نظروں سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ پوری باریک بینی سے ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اس کے ارد گرد منڈلاتا رہا تھا۔ لیکن پوری ہوشیاری سے اس کوشش میں تھا

کر اپنے ارد گرد مریم اسے دیکھ نہ لے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔

بے چینی اور گھبراہٹ کا یہ عالم صرف مریم پر ہی طاری نہ تھا۔ فاضل کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی' کیونکہ عالم بھی واپس نہیں آیا تھا۔

شہوز کے تعاقب میں روانہ ہوتے ہوئے ایک مرتبہ عالم اور فاضل کی نظریں چار ہوئی تھیں اور فاضل نے اس کی طرف انگوٹھا بلند کرتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ لیکن پورا دن گزر چکا تھا۔ شہوز واپس آیا تھا اور نہ ہی عالم۔ پتا نہیں ان کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ انتظار کی یہ گھڑیاں اتنی طویل اور اتنی کربناک تھیں اس کا اندازہ مریم سے بہتر اور کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا اور وہ سخت پریشانی کا شکار تھی۔

یہ ہی وہ وقت تھا جب فاضل پر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا اچانک اس کے سامنے جا ٹھہرا۔

"جی! آپ کا نام مریم ہے"

اور مریم سہم کر رہ گئی۔

فاضل کی مکروہ شکل دیکھ کر اسے انتہائی خوف محسوس ہوا تھا۔

"گ... کون۔ آپ کون ہیں۔"

"آپ شہوز کے ساتھ یہاں آئی ہیں۔" فاضل نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرا تیر پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔ شکار زخمی ہوچکا تھا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"آپ۔ آپ۔ شہوز کو جانتے ہیں کہاں ہے وہ۔"

"جی میں شہوز کا دوست ہوں۔ آپ کے بارے میں اس نے پہلے ہی فون پر مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ کراچی آکر آپ لوگوں کو میرے ہی گھر رکنا تھا۔ لیکن افسوس۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا... وہ خیریت سے تو ہے کیا ہوا ہے اسے۔"

"ہاں ہاں آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ وہ زندہ اور صحیح سلامت ہے۔ ذرا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ ایک تیز رفتار کار نے سڑک پر اسے سائیڈ ماری تھی۔ جس سے اسے کافی چوٹیں آگئیں۔ اسپتال والوں کو اس نے میرا پتا دیا تو مجھے پتا چلا' میں ابھی ابھی اسے اسپتال سے گھر منتقل کرکے آیا ہوں گھر پہنچ کر اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ کے حوالے سے وہ سخت پریشان تھا اور اب اس نے مجھے آپ کے لباس اور حلیے کے مطابق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ آپ یہاں بیٹھی ہوئی ملیں گی۔ لہٰذا میں آپ کو لینے یہاں آپہنچا۔"

وہ تو خود یہاں آنا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ فوری یہاں پہنچ پاتا۔ مجبوراً مجھے آنا پڑا۔ آپ چلیں میرے ساتھ شہوز آپ کا انتظار کررہا ہے۔"

اور مریم نے سکون کا سانس لیا۔ جہاں وہ شہوز کے ایکسیڈنٹ اور چوٹیں لگنے کا سن کر پریشان ہوئی تھی۔ وہیں یہ خبر کہ اس نے اسے دھوکا نہیں کیا اس کے لیے گہری طمانیت کا باعث تھی۔

اب فاضل کی مکروہ شکل اسے اتنی مکروہ نہیں لگ رہی تھی۔

اس نے جلدی سے بیگ کندھے سے [illegible] چادر سے کیا گیا نقاب درست کیا [illegible] اور روانگی کے لیے تیار ہوگئی۔

اسے بالکل بھی اندازہ [illegible] سفر جس پر جانے کے لیے وہ تیار ہوئی [illegible] سے کھائی کی طرف کا سفر تھا۔ یہ اند[illegible] کا سفر تھا۔ لیکن وہ ہر بات سے بے نیاز آنکھوں میں [illegible] صورت سجائے جلد سے جلد [illegible] پہنچنا چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک [illegible] میں بیٹھ کر فاضل کے ساتھ کسی انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ گہری نیند سو رہی تھیں کہ ایک دلدوز نسوانی چیخ سن کر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھیں ابھی ان کے اوسان پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور چیخ سنائی دی۔ لیکن اس دوسری چیخ کا درمیان ہی سے گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے چلتے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ نکال دیا گیا ہو۔ شاید چیخنے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہے انہوں نے سوچا۔

انہوں نے جلدی سے چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل آئیں چاروں طرف گہری تاریکی اور مکمل سناٹا تھا کہیں بھی کوئی انہونی یا غیر فطری حرکت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

انہوں نے ارد گرد کے فلیٹس پر نظر دوڑائی لیکن سب دروازے بند تھے گہری خاموشی تھی اور کہیں سے ذرا سی آہٹ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

انہوں نے [illegible] گیلری کا چکر لگایا ارد گرد کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوسکی۔

فاطمہ پچھلے دو سال سے بسیرا اپارٹمنٹ کے فلیٹ [illegible] میں مقیم تھیں۔ ان کے شوہر سعودی عرب [illegible] کے سلسلے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کے ساتھ اکیلی رہتی تھیں بڑی ہی مردار اور دھانسو قسم کی خاتون تھیں ان دو سالوں میں یہ پہلا واقعہ تھا جو حیرت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا پراسرار بھی تھا۔

اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا رات کے کسی نہ کسی پہر ان کی آنکھ کھل جاتی اور آنکھ کھلنے کا سبب وہی مخصوص نسوانی چیخ ٹھہرتی لیکن جب تک وہ جوتی پہن کر باہر کوریڈور میں نکلتیں خاموشی چھا جاتی۔

کرید تو انہیں خاصی لگ چکی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر رہی تھیں۔ یہ مسئلہ ان کے لیے لاینحل ہی رہا تھا لیکن آج وہ تہیہ کیے ہوئے تھیں۔ کہ وہ اس بات کا سراغ لگا کر ہی رہیں گی کہ چیخنے کی یہ آواز کہاں سے اور کیوں بلند ہوتی ہے۔ اس کا حقیقت سے کچھ تعلق ہے یا یہ صرف ان کا وہم ہے۔

اس چیخ کا پس منظر کوئی انسانی سرگرمی کا ہے یا وہ کسی آسیب کا شکار ہوچکی ہیں۔

☼ ☼ ☼

فاضل کے [illegible] کھل گئے تھے مریم اس کے لیے [illegible] ثابت ہوئی تھی اور اس کی اچانک لگنے والی [illegible] لاٹری نے اسے عالم کی یاد سے بھی نجات دلا دی تھی۔ اس نے اسے ڈھونڈنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ مریم کو یہاں لائے اور عالم سے بچھڑے اسے دو مہینے ہوچکے تھے ان دو مہینوں میں روز ہی کوئی نہ کوئی مہمان اس کے گھر ضرور آتا۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی تھی۔

سب سے پہلا گاہک جمشید روڈ کا ایک ڈیلر گلریز تھا جس نے مریم کو دیکھنے کے بعد اور فاضل کے منہ سے مریم کے بارے میں بے پناہ تعریفیں سننے کے بعد آسانی سے دو لاکھ روپے فاضل کے حوالے کردیے تھے۔

اور پھر گلریز ہی کے توسط سے دوسری رات شہر کی ایک اور معتبر شخصیت فاضل کے فلیٹ میں آن وارد ہوئی۔ فاضل بسیرا اپارٹمنٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا اور کچھ عرصے قبل ہی اس نے یہ فلیٹ ایک پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے حاصل کیا تھا۔ لیکن وہ یہاں کم ہی رہتا تھا۔

ہفتے میں ایک آدھ دن ہی وہ یہاں قیام کرپاتا تھا۔ لیکن جب سے لکشمی دیوی اس پر مہربان ہوئی تھی۔ اور مریم کے روپ میں اس کے گھر آن پدھاری تھی وہ کہیں نہیں گیا تھا اور پچھلے دو مہینے سے مسلسل نوٹ جمع کررہا تھا۔

مریم کی وجہ سے ان دو مہینوں میں اس کے پاس اتنی دولت جمع ہوگئی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا اور کوئی اور کام کرکے اتنی دولت جمع کرنے میں شاید اسے سالوں لگ جاتے۔

شروع شروع میں مریم نے شدید احتجاج کیا۔ واویلا مچانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن مکروہ صورت فاضل کے ظلم و ستم کے آگے اس کی ایک نہ چلی شروع کے

دو چار دن اس نے شدید مزاحمت کی۔

شور کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اور پھر اس دن جب مریم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر فاضل نے اس کے نرم و نازک وجود پر اندھا دھند کوڑے برسائے وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی رہ گئی۔ لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس کے حلق سے سوائے خرخراہٹوں کی آواز کے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔

پھر شاید اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ اب ہر رات کے بعد وہ بے جان لاش کی طرح جہاں بیٹھی وہیں بیٹھی رہتی۔

فاضل نے کھانا دیا تو چپ کرکے کھالیا کوئی شور نہ احتجاج' نہ کچھ طلب کرتی نہ کچھ کہتی۔ بس کبھی کبھی اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن جاتیں۔

آج دو مہینے کے بعد بھی ایک مالدار گاہک فاضل کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اور فاضل نے مریم کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھے کہ وہ فاضل کے ساتھ کھنچا چلا آیا تھا۔ فاضل نے حسب معمول اسے فلیٹ میں داخل کیا اور خود لفٹ کے ذریعے نیچے آگیا۔

چوکیدار کے پاس بیٹھ کر فاضل گپیں لگا رہا تھا کہ اچانک تیز سائرن کی آواز سے وہ چونک اٹھا۔

ایک پولیس جیپ گیٹ پر آن رکی تھی۔ اور پولیس کے مستعد جوان اس میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکلے۔

"پولیس کے یہ فرض شناس جوان خودکار اسلحے سے پوری طرح لیس تھے وہ دوڑتے ہوئے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔

کچھ لفٹ میں داخل ہوگئے۔ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے مین گیٹ پر بیٹھے ہونے کے باوجود لفٹ کی پیشانی پر روشن ہوتا پانچویں فلور کا ہندسہ فاضل کو بخوبی نظر آگیا۔

"خان صاحب ہم سگریٹ لے کر آتے ہیں۔"

پٹھان چوکیدار سے یہ کہنے کے بعد فاضل وہاں نہیں رکا تھا۔ اس کی چھٹی حس سے آنے والے

حالات سے باخبر کردیا تھا اور اس نے پتلی گلی کا راستہ پکڑنا ہی بہتر سمجھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں بہت سی رقم جمع ہوچکی تھی اور اب اسے اس فلیٹ یا دولت کمانے کی کسی مشین کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر پٹھان چوکیدار کے سامنے تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس کے جوان واپس نمودار ہوئے۔

بکھرے بال اور زرد رنگت والی مریم اور ایک موٹی توند والا پختہ عمر کا آدمی ان کے نرغے میں تھے۔ پولیس کے جوانوں نے بڑی بے دردی سے دھکے مار کر انہیں گاڑی میں ڈالا اور گاڑی زن کی آواز کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

پٹھان چوکیدار دم بخود کھڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت اندرونی طرف سے فاطمہ برآمد ہوئیں اور چوکیدار سے مخاطب ہوئیں۔

"اے ہے وہ موا منحوس شکل کہاں غائب ہوگیا۔"

"کون منحوس شکل بی بی جی؟" چوکیدار نے استفہامی انداز میں فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اے وہی سڑی شکل والا ٹوپی والا۔"

"اچھا وہ۔ وہ تو ابھی سگریٹ لینے گیا تھا۔"

"بچ گیا کمینہ اب وہ کہاں آئے گا میں تو پہلے ہی کتنے دنوں سے اس کی تاک میں تھی لیکن اس کے مقدر ہی اچھے تھے جو وہ بھاگ نکلا۔"

"ہوا کیا بی بی جی۔" چوکیدار ابھی تک حیرت کے جھٹکے سے نکل نہیں سکا تھا اور شاید معاملہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"وہ لڑکی جو معصوم صورت تھی اس کو بھی پولیس لے گئی ہے شاید فاضل صاحب کی بیوی تھی۔" چوکیدار نے اپنا اندازہ ظاہر کرتے ہوئے مزید

"اے جھاڑو پھرے منحوس کی شکل پر بڑی گھنی تھی وہ اس کی شکل پر نہ جاؤ۔ چھن چھن چھیج نہیں تھے اس کے شکل سے بھولی بھالی نظر آنے والی لیکن حرکتیں ایسی۔ توبہ۔ توبہ۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا آدمی آتا وہاں پر میں تو پچھلے دو مہینے سے پریشان تھی شروع میں تو کئی

دن تک مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ معاملہ کیا ہے لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں خان صاحب یہاں شریف لوگ رہتے ہیں میرے گھر میں بھی دو دو جوان بچیاں ہیں' میں یہ گندگی یہاں کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ کئی دن باقاعدہ تجزیہ کیا ہے میں نے اور میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تو اٹھایا فون اور ملا دیا تھانے' سب کچھ بتا دیا میں نے۔

جھاڑو پھرے ان کمبختوں نے پوری عمارت ناپاک کردی۔ آج تک یہاں ایسی واردات دیکھی نہ سنی۔ پتا نہیں کلموہی کہاں سے آن مری تھی۔

خس کم جہاں پاک۔"

فاطمہ نے بڑبڑاتے ہوئے اور واپس اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ پٹھان چوکیدار حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم نے چپ سادھ لی تھی۔ تفتیشی افسر کے کسی بھی سوال کا جواب نہ دینے کی شاید اس نے قسم کھالی تھی اور جواب دیتی بھی تو کیا کوئی جواب بنتا تو۔ دور کنارہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

"جرم محبت" کی ایسی گھناؤنی سزا تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ آخر جرم ہی کیا تھا اس کا محبت ہی تو کی تھی اس نے' لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

ہر کہانی خوشگوار انجام نہیں رکھتی۔ لڑکیاں جذبات کی رو میں بہک کر محبت تو کر بیٹھتی ہیں لیکن یہ نہیں جانتیں کہ بعض اوقات یہ ہی محبت انہیں کن راستوں پر لے جائے گی۔

اور ظاہری بات ہے اس نے راستہ بھی تو غلط چنا تھا تین جوان بھائیوں کے سر شرم سے جھکا دیے تھے اس نے بوڑھے والد کی عزت و ناموس کا جنازہ نکال دیا تھا۔ گھر کی دہلیز پھلانگ کر ماں کی ممتا کو خون کے آنسو رلا دیا تھا اس نے' پھر خوشیاں اس کا مقدر ٹھہرتیں بھی تو کیسے۔ بس وہ یہی تو کرسکتی تھی کہ چپ کی چادر اوڑھے اور ان کی رسوائی کی عزت پر دھبا نہ لگنے دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

حدود آرڈیننس کے تحت اس کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی اور پھر "دھندہ" کرنے کے الزام میں اسے جیل بھجوا دیا گیا۔

آج جیل کی چار دیواری میں قید مریم سلاخوں کو پکڑے پریشانی کے عالم میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا محبت کا یہ ہی انجام ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی لمحے تیز ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑتا ہوا پرانا سا اخبار کا ایک ٹکڑا اس کے چہرے کے عین سامنے سلاخوں سے آٹکرایا اور پھر ہوا کے دباؤ کی وجہ سے وہیں چپکا پھڑپھڑانے لگا۔

مریم کی ایک نظر اخبار پر پڑی اور اس کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس نے جھپٹ کر اخبار کا وہ ٹکڑا کھینچ لیا۔

کاغذ پر شہروز کی تصویر تھی اس نے جلدی جلدی ساتھ لکھی ہوئی تحریر پر نظریں دوڑائیں۔

"نامعلوم افراد کی فائرنگ سے نوجوان جاں بحق۔"

سرخی کے بعد تفصیلات میں لکھا ہوا تھا کہ "کینٹ روڈ پر نامعلوم افراد کی فائرنگ سے نوجوان ہلاک ہوگیا جس کی شناخت نہیں ہوسکی۔

امکان ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ ڈکیتی کی واردات تھی اور نوجوان سے نامعلوم افراد کچھ رقم وغیرہ چھین کر لے جانا چاہتے تھے لیکن نوجوان کی مزاحمت کی وجہ سے فائرنگ کرکے اسے ہلاک کرگئے پولیس نے مقدمہ درج کرکے تفتیش شروع کردی ہے۔"

دور جیل میں کسی قیدی خاتون کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

جناں مینوں توں ستایا۔
کوئی تینوں وی ستاوے
اللہ کرے تیری کسی نال
اکھ لڑ جاوے۔

☼ ☼

عائشہ نصیر احمد

"عدیل نے اس رشتے سے بھی انکار کر دیا۔" عمر نے ہانیہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ہانیہ جو اخبار کی سرخیوں پر نظریں دوڑا رہی تھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اُسے ہمیشہ سے دوسروں کی فکر میں دبلا ہونے کا شوق تھا اور ہانیہ جانتی تھی جب تک وہ پوری بات سن نہیں لے گا یہاں سے ٹلے گا نہیں، لیکن اس وقت وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی، اس لیے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

"ہاں۔"

"کیوں؟" انداز تفتیش کرنے والا تھا۔

"اس عدیل کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ اس لڑکی کی تصویر تو میں نے خود دیکھی تھی، اتنی خوب صورت تھی کہ نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔" حیرانی اور خفگی سے کہتے ہوئے عمر نے جب اس کے چہرے پر اپنے آخری جملے کا تاثر دیکھا تو وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"میرا مطلب ہے کافی خوش شکل لڑکی تھی۔"

"ہو گی۔" بظاہر لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے اخبار ٹیبل پر پٹخا۔

"لیکن عدیل کا کہنا ہے کہ اس لڑکی کا کریکٹر ٹھیک نہیں۔"

"واٹ؟" عمر کی آواز بلند ہو گئی۔

"وہ ہوتا کون ہے اس طرح کسی بھی لڑکی کے کریکٹر کو نشانہ بنانے والا۔"

"وہ کہہ رہا تھا کہ وہ کئی بار اس لڑکی کو مختلف لڑکوں کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھ چکا ہے۔" ہانیہ بات لہجے میں بتا رہی تھی۔

"عدیل کے مطابق وہ [illegible] کر سکتا ہے، لیکن کردار نہیں۔ تائی بہت غصے میں تھیں کیونکہ بات بہت آگے بڑھ چکی تھی، وہ لوگ تو منگنی کے لیے انگوٹھی کا ڈیزائن بھی پسند کر آئے تھے، لیکن عدیل نے جب تصویر دیکھی تو صاف انکار کر دیا۔"

"جس کی اپنی نیت خراب ہو اسے ہر انسان کا من میلا نظر آتا ہے۔" طوبیٰ جو کچھ دیر پہلے ہی وہاں آئی تھی، ان کی باتیں سن کر خود کو رائے دینے سے باز نہ رکھ سکی۔

"ہمم۔" عمر نے استہزائیہ انداز میں دُہرایا۔

"وہ کسی کے من میں جھانکنے کی زحمت ہی کب کرتا ہے۔ آنکھوں سے جو دیکھتا ہے فوراً ہی اس پر ایمان لا کر اسٹیٹمنٹ جاری کر دیتا ہے اور چاہتا ہے باقی سب اس پر یقین بھی کریں۔ لاسٹ ٹائم اس [illegible] کے لیے منع کیا تھا اس کے بارے میں بھی عدیل کا کہنا یہ ہی تھا کہ وہ اسے اس کے کزنز کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔"

"تو حد ہے یہ [illegible] کزنز کے ساتھ تو ہم بھی شاپنگ کرنے [illegible] تو کیا ہم بھی اچھی لڑکیاں نہیں ہیں۔" [illegible] انداز میں غصہ ہی غصہ تھا۔

"[illegible] عدیل کے خیالات تمہارے بارے بھی [illegible] زیادہ مختلف نہیں۔" ہانیہ صرف یہ سوچ [illegible] اور وہ دونوں عدیل کی شخصیت کو ڈسکس کرنے لگے۔

یہ تو سچ ہی تھا کہ اس پورے گھر میں عدیل شروع ہی سے نہایت انوکھے خیالات لے کر پیدا ہوا تھا۔ عدیل چونکہ طبیعتاً بہت کم گو تھا اس لیے کسی کو بھی اس کے مزاج اور فطرت کا کچھ خاص اندازہ نہیں تھا۔ کچھ

وہ خود بھی اپنے کزنز کے ساتھ اتنا گھلتا ملتا نہیں تھا۔ کبھی کبھی جب ان سب کی محفل جمی ہوتی تو عمر یا ایاز میں سے کوئی اسے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی بٹھا لیتا اور پھر بجائے انجوائے کرنے کے جب اس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات دیکھنے کو ملتے تو ہاتھ جوڑ کر اس سے جانے کی درخواست کی جاتی اور وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آتا۔ ایسے میں شدت سے ہانیہ کا جی چاہتا کہ وہ اٹھ کر اسے روک لے۔ اس سے باتیں کرے، [illegible] کرنے پر مجبور کرے، مگر وہ ایسا نہیں کر [illegible]۔ اس کا الگ تھلگ سا مزاج اسے ایسا کرنے سے باز رکھتا تھا۔ جو خول اس نے اپنے گرد قائم کر رکھا تھا اسے توڑنے کی ہانیہ میں ہمت نہیں تھی۔ اپنے تمام تر جذبے اپنے دل میں چھپائے وہ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ
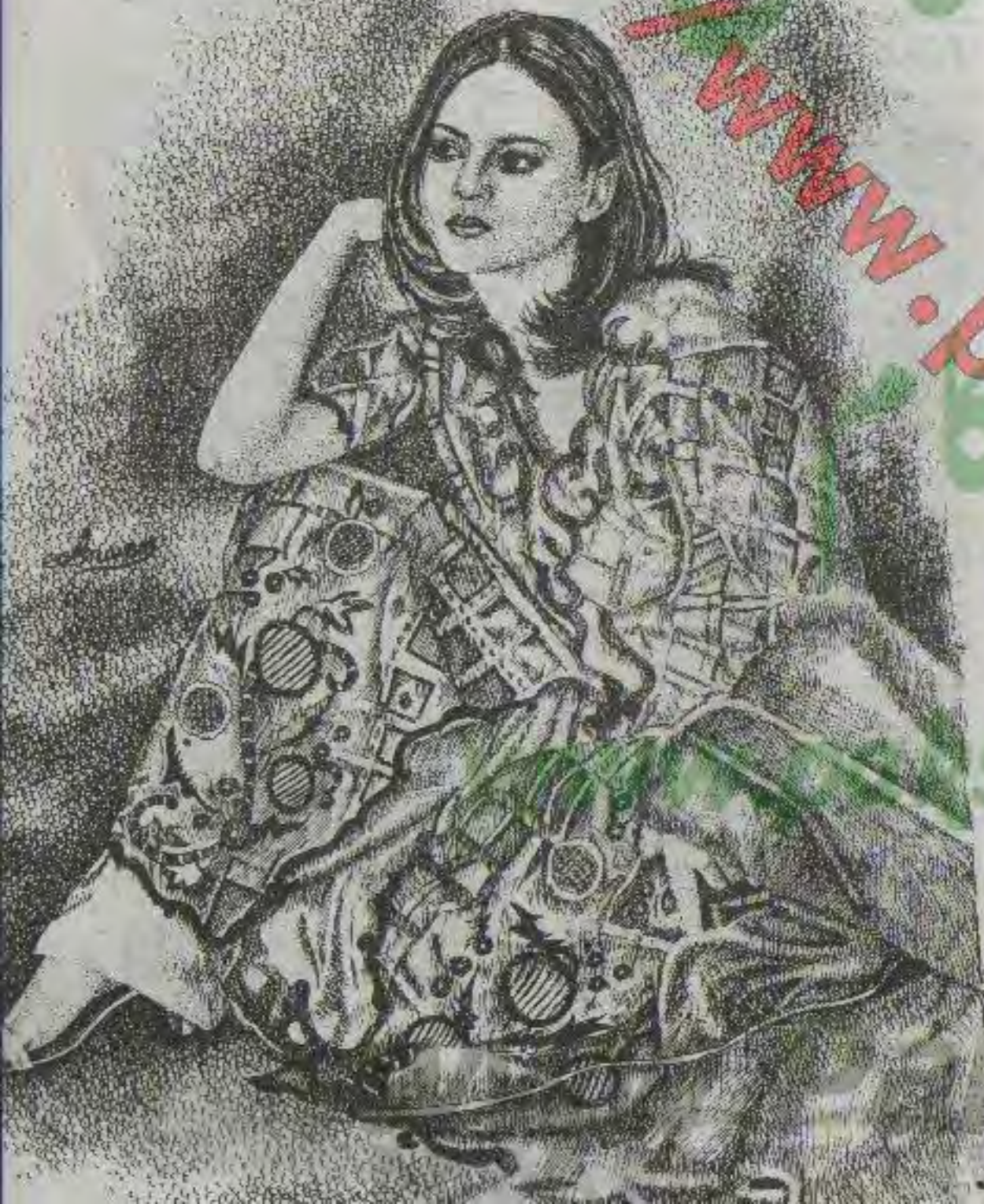
عدیل اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ اس کا رویہ ہانیہ کے ساتھ ویسا ہی تھا جیسا کہ باقی کزنز کے ساتھ تھا۔ وہ خوش فہم ضرور تھی، لیکن احمق نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ شاید ہی اپنی زندگی کے کسی ایک لمحے میں بھی وہ یکسو ہو کر صرف اور صرف اسے سوچے اور یہاں وہ تھی کہ اپنا سب کچھ اسی کے نام کیے بیٹھی تھی۔ جب گھر میں عدیل کی شادی کی باتیں ہونے لگیں تو اس کے دل میں بہت سے خوش کن خیالات نے ہلچل مچائی تھی کیونکہ دیگر لڑکیوں کے برعکس تائی کا رویہ ہمیشہ اس کے ساتھ خصوصی شفقت لیے ہوئے ہوتا تھا۔ یہ بات صرف اس نے نہیں گھر کے باقی افراد نے بھی نوٹ کی تھی۔ لیکن اس وقت سب حیرت زدہ ہو گئے، جب تائی نے عدیل کے لیے خاندان سے باہر لڑکیاں دیکھنے کا اعلان کیا۔ گھر میں نہ جانے کتنے ہی دنوں تک ان کے اس فیصلے پر ڈسکشن ہوتی رہی۔ اگر کوئی چپ تھا تو وہ ہانیہ تھی۔ دل میں طوفانوں کو دبائے وہ تائی کے اس فیصلے کا سبب بھی جانتی تھی جو اتفاقاً ہی اسے معلوم ہو گیا تھا۔

اس دن وہ تائی کو بلانے ان کے کمرے میں جا رہی تھی۔ جہاں عدیل بھی موجود تھا۔ اور تب ہی اس نے پہلی بار یہ جانا کہ عدیل اس کے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے۔ تائی اسے ہانیہ کے لیے کنوینس کرنے میں لگی ہوئی تھیں اور وہ بےزار سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"آپ جانتی ہیں امی، آپ کو میری طبیعت کا پتا ہے، میں ہانیہ سے شادی نہیں کر سکتا، سنجیدگی تو اس میں نام کو نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنے لڑکی ہونے کا کچھ خیال ہے، کتنی بے تکلفی سے بلکہ میں تو اسے بے باکی کہوں گا، وہ ایاز اور بلال وغیرہ سے ہنسی مذاق کرتی ہے، لڑتی جھگڑتی ہے۔ کزنز ہیں تو کیا ہوا۔ اخلاقی حدود بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو خاص کر اپنی حد ہی میں رہنا چاہیے۔ میں اس سے شادی کر لوں اور وہ بعد میں بھی یہی سب کرے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا کہ میری بیوی میرے سامنے دوسرے لڑکوں سے گپیں لڑائے یا ہنسی ٹھٹھول کرے۔ [illegible] شادی کی بات تو آپ بھول جائیے امی۔ اس کے علاوہ آپ جو کہیں میں ماننے کے لیے تیار ہوں۔"

"اس کے علاوہ میں اور کیا کہوں۔" تائی کو حقیقتاً صدمہ پہنچا تھا۔

"میں نے تو ہمیشہ ہانیہ ہی کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھا۔ اس کے علاوہ اس گھر کی کوئی لڑکی ہوگی، اس پر بھی تمہارا یہی اعتراض ہوگا۔ اور... اور مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا عدیل کہ تمہارے ذہن میں یہ خرافات بھریں کس نے؟ کزنز کی مثال تو بہن بھائیوں کی طرح ہوتی ہے، گپ شپ ہوتی ہے، ہنسی مذاق بھی ہوتا ہے، لیکن کوئی بھی تمہاری طرح فضول کی سوچوں کو ذہن میں جگہ نہیں دیتا۔ خیر اگر تمہیں ہانیہ پسند نہیں ہے تو پھر میں خاندان سے باہر ہی کوئی لڑکی دیکھ لوں گی، کیونکہ اگر ہانیہ نہیں تو پھر اس خاندان کی کوئی بھی لڑکی نہیں۔" ہانیہ بمشکل اپنے قدم گھسیٹتی اپنے کمرے تک آئی تھی۔

آگہی کے یہ چند لمحے اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئے تھے۔ کبھی جو یہ خواہش اس کے ذہن میں مچلتی کہ کاش وہ عدیل کا ذہن پڑھ کر یہ جان سکتی کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے، جتنا اہم وہ ہانیہ کے لیے ہے، کیا وہ بھی اس کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے اور آج جب عدیل کے احساسات اس پر منکشف ہوئے تو اسے اندازہ ہوا کہ اب تک وہ بے خبر ہی رہتی تو اچھا تھا کیونکہ اسی میں اس کی عافیت تھی۔ [illegible] رسوائی کا دکھ اتنا بڑا نہیں ہوتا جتنا جان لیوا یہ احساس کہ ٹوٹ کے چاہا ہو اس سے محبت [illegible] بھی نہ ملے۔ اور ہانیہ اسی احساس [illegible] بکھر رہی تھی۔ اپنی ہی لگائی ہوئی [illegible] جل رہی تھی اور یہ جلنا شاید اب زندگی بھر [illegible] مقدر تھا۔

"مبارک ہو، عدیل کے لیے وہ لڑکی مل ہی گئی، جسے [illegible] ڈھونڈ رہے تھے۔" ڈنر کے بعد جب وہ سب محفل جمائے بیٹھے تھے۔ طوبی نے لاؤنج میں انٹر ہوتے ہوئے خبر سنائی۔

"سب نہیں صرف تائی کہو۔ کسی کا دماغ خراب نہیں ہے کہ وہ اسٹوپڈ بندے کے لیے خواری اٹھائے۔" زوبی نے ناک چڑھائی۔

"اور ویسے بھی تائی تو اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں دیکھ چکی ہیں، مسئلہ تو سارا عدیل کا ہے۔"

"تم بتاؤ طوبی۔ وہ لڑکی کون ہے؟" ایاز نے پوچھا۔

"جی دیکھی بھالی ہی ہے، مطلب وہ کہتے ہیں نا چراغ تلے اندھیرا۔" اس نے زوبی کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا خاندان ہی کی کوئی لڑکی ہے؟" [illegible] چونک گئی۔

"نہیں بھئی، میں سدرہ کی بات کر رہی ہوں، تائی جی کی سب سے گہری [illegible] کی بیٹی۔"

"اوہ!" ایاز [illegible] بے اختیار ایک گہری سانس نکل گئی۔

"وہ [illegible] بہت اچھی لڑکی ہے، خوب صورت بھی ہے اور [illegible] بھی، طبیعت بھی بڑی سلجھی ہوئی پائی ہے [illegible] نے۔" زوبی نے تبصرہ کیا۔

"پھر تو عدیل کے لیے بالکل بھی سوٹ ایبل نہیں ہے۔" بظاہر ڈسکوری چینل پر چل رہی کوئی ڈاکومنٹری فلم دیکھتے بلال کے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے موقع ملتے ہی اس نے اپنی رائے بھی بیان کر دی۔

"میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اکلوتی ہے۔" ایاز نے ہمیشہ کی طرح الگ ہی نکتہ اٹھایا۔

"کیا مطلب... اس کی خوب صورتی اس کی تعلیم کچھ بھی نہیں۔" زوبیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"اور میری نظر میں تو یہ خرابی ہے، بھئی اس کی بہنیں ہوتیں تو ہمارا بھی چانس نکل سکتا تھا نا۔" بلال بھی بول پڑا۔ جس پر طوبی نے نہایت گھور کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاں! اور بھائی ہوتے تو تمہیں لتر بھی پڑ سکتے تھے۔" ایاز ہنس پڑا۔

"یہ تو میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ ہمارے عدیل صاحب سالیوں کی آفت سے محفوظ رہیں، ورنہ حارث بھائی کی طرح ان کو بھی بیوی کے ہمراہ سالیوں کے نخرے اٹھاتے اٹھاتے [illegible] رہ جائیں گے۔" اس نے [illegible] ہونے کی وجہ بیان کی، پھر سدرہ سے مخاطب ہوا۔

"اچھا۔ عدیل کی کیا رائے ہے؟ اس نے سدرہ کو دیکھا تو ہے نا۔"

"ہاں دیکھا تو ہے۔" طوبی نے سر ہلایا۔

"باقاعدہ بات یا ملاقات بھی نہیں ہوئی، مگر اصل بات یہ ہے کہ وہ راضی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پہلے سے ہی سدرہ کو پسند کرتا ہو اور اسی لیے اس نے ان لڑکیوں کو ریجیکٹ کیا ہو۔" بلال نے خیال ظاہر کیا۔

"جی نہیں۔" طوبی نے اس کی بات رد کی۔

"اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ تائی کے بار بار پوچھنے پر انہیں بتا دیتا۔ اس نے کئی بار تائی سے کہا تھا کہ وہ کسی کو پسند نہیں کرتا، البتہ کچھ خصوصیات جو وہ اپنی ہونے والی بیوی میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ اس نے ضرور تائی جی کو بتا دی تھیں، جس کی بنا پر تائی نے سدرہ کو پسند کیا۔"

"چلو جی... عدیل کی نیا تو پار لگ ہی گئی۔" بلال نے ہاتھ جھاڑے۔

"اب ہم منگنی کی تیاریاں شروع کریں۔"

"تم نے کیا تیاری کرنی ہے، غرارے شرارے سلوانے ہیں کیا؟" طوبی نے تعجب سے اسے دیکھا۔ اسی وقت ہانیہ چائے لے کر لاؤنج میں چلی آئی اور اسے دیکھ کر بلال نے با آواز بلند شکر ادا کیا۔

"تھینک گاڈ... ویسے ہانیہ اب بھی یہ چائے لانے کی کیا ضرورت تھی، ناشتے میں تو بس کچھ ہی ٹائم رہ گیا ہے۔" گھڑی پر نگاہ ڈالتے اس نے طنز کیا تھا۔ مگر وہ بنا کوئی رد عمل ظاہر کیے خاموشی سے سب کو چائے دینے لگی۔

"تم نے سنا ہانیہ، عدیل کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔" اب کے زوبی نے اسے مخاطب کیا۔ وہ چونکی نہیں تھی، بس طوبی کو کپ پکڑاتے ہوئے ہاتھ ذرا سا کانپا تھا اور

گرم گرم چائے اس کے ہاتھ پر چھلک گئی۔

"یہ الو کھا رواج ہے اس گھر کا۔ سب سے اول تو بھینسا قابو میں آ گیا، پھر بھی بجائے مٹھائی کھلانے کے صرف چائے پر گزارا کیا جا رہا ہے۔" بلال کا لہجہ تپا ہوا تھا۔

"چائے سے زیادہ منہ اور کسی چیز سے میٹھا نہیں کیا جا سکتا اور چائے بھی وہ جو ہانیہ بی بی نے بنائی ہو۔" اس کی چائے میں ہمیشہ شکر زیادہ ہوتی تھی اور ایاز نے اس پر چوٹ کی تھی۔

"یہ عمر کہاں ہے شام سے نظر نہیں آ رہا۔" بلال کو اچانک ہی عمر کی یاد آئی۔

"اپنے دوست کی شادی میں گیا ہے اور شاید آنے میں دیر ہو جائے۔" ہانیہ نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

"یہ تو بس دوستوں کے نکاح کے چھوہارے کھاتا رہے گا اپنی فکر نہیں کرنی۔" ایاز ہنس کر بولا۔ اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ بے چینی سے پہلو بدلتے اسے بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔

جب شام کو وہ اپنے دل کی گھبراہٹ کم کرنے کے لیے لان میں چلی آئی تھی۔ ان دنوں ہانیہ بہت بے چین سی رہنے لگی تھی۔ ایک عجیب سی اداسی تھی، جس سے باوجود کوشش کے وہ چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ سارا سارا دن گھر میں جلے پیر کی بلی کی طرح پھرتی دل کا غبار کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت بھی اسے لان میں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ جب وہ خوشبوئیں بکھیرتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"واؤ۔" وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"کہیں جانے کی تیاری ہے؟"

"ہاں۔ عدیل کی شادی ہے۔" وہ چیئر گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ویسے تو مجھے دیر ہو رہی ہے، لیکن جب میں نے کھڑکی سے تمہیں یہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اپنی تیاری ادھوری چھوڑ کر بھاگتے ہوئے آیا ہوں۔"

"کمال ہے، اب بھی تمہاری کچھ تیاری رہتی ہے۔" تعجب سے کہتے ہوئے ہانیہ نے سر تا پا اس کا جائزہ لیا۔ اپنے لاپروا حلیے کے برعکس بلیک پینٹ اور لائٹ براؤن شرٹ پر میچنگ ٹائی لگائے آج وہ بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

"اور میرے پیچھے بھاگ کر آنے کی کیا ضرورت تھی، میں نے کیا تمہارا کچھ چرا لیا تھا جو تم مجھے پکڑنے دوڑے چلے آئے۔" وہ ہنس پڑا اور پھر اس پر اپنی گہری نگاہیں جماتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں، تم نے میرا بہت کچھ چرا لیا ہے، میرا چین، میرا سکون، میرا دل، میرا سب کچھ۔" جذبوں سے پُر گمبھیر لہجے میں کہتے وہ ہانیہ کو بت بنا گیا تھا، نہ جانے کتنی ہی دیر وہ چپ چاپ ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

"میں کئی دنوں سے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا، لیکن اس گھر میں تمہارا اور تنہائی کا ایک ساتھ ملنا ایک کرشمہ ہی تھا اور کہیں باہر جانے کی بات کرتا تو سب ہی سر ہو جاتے، اس لیے آج تمہیں اکیلے دیکھ کر میں نے سوچا اس سنہرے موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہو گی۔" وہ بازو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ لان میں اچھی خاصی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، اس کے باوجود اسے اپنا پورا وجود تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" سب سمجھ کر بھی [illegible] کے منہ سے کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ [illegible] ہنس پڑا اور کہتا کہ "میرے ایک مذاق [illegible] کتنا سنجیدہ کر دیا یا پھر یہ کہ ارے تم ابھی [illegible] ہو گئیں۔ میں نے تو یوں ہی تمہاری اس حیران سی شکل کو دیکھنے کے لیے ایک [illegible]" مگر وہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا، [illegible] سنجیدگی لیے۔

"امی [illegible] سے میری پسند پوچھی تھی، میں نے ان کے سامنے تمہارا نام نہیں لیا، یہ سوچ کر کہ پہلے میں تمہارے خیالات جان لوں، تمہیں شاید حیرت ہو رہی ہو کہ اچانک مجھ میں اتنا بڑا چینج کیسے آ گیا۔"

"ہاں اور تم اتنی بہکی بہکی باتیں کیوں کرنے لگے ہو۔" ہانیہ بیچ میں ہی بول پڑی۔ عمر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"تم اسے بہکی باتیں کہہ سکتی ہو، لیکن یہ بے ارادہ اور بے سوچے سمجھے ہرگز میرے منہ سے نہیں نکلیں۔ میں تو انہیں کافی عرصے سے دل میں دبائے ہوئے تھا، بس مناسب وقت کے انتظار میں تھا کیونکہ میں نے سنا ہے غلط وقت پر کی جانے والی اہم سے اہم بات بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔"

"تم نے اب بھی کچھ زیادہ صحیح وقت نہیں چنا ہے بات کرنے کے لیے۔" پیشانی پر آئے پسینے کے قطرے اپنی انگلیوں کی پوروں [illegible] کر ہانیہ نے اسے دیکھا۔

"میری سمجھ میں [illegible] میں کیا کہوں۔" اس کے لہجے [illegible] اضطراب محسوس کر کے عمر کو عجیب سی [illegible] ہونے لگی۔

"میں [illegible] جذبات سمجھ سکتی ہوں، لیکن میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں [illegible]"

"یہ کوئی وجہ نہیں ہے ہانیہ، محض جان چھڑانے کا ایک بہانہ ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"تمہیں شاید ایسا لگتا ہو، لیکن میرے نزدیک یہ بہت بڑی وجہ ہے۔" اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

"اچھا ہی ہوا اگر تم نے چچی کے سامنے میرا نام لینے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا، میں ہرگز نہیں چاہتی کہ تم ان کے سامنے میرا نام لو، تمہارے دل میں میرے لیے جو بھی جذبات ہیں میں ان کی قدر کرتی ہوں، لیکن میں ان کی پذیرائی نہیں کر سکتی، آئی ایم سوری۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولتی گئی، یہ دیکھے بغیر کہ اس کی باتوں کا عمر پر کیا اثر ہوا تھا، ہونٹ بھینچے دھواں دھواں چہرہ لیے وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے ہانیہ سے اس دو ٹوک جواب کی توقع نہیں تھی۔

"تم مجھے اپنے اس انکار کی ٹھوس وجہ بتاؤ گی ہانیہ۔"

"ٹھوس وجہ۔" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس سے زیادہ ٹھوس وجہ اور کیا ہو گی کہ میں نے کبھی تمہارے لیے وہ سب محسوس ہی نہیں کیا جو تم کرتے ہو، جسے [illegible] اور وہ بھی تم ہی سے پیار کرے یہ ضروری نہیں [illegible] تم سمجھ دار انسان ہو پھر مجھے کیوں [illegible] بات سمجھانی پڑ رہی ہے، میں نہیں [illegible] کرنا چاہتی ہوں تم سے شادی۔" اس کا انداز بہت [illegible] عمر کو کوئی بھی امید نہیں دینا چاہتی تھی۔ شاید اس وقت وہ بہت خود غرض بن گئی تھی۔ اگر ایک بار بھی وہ اپنے اندر جھانک لیتی تو شاید عمر کی محبت کو اس بے دردی سے نہ ٹھکراتی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عمر بھی اٹھ کر اس کے مقابل آ گیا۔ چند لمحے اس پر اپنی سلگتی نگاہیں جمائے اس نے کہا۔

"میں تمہیں اتنا بے حس نہیں سمجھتا تھا ہانیہ! تمہارے نزدیک میری محبت کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ نہ جانے کب سے میں دل ہی دل میں تمہیں چاہتا رہا ہوں، میرا خیال تھا کہ جب میں تم پر اپنی یہ شدتیں آشکار کروں گا تو تمہاری طرف سے بھی مجھے وہ ہی سب سننے کو ملے گا، جسے سننے کا میں شدت سے منتظر تھا۔ جسے اس سارے عرصے میں، میں نے نہ جانے کتنی ہی بار تصور ہی تصور میں تمہیں کہتے سنا تھا۔ میں نے تو کبھی خواب میں نہیں سوچا تھا کہ تم اس طرح بھی ری ایکٹ کر سکتی ہو۔" تاسف اور دکھ کی شدت سے اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ ہانیہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"میں بے بس ہوں عمر، میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، تم نے یہ بھی ٹھیک کہا کہ میں بے حس ہو چکی ہوں، میرے دل پر شاید اب کوئی بھی خوب صورت جذبہ اثر نہ کرے، مجھے بے اعتبار ہونے سے ڈر لگتا ہے، مجھ میں مزید اپنی عزت نفس کے کچلے جانے کی تاب نہیں ہے، تمہارے جذبے سچے ہو سکتے ہیں، لیکن میری ذات کا اعتماد چکنا چور ہو چکا ہے۔" وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھی۔

"اتنی بڑی نادانی مت کرو، جس پر بعد میں تم پچھتا بھی نہ سکو۔" وہ بوجھل لہجے میں کہہ رہا تھا، ہانیہ خاموش کھڑی تھی۔

وقت اس وقت جو بھی کو چاہیے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر میں تمہارے فیصلے جواب کا انتظار کروں گا۔"
اسے اپنا فیصلہ سنا کر وہ مزید رکے بغیر وہاں سے چل دیا۔

عدیل کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا گو کہ سدرہ کے گھر والے اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن یہاں تائی بھی کوئی رسک اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اللہ اللہ کر کے عدیل راضی ہوا تھا۔ مگر تائی کو اب بھی کوئی اعتبار نہیں تھا اس سے پہلے کہ وہ پھر سے کوئی نیا اعتراض کر کے اپنی بات سے پیچھے ہٹتا' وہ یہ شادی کروا لینا چاہتی تھیں۔

شادی میں جس کسی نے بھی سدرہ کو دیکھا اس کی خوب صورتی کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔ اس کے گھر والے بھی کافی سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ سدرہ چونکہ اکلوتی تھی' اس وجہ سے اس کے کافی سارے کزنز اس کے بہن بھائیوں کی کمی پوری کر رہے تھے۔ ایک ہینڈسم سا لڑکا جو ہر کام میں پیش پیش تھا اور یہاں سب ہی کو سدرہ سے اس کا رشتہ جاننے میں دلچسپی تھی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ بات کھل گئی کہ عبید دراصل سدرہ کا خالہ زاد ہے' دونوں کا بچپن کا ساتھ ہے۔ ساتھ ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں اور دونوں میں بہت کلوز فرینڈ شپ ہے۔ یہ بات سدرہ کی ممی نے عبید کا ان سے تعارف کراتے ہوئے بہت فخریہ انداز میں بتائی تھی۔ اور بعد میں زونی نے جب یہ بات طوبیٰ کو بتائی تو اس نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا۔

"یعنی یہاں پر بھی ایک کزن نکل ہی آیا' شاید عدیل کی قسمت ہی ایسی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟" زونی نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"مطلب تو صاف ہے' صبیحہ سے شادی سے انکار بھی عدیل نے اس کے کسی کزن کی وجہ سے کیا تھا اور یہاں بقول سدرہ کی ممی کے ان دونوں میں گہری دوستی ہے' عدیل اس بارے میں کیا سوچے گا اور ان کی دوستی کو کن معنوں میں لے گا۔ اندازہ ہے عدیل کی طبیعت کا۔" طوبیٰ نے اسے بات سمجھائی۔

"ارے ہاں۔" زونی نے سر ہلایا۔

"لیکن کیا تائی کو یہ بات پہلے سے پتا نہیں تھی' سدرہ کی ممی کا شمار تو ان کی گہری سہیلیوں میں ہوتا ہے۔"

"میرا تو خیال ہے نہیں پتا تھی' سدرہ کے گھر والے ان باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے' اس لیے انہوں نے تائی کو بتانا ضروری نہیں سمجھا ہو گا اور اس میں ایسی کوئی بری بات بھی نہیں' کزنز تو کزنز ہوتے ہیں' اب ان بے چاروں کو کیا پتا کہ جس بندے سے وہ اپنی بیٹی کا نصیب جوڑنے جا رہے ہیں وہ کتنا تنگ ہے اس معاملے میں۔" طوبیٰ نے بات ختم کر کے سدرہ کی طرف دیکھا جو کچھ دیر پہلے ہی اپنی ممی کے گھر سے لوٹی تھی۔

"کتنی خوش خوش لگ رہی ہے نا۔" اس کے چہرے پر چمکتی خوب صورت شرمگیں مسکراہٹ دیکھ کر طوبیٰ نے ان سے کہا تھا۔ ہانیہ بھی کچھ دیر پہلے ہی ان کے درمیان آکر بیٹھی تھی۔

"خوب صورت اور خوش قسمت لوگ زندگی میں کبھی نا آسودہ اور غیر مطمئن نہیں رہتے' خوشی ہمیشہ ان کے قدم چومتی ہے۔" ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے اپنے دل کا حبس کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ اب بھی عدیل کے بارے میں سوچتی تھی یا اسے سدرہ سے کوئی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ بس کوئی کوئی لمحہ ایسا [illegible] ہوتا تھا جب دل کو سنبھالنے کے سارے [illegible] بے سود ثابت ہوتے تھے۔ اندر کا [illegible] آنکھوں سے تو کیا لہجے سے بھی چھلک [illegible] اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

طوبیٰ نے [illegible] سے دیکھا تو وہ نگاہیں چرا گئی' ابھی کل ہی تو [illegible] نے طوبیٰ کو عمر کے بارے میں بتایا تھا اور وہ کتنا خوش ہوئی تھی سن کر کہ اس کا بھائی بھی اسے ہی دل میں بسائے ہوئے ہے' جسے وہ بھابھی بنانے کی خواہش مند ہے۔

"اف یہ عمر بھی نا' ایک نمبر کا گھنا ہے' کبھی پتا چلنے ہی نہیں دیا اور چالاکی کی حد دیکھو کہ اتنے دنوں سے میں اس سے تمہارے بارے میں پوچھ رہی ہوں' کچھ منہ سے پھوٹتا ہی نہیں' مجھے تو اپنے پاگل پن پر غصہ آ رہا ہے' وہ اسی لیے اتنا مطمئن تھا کہ اس نے ڈائریکٹ تم سے بات کر رکھی تھی' آنے دو اسے... آج تو میرا اس سے زبردست قسم کا جھگڑا ہونے والا ہے۔" اسی جوش میں بولتی جب طوبیٰ کی نظر اس کے گم صم چہرے پر پڑی تو ٹھٹک گئی۔

"ہانیہ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"دل کو کسی [illegible] بہت پڑتے وہ ہانیہ کو تکنے [illegible] یہاں اس کی [illegible] نہیں ہے۔ اس نے دل سے تمہارا [illegible] چاہا ہے تو تم بھی ان واہموں سے نکل کر اپنی [illegible] ختم کر کے اس کا ہاتھ تھام لو۔ میں یہ سب اس لیے نہیں کہہ رہی کیونکہ وہ میرا بھائی ہے' عمر کیسا انسان ہے یہ تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ اگر کوئی اتنے خلوص نیت سے اتنی چاہت سے تمہارے ساتھ کا متمنی ہو تو اس کی محبت کو ٹھکرانا محض بے وقوفی ہے' بلکہ سنگدلی ہے۔" طوبیٰ اسے بہت اپنائیت سے سمجھا رہی تھی۔ یہ الگ بات کہ ہانیہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھی یہ سوچ کر۔

"طوبیٰ کو اصل بات نہیں پتا کہ میں نے کبھی عدیل کو چاہا تھا۔ عمر شکی طبیعت کا نہیں لیکن مردوں کا مزاج بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی اس کے علم میں یہ بات آئے تو مجھے اس کے دل سے اترنے میں شاید ایک لمحہ بھی نہ لگے۔ اور ابھی بھی میں ان کی فطرت جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ کیا پتا اسے بھی میری بلال' ایاز وغیرہ سے بے تکلفی سے بات چیت ناگوار گزرتی ہو۔ حدوں سے باہر لگتی ہو۔" اس سوچ سے آگے وہ مزید کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ اگر عمر واقعی ایسی سوچ رکھتا تو بھی اسے پرپوز نہ کرتا۔

☆ ☆ ☆

سدرہ بہت صاف دل کی معصوم سی لڑکی تھی۔ یہ اندازہ ہانیہ نے کچھ ہی دنوں میں لگا لیا تھا۔ ان کے ساتھ اس کی بہت اچھی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ اکثر [illegible] ہنسی مذاق بھی کرتی۔ مگر ہانیہ نے [illegible] نوٹ کیا تھا کہ جب بھی لڑکوں میں سے اگر کوئی [illegible] تو وہ غیر محسوس انداز میں اٹھ جاتی تھی۔ اور اگر پہلے سے ہی بیٹھے ہوتے تو ان کے بیچ بیٹھنے سے گریز کرتی تھی۔ ہانیہ کا خیال تھا کہ یہ صرف اس نے نوٹ کیا ہے۔ لیکن ایک دن بلال نے بھی کہہ ہی دیا۔

"کیا بات ہے بھابھی' آپ کو ہمارے ساتھ بیٹھنا' بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"نہیں تو' ایسی کوئی بات نہیں۔" سدرہ گھبرا سی گئی اس کی بات پر۔ اس وقت اس کی نروس نس محسوس کر کے ہانیہ نے ہی بات بدل دی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی سدرہ کے اس رویے کا سبب کیا ہے۔

شادی کے کچھ دنوں کے بعد سدرہ کا کزن اسے لینے آیا تھا۔ لیکن دوبارہ اس کی آمد بھی نہیں ہوئی۔ یہ گتھی بھی ہانیہ نے بغیر کسی مشکل کے سلجھا لی تھی۔ بس سدرہ سے تصدیق کرنا باقی تھا' نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ سدرہ اس کے ایک بار پوچھنے پر ہی اسے سب بتا دے گی اور پھر یہی ہوا تھا شاید سدرہ خود بھی کسی سے دل کا حال کہنے کے لیے بے چین تھی۔ ہانیہ کے اپنائیت سے پوچھے جانے پر اس کے اندر کھولتے لاوے کو جیسے باہر نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔

"جانتی ہو ہانیہ' میں نے کبھی کوئی سہیلی نہیں بنائی' بچپن سے ہی میں نہایت دبو اور ڈرپوک سی لڑکی تھی۔ مجھ میں اتنا اعتماد بھی نہیں تھا کہ میں کسی سے ٹھیک سے بات بھی کر پاتی۔ بہن بھائی جیسے رشتوں سے محرومی نے مجھے مزید کم گو بنا دیا تھا۔ ایک عبید ہی تھا جو بیک وقت میرا کزن بھی تھا' میرا بھائی بھی تھا اور میرا دوست بھی' میں اس سے دل کی ہر بات کہہ جاتی تھی' لیکن اب..." وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اس کے سرخ چہرے اور بھیگی آنکھوں سے اس کی دلی کیفیت عیاں تھی۔

"دراصل عدیل کو پسند نہیں ہے۔" اس نے بتایا تو

ہانیہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یہی تو وہ سننا چاہتی تھی۔

"کیا اس نے پہلے ہی دن مجھے سمجھا دیا تھا کہ میں اس کے کزنز کے ساتھ زیادہ بات چیت سے گریز کروں اور ان کے سامنے کم کم ہی آؤں۔ تمہیں یاد ہے ایک بار عبید مجھے لینے آیا تھا۔ تب اتنا شدید رد عمل ظاہر کیا تھا عدیل نے کہ میں رونے لگی تھی اس وقت اور کئی دن ڈسٹرب رہی تھی۔ عبید میرا کزن تھا۔ میرے بھائیوں جیسا تھا۔ لیکن عدیل نے جس طرح ری ایکٹ کیا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اپنے اور عبید کے رشتے کے حوالے سے میں نے عدیل کی آنکھوں میں جو شکوک و شبہات دیکھے اس سے قصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی میں خود کو مجرم سمجھنے لگی۔ عدیل بے حد عجیب انسان ہے ہانیہ، وہ اعتبار کرنا نہیں جانتا، وہ اعتماد دینا نہیں جانتا، میں تو اس کی زندگی میں اب شامل ہوئی ہوں، لیکن اس کے کزنز تو بچپن سے اس کے ساتھ رہے ہیں، اس کے ساتھ پلے بڑھے ہیں کیا عدیل نے ابھی تک ان کی فطرت نہیں جانی، ان کا مزاج نہیں سمجھا۔ اتنی بے یقینی، اتنی بے اعتباری کیوں ہے اسے، کیوں اسے یہ لگتا ہے کہ اسے چھوڑ کر دنیا کا ہر انسان کرپٹ ہے، لوز کریکٹر ہے، بری نیت والا ہے، اسے اپنی بیوی تک پر اعتبار نہیں، اس سے بڑھ کر اس کی بدگمانی کی انتہا اور کیا ہوگی۔" دکھ اور بے بسی سے کہتے وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی چلی گئی۔ ہانیہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ بظاہر خوش باش سی دکھائی دینے والی سدرہ، عدیل کے شکی مزاج سے اس درجہ پریشان ہے اور اپنے دل میں اتنے شکوے چھپائے بیٹھی ہے۔

"میاں بیوی کا رشتہ تو یقین کا رشتہ ہوتا ہے، محبت سے بھی پہلے اگر اس رشتے میں اعتبار نہ ہو تو پھر سب کچھ بے معنی ہے، اور عدیل۔ اس کے نزدیک تو کوئی بھی قابل بھروسہ نہیں ہے، سوائے اس کی اپنی ذات کے۔ مجھے تو بے حد مشکل نظر آتا ہے کہ [illegible] میں کبھی اس کا یقین جیت بھی پاؤں گی [illegible]" کتنی بے بسی اور مایوسی تھی اس کے [illegible] میں۔ ہانیہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی، کوئی جھوٹی تسلی، کوئی دلاسا بھی نہ دے سکی۔

✲ ✲ ✲

عمر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے مثبت جواب کا انتظار کرے گا۔ اس وقت ہانیہ کا خیال تھا کہ اتنے دوٹوک جواب کے بعد بھی عمر کی کوئی خوش کن امید عمر کا پاگل پن ہے۔ محض خوش فہمیوں کے سہارے کسی کی محبت کو پانا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ اور اب جب جذبات میں تبدیلی آئی تو سوچ کے زاویے بھی بدل گئے۔ اتنے دنوں تک خود پر بے حسی طاری کیے گرد و پیش سے بے نیاز رہنے کی، حقیقت سے دامن چھڑانے کی کوششیں کرنا ترک کیں تو بہت سی باتیں خود بخود ہی اس پر کھلتی چلی گئیں، چاہے جانا اور کسی کی تمام تر محبت کا محور و مرکز بننا کتنا خوب صورت، کتنا دلکش ہوتا ہے، یہ ہانیہ نے اب جانا تھا۔

آج عمر کو دیکھ کر اس کے قدم ——— اس کی جانب بڑھتے چلے گئے، وہ ٹیرس پر ریلنگ سے ٹیک لگائے کسی سوچ میں گم تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آمد بھی محسوس نہیں کی۔

"ہیلو۔۔۔ کیا ہو رہا ہے۔" ہانیہ نے قریب آکر کہا، وہ چونکا ضرور، لیکن اس کی طرف نگاہ نہیں کی۔

"انتظار۔"

"کس کا؟" وہ کچھ حیران ہوئی۔

"تم سے بہتر یہ اور کون جانے گا۔" وہ پھیکے سے مسکرایا۔

"لیکن میں نہیں جانتی۔" مسکراہٹ چھپاتی وہ انجان بنی۔

"میری [illegible] یہ آس و نراس میں ڈوبی شام [illegible] انتظار بھی ختم ہو جائے۔" ہانیہ بغور اسے دیکھے گئی۔

"امید اچھی چیز ہے عمر۔ لیکن تمہاری محبت اتنی کمزور تو ہرگز نہیں کہ اسے صرف خوش گمانیاں، امیدیں اور امکانات ہی ملیں۔"

"یہ بات تم کہہ رہی ہو۔" اس نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"میری یہ آس و نراس کی کیفیت تمہاری ہی تو عنایت کردہ ہے۔ محبت میں کسی کے ساتھ کا یقین۔ کسی کی چاہت بننے کا فخر نہیں ملتا تو نہ سہی۔ خوش گمانی اور خوش امیدی تو دل پال ہی سکتا ہے نا۔" جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے وہ اس پر اپنی گہری نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔

"بالکل پال سکتا ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔ اس وقت اندرونی طمانیت اور خوشی اس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ آنکھوں میں انوکھی سی چمک، عمر محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

"بہت خوش لگ رہی ہو۔"

"ہاں۔۔۔ وہ تو ہوں [illegible] کے تائید کی۔

"کسی [illegible] خواب کو دیکھنے کے بعد جب ایک خوب صورت حقیقت کا سامنا ہو تو خوشی تو ہوتی ہی ہے۔ [illegible] ایسی ہی خوشی کے گھیرے میں ہوں۔" اس نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، عمر جو محویت سے اسے دیکھ رہا تھا، چونک گیا۔

"تم نے ہی کہا تھا نا کہ میں ایسی نادانی نہ کروں، جس پر بعد میں مجھے پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے۔"

"مطلب۔" عمر کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

"مطلب یہ کہ۔۔۔ میں اپنی آئندہ زندگی میں کسی بھی قسم کا افسوس، کوئی بھی آزار نہیں چاہتی، میں چاہتی ہوں کہ تم چچی کے سامنے میرا نام لو۔ میں اپنی پوری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔" ہانیہ نے جتنے صاف جتنے واشگاف الفاظ میں اقرار کیا تھا۔ عمر آنکھوں میں حیرت کا ایک جہان لیے یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی خواہش کی تھی اس نے ہانیہ کے منہ سے یہ سب سننے کے لیے اور کتنا انتظار کیا تھا۔

"سچ کہہ رہی ہو۔" اس کے ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے عمر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"بالکل سچ۔" ہانیہ کے چہرے پر دھیمی مسکان آئی۔

"تعجب ہے میرے اتنے حوصلہ شکن جواب کے بعد بھی تم [illegible] یقین اور مان کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے تو مجھے [illegible] تھا کہ میں تمہارا یہ یقین توڑ دیتی [illegible] تمہارے پاس نہ آتی۔"

"[illegible] یہ ہانیہ۔ تم نے میرا یہ انتظار رائیگاں [illegible] جانے دیا۔" وہ دل سے مسکرایا تھا اور ہانیہ کے اندر تک اطمینان اترتا چلا گیا۔

ہانیہ نے یہ فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن اسے سدرہ سے اس کی شادی شدہ زندگی کی اصلیت پتا چلی تھی۔ اور تب ہی اسے یہ ادراک بھی ہوا اور اسی دن اس کا اس بات پہ یقین پختہ ہوا تھا کہ زندگی میں جو بھی چھوٹے چھوٹے دکھ، چھوٹی چھوٹی تکلیفیں ہوتی ہیں، وہ کسی بڑی مصیبت اور بڑے غم سے بچانے کے لیے ہوتی ہیں۔ اس نے عدیل سے محبت کی تھی، اس کے ساتھ کی خواہش کی تھی، کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا اس نے کہ وہ اسے ٹھکرا دے گا اور پھر اس طرح ٹھکرائے گا کہ وہ خود سے بھی نظریں ملاتے ہوئے جھجکے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا، اگر وہ عدیل کی زندگی میں شامل ہو جاتی تو اپنی محبت اور چاہت کے بدلے میں عدیل سے ملنے والے شکوک اور بدگمانیاں اسے توڑ کر رکھ دیتیں۔

وہ بے حد حساس لڑکی تھی، اس کے لیے اس کی عزت نفس ہر چیز سے بڑھ کر تھی، اس کی محبت سے بھی بڑھ کر اپنی ذات کے لیے عدیل کی بے اعتباری شاید ہانیہ سہہ نہیں پاتی۔ دکھ تو اسے عدیل کے ٹھکرائے جانے کا بھی ہوا تھا۔ وہ ہرٹ ہوئی تھی اور روئی بھی بہت تھی، لیکن یہ رونا زندگی بھر کے رونے سے بہتر تھا۔ اور تب ہی اسے یہ ادراک بھی ہوا تھا کہ اگر اس نے عمر جیسے سچے اور کھرے انسان کو ٹھکرا دیا تو زندگی میں کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ اسی لیے اس نے بروقت ایک صحیح فیصلہ کر کے دل کو مزید کسی پچھتاوے اور کسک سے بچا لیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ عمر کی محبت پر اور عمر کی سنگت میں اپنی زندگی کے خوب صورت ہونے پر۔

✲ ✲

نازیہ جمال

"تو پھر تم نے پیکنگ مکمل کر لی ہے نا؟" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے راحیلہ نے اس سے پوچھا۔
وہ ابھی ابھی جاگنگ سے لوٹی تھی۔ مسلسل دوڑنے سے سانس پھولا ہوا جبکہ چہرہ پسینے سے تر تر سرخ ہو رہا تھا۔

"آئی تھنک مما! میں نے کلیئر کر دیا تھا کہ میں سلطان پور نہیں جا رہی۔" تاول سے چہرہ پونچھتے ہوئے اس نے خفگی سے بھرپور انداز میں ماں کو جتایا۔
"اور میں بھی تم پہ کلیئر کر دوں کہ عثمان کا آرڈر ہے چاچی جی کی عیادت کو تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔

ناولٹ

کیونکہ بطور خاص انہوں نے تمہیں یاد کیا ہے۔ اب اپنے پاپا کو انکار کر سکتی ہو تو بڑے شوق سے جانے سے انکار کرو۔" لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے انہوں نے سامنے گلاس ٹیبل پہ پڑا میگزین اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگیں۔
"اٹ از ناٹ فیئر مما! جب میں گاؤں نہیں جانا چاہتی تو بس نہیں جانا چاہتی پاپا مجھے کیوں مجبور کر رہے ہیں جب کہ وہ جانتے بھی ہیں کہ مجھے وہاں کا ماحول سوٹ نہیں کرتا۔ نہ وہاں کی گندی سندی عورتیں جاہل ماحول اور اس گرمی میں جب کہ اپنے ایئر کنڈیشنڈ روم سے باہر نکلنا ہی میرے لیے مشکل ہوتا ہے جائیکہ سلطان پور کی حبس بھری فضا میں ایک دو دن نہیں پورا ہفتہ گزاروں "نو" اٹس امپاسبل۔" اب وہ قطعی لہجے میں بولی۔

"میری جان! تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ گاؤں کے کھلے سرسبز و شاداب ماحول کی فضا بڑی جلدی راس آجاتی ہے۔ بچپن ہوتی تو تمہیں ویسے ہی کافی اٹریکٹ کرتی ہے بہت انجوائے کرو گی تم وہاں بلیوی اور دیکھو! سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھائی نور نے اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ پکا کر دیا ہے منگنی پہ بھی انہوں نے انوائیٹ کیا تھا۔ مگر تمہارے ایگزامز کی وجہ سے میں نے جانا ملتوی کر دیا تھا۔ مگر اب تو مبارکباد دینے لازمی جانا ہے اوپر سے چاچی جی کی تاکید کہ تمہیں تو ساتھ ضرور لانا ہے۔ کیونکہ اپنی پوتی کو دیکھے ہوئے انہیں کافی عرصہ گزر چکا ہے۔"
راحیلہ نے خفگی سے اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔
یہ کوئی اس دفعہ کی بات نہیں بلکہ وہ بچپن سے ہی گاؤں کے نام سے بدکتی تھی۔ گاؤں کا غیر تعلیم یافتہ ماحول بالخصوص جہاں لوگ صبح نور کے تڑکے اٹھتا اور شام ڈھلے سو جانا۔ اس کی روٹین لائف سے ... وہ دن چڑھے اٹھتی اور رات گئے تک اپنی فرینڈز سے موبائل پر چیٹنگ ... نیٹ پہ بزی رہتی۔ ... ساتھ لے جانے کا کہتے وہ کوئی نہ کوئی ... کر کے بسلوتی کر جایا کرتی تھی۔
"ہونہہ پوتی؟ کون سا میری سگی دادی ہیں جو مجھ سے ملنے کی اتنی ہڑک جاگ اٹھی ہے۔" ناک چڑھا کر وہ بے زاری سے بولی تو راحیلہ کو قدرے غصہ آگیا۔
"عروبہ! میرا نہیں خیال کہ مجھے کچھ ریپیٹ کرنے کی ضرورت ہے ہاں اگر تم بھول گئی ہو تو تمہیں بتانے

دیتی ہوں کہ چاچی حلیماں عثمان کی ماں نہ سہی بلکہ صرف چاچی ہوتے ہوئے بھی انہیں اپنے بچوں کی طرح شفقت و محبت سے پالا ہے تمہارے پاپا ابھی صرف دس سال ہی کے تھے کہ تمہارے اپنے دادی دادا راہی ملک عدم آباد ہو گئے یہ چاچی حلیماں ہی تھیں۔ جنہوں نے اس وقت عثمان کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا تھا۔ ان کا اپنا بیٹا نواز زمینوں کی دیکھ بھال میں لگ گیا جب کہ عثمان کو انہوں نے نا صرف شہر میں اعلا تعلیم دلوائی بلکہ جب عثمان نے

زمینوں ... سنبھالنے سے معذرت کرتے ہوئے یہیں شہر میں ... کاروبار ... کرنے کی اجازت طلب کی تو بڑی خوشی ... انہوں نے اجازت دے دی۔ ان کی بڑائی اور ... سے بڑا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے جب ... شادی کے لیے انہوں نے میرا انتخاب کیا تو بھی بسرو ... یہ فیصلہ انہوں نے قبول کر لیا۔ حالانکہ عثمان بچپن ہی سے چاچی حلیماں کی بھانجی سے انگیجڈ تھے یہاں یونیورسٹی میں نہ جانے انہیں مجھ میں کیا نظر

پاپا کو اپنے محسن و مربی بڑے چچا جی کے فیصلے سے سرتابی کر بیٹھے۔ اور آفرین ہے ان کی دریا دلی پہ عثمان کو نا صرف کھلے دل سے اپنی چاہ کے مطابق گھر بسانے کی رضامندی دی بلکہ مجھے بھی بغیر کسی عداوت و بغض کے حویلی میں کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہا۔ ہمیشہ چھوٹی بہو سا مان اور پیار دیا۔ کبھی نگہت بھابھی کے مقابلے میں مجھے غیر نہیں سمجھا۔ اور تم کہتی ہو کہ وہ ہمارے اپنے نہیں ہیں۔

مجھے بتاؤ پیار، محبت، اپنائیت، خلوص کے علاوہ اور کون سا پیمانہ ہے جو رشتوں کے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کراتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مما! پر آپ جانتی تو ہیں وہ لائف مجھے کتنی سخت ناپسند ہے۔" ماں کے اس طرح برافروختہ ہو جانے پر وہ جز بز ہو کر بولی۔

اسے کبھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس کی ایجوکیٹڈ، خوبصورت، وضع دار بول چال میں نزاکت اور رکھ رکھاؤ رکھنے والی مما کو اپنے سسرالی رشتہ داروں سے اتنا پیار کیوں تھا۔ عید ہو یا شب برات، خوشی غمی کا کوئی بھی موقع نکلتا فوراً" پاپا کو لے کر سلطان پور کی راہ لیتیں۔

وہ شکل و صورت میں بالکل اپنی ماں کا پرتو تھی۔ گوری شاداب رنگت، لمبا سرو سا قد، سلور گرے آنکھیں اور سیاہ چمکیلے بال اپنے بے تحاشا حسن، شاندار اکیڈمک ریکارڈ، بول چال میں نزاکت اکلوتی ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے حد درجہ لاڈ پیار نے کسی قدر اس کے مزاج کو شاہانہ پن عطا کر دیا تھا۔ اس لیے تو اسے اپنے بیک ورڈ دیہاتی رشتہ داروں سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ گاؤں اور رشتے داروں سے برگشتہ کرنے میں اس کی دوست سمرین کا زیادہ ہاتھ تھا۔ سمرین اس کی اکلوتی ویسٹ فرینڈ تھی جسے اس کے روایتی حدود و قیود کے پابند باپ نے تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی فیصل آباد کے ایک نواحی گاؤں میں اپنے کسی رشتے کے بھانجے سے بیاہ دیا تھا۔ صاف ستھرے مہذب اور تعلیم یافتہ شہری ماحول کی پروردہ سمرین گاؤں کے گھٹے گھٹے بند سے ماحول میں کملا کر رہ گئی تھی۔ پردے کی پابندی، گھر کے کام، ساس نندوں کی سازشیں اور فریب فطرت سے نمٹتے اس کے اعصاب دو سالوں میں ہی جواب دے گئے تھے اس پہ انڈر میٹرک شوہر کا شکی اور بہیمانہ رویہ حد سے سوا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پہ سمرین کو بلا تکلف سب گھر والوں کے سامنے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیتا تھا۔

وہ اس مرتبہ سمرین میکے آئی تو اس سے ملنے چلی گئی۔ جو سمرین اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی وہ اس کی اس بولڈ، شوخ اور ہمہ وقت آمادہ بہ شرارت رہنے والی دوست سے بہت مختلف تھی۔ جس کے ساتھ اس نے زندگی کے کئی سال بتائے تھے۔ یہ سمرین تو ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ کمزور چہرے پہ کھنڈی زردی اور اعتماد سے عاری ڈری سہمی ہوئی۔

"یہ دیہاتی کسی طور انسانیت کے جامے میں نہیں رہتے۔ ماں نہ بہن بیوی کسی رشتے کا پاس رکھنا نہیں آتا انہیں۔ خصوصاً" بیوی کو تو یہ پاؤں کی جوتی اور زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔ جس کا کام بس شوہر کی سیوا کرنے اس کے نفس کی پیاس بجھانے اور اس کا دل بہلانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کے ننگے بھوکے وحشی جذبے کسی بھی [illegible] شرافت سے ماورا ہوتے ہیں [illegible] ہوا ہو حکم بجا لانے والوں کی قطاریں ہوں تو ان جنگلی سوراؤں کے بھڑکتے کلیجے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔" سمرین اس کے گلے لگ کر [illegible] رو رہی تھی۔

"[illegible] شوہر نے بکری کا کھونٹا کھینچ کر [illegible] مجھے بے دردی سے مارا کہ میں نے ان کے جوتے صحیح طرح سے پالش نہیں کیے تھے۔" درد و اذیت سے لب کاٹتے ہوئے سمرین نے کمر سے قمیص اٹھائی تو وہ لرز کر رہ گئی پوری کمر نیلوں نیل تھی۔

"مائی گاڈ! اتنا ظلم اتنی بربریت تم اس درندے کو کورٹ میں گھسیٹ کر کیوں نہیں لے گئیں۔" غم و غصے سے اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔

"ہونہہ! کون لے جانے دیتا مجھے کورٹ میں باپ یا روایتوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ماں جن کے نزدیک بیٹی سے زیادہ خاندانی رشتے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔" سمرین پھیکے لہجے میں بولی۔

"بائی گاڈ! اگر میرے ساتھ اتنا برا ہوتا تو میں تو شوٹ کر دیتی۔ کوئی پتھر کا زمانہ ہے جو عورتوں کو اتنا ٹارچر کیا جاتا ہے۔" اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لاکھ سمجھانے، اکسانے کے باوجود سمرین اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر گاؤں چلی گئی کیونکہ اس کے شوہر نے علیحدگی کی صورت میں بچی اپنے پاس رکھنے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔

اپنی عزیز از جان دوست کی پر درد زندگی کا غم اس نے اس طرح دل پہ لے لیا کہ نا صرف دیہاتیوں بلکہ گاؤں کے نام سے ہی اسے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کے شعور میں یہ عقیدہ کچھ اس طرح راسخ ہو چکا تھا کہ دیہاتی مرد جاہل، گنوار اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ عورتیں ان کی محض رعایا میں شمار ہوتی ہیں۔ جن کے ذمے مرد کے ہمہ قسم آرام و آسائش کا خیال رکھنا اور صرف جی حضوری کرنا ہوتا ہے۔

اس لیے وہ ٹھان چکی تھی کہ ماما پاپا نے جتنا بھی زور لگایا وہ سلطان پور نہیں جائے گی ماں باپ کے پیار اور اعلا درجے کے انداز پرورش نے اسے حد درجہ پراعتماد اور نڈر بنا ڈالا تھا بھی تو وہ بے دھڑک جو جی میں آتا کہہ ڈالتی تھی۔ دادی و چاچی نگہت کے بے تحاشا پیار و محبت کے باوجود بھی وہ ان کے بارے میں اپنی ناگواری برملا جتا دیتی تھی۔ جس سے راحیلہ کو خاصی شرمندگی اٹھانا پڑتی تھی۔

پچھلے چند سال قبل چاچی نگہت اپنے بیٹے کے ہمراہ نظر چیک کروانے آئیں۔ تو ہمیشہ کی طرح ڈھیروں سوغات ہمراہ لائیں۔ جس میں اس کے لیے خوب صورت کڑھائی والا سوٹ بھی تھا۔ موتیوں اور ستاروں سے مزین بلیک جارجٹ کے سوٹ کو اس کی کزن آمنہ نے بڑی مہارت و صفائی سے کشیدہ کیا تھا۔ جسے اس نے ایک نظر دیکھنے کے بعد ناگواری سے یہ کہتے ہوئے ایک طرف ڈال دیا تھا کہ

"ایسے دیہاتی ٹائپ کپڑے میں نے کبھی نہیں پہنے۔ آپ یہ سوٹ واپس کر دو کیا۔ خیر میں شموں کو دے دوں گی۔ ایسے بھڑکیلے چمکیلے کپڑے بہت بھاتے ہیں۔"

نگہت کا تو منہ ہی اتر گیا تھا۔ وہ کتنے پیار اور چاہ سے لائی تھیں۔ آمنہ نے دادی کی بطور خاص ہدایت پر پورے تین ماہ اس پہ محنت کی تھی۔

عروب کی اس درجہ بدتمیزی اور بدلحاظی پہ راحیلہ کا جی چاہا ابھی سب کے سامنے اس کو جھاڑ دیں۔ اتنی شرمندگی ہوئی تھی کہ حد نہیں۔ البتہ ان کے چلے جانے کے بعد اس کو خوب لتاڑا تھا۔

"تم ہیو یور سیلف عروب! اب تم اتنی تم بچی نہیں کہ تمہیں رشتوں کی قدر و قیمت کا احساس دلایا جائے۔ کسی کے لائے ہوئے تحفے کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کتنی شرمندگی ہوئی ہے مجھے بھابھی نگہت اور ان کے بیٹے کے سامنے تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔"

"ماما! آپ بلاوجہ مجھ پہ شاؤٹ ہو رہی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ پاپا کی فیملی سے مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں سو پلیز آپ ان کے سامنے مجھ سے کسی قسم کے مینرز کی توقع نہ رکھا کریں۔"

راحیلہ کے غصے کا مطلق اثر نہ لیتے ہوئے وہ لاپروائی سے بولی۔ راحیلہ بس غصے کے گھونٹ بھر کر رہ گئیں۔ انہی کے لاڈ پیار نے تو یہ دن دکھائے تھے کہ وہ اس درجہ خود سر، ہٹ دھرم اور اپنی من مانی کرنے والی بن گئی تھی۔ خلاف مزاج کوئی بات گوارا کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ راحیلہ کے لیے بیٹی کا یہ روپ انتہائی پریشان کن تھا۔

"نواز بھائی کہہ رہے ہیں کہ آم کی فصل اتر رہی ہے۔ آپ آئیں اور اپنے باغات کے آم چکھ جائیں۔" اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر راحیلہ نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کا رخ موڑ دیا۔

"یہ آم ہم یہاں روز تو کھاتے ہیں۔ اس کے لیے سلطان پور جانا لازمی ہے۔" رسٹ بینڈ اتارتے ہوئے

بولا۔

"ٹھہرے اپنی دلہنوں کے پچھلی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اور ریلیے تم کھاؤ گی تو مان جاؤ گی۔"

وہ مسلسل اسے لائن پہ لانے میں لگی ہوئی تھیں۔

"آمنہ کی منگنی تو ہو گئی ہے۔ انکل نواز نے اپنے بیٹے کو بھی کہیں انگیج کیا ہے۔" ملازمہ اس کا ناشتا لے آئی تھی۔ گلاس میں جوس انڈیلتے ہوئے اس نے یونہی پوچھ لیا اس کی بات سن کر راحیلہ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

ڈھیلے ڈھالے اورنج کاٹن کے شارٹ ٹراوزر پہ وائٹ ٹی شرٹ پہنے کندھوں تک آتے سلکی بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے، پسینے کی وجہ سے کئی بال اس کی گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے وہ جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ٹراوزر ٹخنوں سے کافی اوپر چڑھ گیا تھا گداز سفید پنڈلیاں واضح نظر آنے لگی تھیں۔

مزاج کی تیز و تند ہونے کے باوجود بھی اس کے خوب صورت چہرے پہ ہمہ وقت ایک ملاحت اور معصومیت سی چھائی رہتی تھی۔ کتنے تو متمول گھرانے اس کے خواستگار تھے۔ کسی کو بھی کوئی امید دلانے سے قبل راحیلہ مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھیں۔

اور اب انہیں لگ رہا تھا کہ مناسب وقت لمحہ موجود سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ماسٹرز اس کا کمپلیٹ ہونے والا تھا۔ عثمان اس کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس کے ہاتھ پیلے کرنے کا عندیہ بہت پہلے دے چکے تھے۔

"نہیں انگیج تو کہیں نہیں کیا مگر چند برسوں پہلے تمہارے پاپا سے چاچی حلیماں نے بات ضرور کی تھی۔"

صاحب زادی کے آتش فشاں موڈ کو مد نظر رکھتے ہوئے راحیلہ نے کافی سوچ بچار کے بعد بات کی تمہید باندھی۔

"کیا مطلب؟ پاپا سے کیوں بات کی تھی۔" وہ ایک دم چونک پڑی تھی۔

"یہی کہ ان کی شدید ترین خواہش ہے کہ وہ اور نواز آپس میں چچا زاد کم بھائی زیادہ ہیں، یہ بھی اکلوتے اور وہ بھی اکلوتے دونوں کے بیچ محبت و لگاؤ کو دیکھتے ہوئے چاچی جی نے بھائی نواز کے بیٹے کے لیے تمہارا پرپوزل عثمان کے سامنے رکھا تھا۔ خدا نے ہمیں تو نرینہ اولاد سے محروم رکھا ہے۔ ورنہ ہم ہی آمنہ کو اپنی بہو بنا لیتے بہرحال ایک راستہ تو ہے کہ تمہیں نواز بھائی کی بہو۔"

"مما! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" وہ ان کی بات کاٹ کر چیخ پڑی۔ راحیلہ کی بات اس کے حواسوں پہ بم بن کر پھٹی تھی۔

"تو نیور" انہوں نے سوچا بھی کیسے کہ میں وہاں اسٹوپڈ قسم کے لوگوں کے ساتھ اپنی ساری زندگی بتا دوں گی۔" غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ریلیکس مائی جان! ٹیک اٹ ایزی، اتنا اپ سیٹ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" راحیلہ اس سے اسی ردعمل کی توقع کر رہی تھیں بھی پیار سے پچکارتے ہوئے کندھے سے تھام کر دوبارہ صوفے پہ بٹھا کر خود بھی اس کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔

"اپ سیٹ نہ ہوں۔ یہ میری زندگی کا مسئلہ ہے۔ اور پاپا کو دیکھیں ابھی وقت انکار کر دیں۔ میں حسن کے ساتھ دو پل بتانا گوارا نہ کروں ان کے ساتھ ساری زندگی گزارنا۔ اف! اے اے غصے سے تنفس تیز اور چہرہ ایک دم لال بھبھوکا ہو گیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے تمہاری طبیعت سے میں سخت عاجز ہوں۔ ابھی کوئی بات طے تھوڑی ہوئی ہے کہ تم یوں فیل مچا رہی ہو۔ چاچی نے صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے ورنہ ہو گا تو وہی جو ہم چاہیں گے۔ اور ہم کوئی ٹیپیکل کنزرویٹو والدین نہیں ہیں کہ اولاد کی خواہش دریافت کیے بغیر اپنے فیصلے ان پہ مسلط کر دیں۔ ڈونٹ وری۔ تم یہ خیال مت لاؤ کہ تمہاری خواہش کے برعکس کچھ ایسا ویسا ہو گا۔"

اسے پرسکون کرنے کے لیے راحیلہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی و محبت سے دباتے ہوئے کہنے لگیں۔

چند برسوں قبل چاچی حلیماں نے درخواست کے پردے میں اپنی خواہش ان کے سامنے رکھی تھی۔

"دیکھو بچے اب ہم عمر کی اس اسٹیج پر ہیں جب انسان حکم دیتے۔ فرمان جاری کرنے کے بجائے درخواست گزاری اور التجاؤں پہ اتر آتا ہے سو میں بھی تم سے درخواست کر سکتی ہوں کہ خاندان کی یک جہتی اور رشتوں کو دوامیت کا حسن بخشنے کی خاطر تم دونوں بھائی اپنے بچوں کے ٹوک جوڑ لو۔" چاچی حلیماں عاجزی و لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

"ارے اماں آپ حکم کریں۔ مجال ہے جو آپ کے حکم سے سرتابی کر جاؤں۔ آپ کا ہر فیصلہ مجھے بسرو چشم قبول ہے۔ عروب کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے کرنے کی آپ کلی طور پر مجاز ہیں۔" عثمان احمد نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے انتہائی مودبانہ انداز میں ان کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا۔

راحیلہ پہ بھی یہ بات واضح کر دی تھی کہ بھائی نواز کے گھر کے ہوتے ہوئے انہیں کسی کو کوئی آس امید دلانے کی ضرورت نہیں۔ ان کا بھتیجا ہی ان کی بیک بون بنے گا۔

وہ تو عجب مشکل میں آن پڑی تھیں۔ ادھر بیٹی کی خود سری ہولائے دے رہی تھی اور ادھر شوہر کے دوٹوک اور قطعی انداز نے انہیں کافی بے سکون کر ڈالا تھا وہ جانتی تھیں عروب کو اس رشتے پر راضی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اور عثمان بھی اپنے فیصلے سے انچ بھر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"ایسا کرتے ہیں چاچی سے ملنے اور آم کھانے کے بہانے تم ہفتہ بھر حویلی میں رہ لینا۔ وہاں کا ماحول رہن سہن ایٹی ٹیوڈ کچھ بھی پسند نہ آئے تو بے شک عثمان کے سامنے انکار کر دینا۔ تمہیں میری مکمل سپورٹ حاصل رہے گی۔ ورنہ کسی معقول ریزن کے بغیر تم نے اپنا جواب [illegible] والا اپور گریڈ والا راگ الاپا تو ایم سوری مجھے نہیں لگتا کہ میں عثمان کو تمہارے حق میں قائل کر پاؤں گی۔"

راحیلہ کی بات سن کر ایک لمحے کو اس نے ان کا چہرہ دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوکے میں آپ کے ساتھ سلطان پور چلنے کو تیار ہوں۔"

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا مما! از ایوری تھنگ آل رائٹ؟ آپ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی ہیں۔" وہ طوبا "گرہا" پیکنگ کر کے بیٹھی ہی تھی کہ راحیلہ افتاں و خیزاں اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ ابھی تمہاری نمی آنٹی کا فون آیا ہے۔ خالد کا بہت سیریس ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ نمی کی حالت سخت خراب ہے؟" راحیلہ پریشانی سے بولیں۔

"اوہ سو سیڈ۔" افسوس سے اس نے سر ہلایا۔

تمکین راحیلہ کی چھوٹی بہن تھیں۔ جو اسلام آباد میں مقیم تھیں۔ خالد نا صرف ان کے بہنوئی بلکہ ماموں زاد بھائی بھی تھے جن کے حادثے کی اطلاع ملی تھی۔

"مجھے ابھی اسلام آباد کے لیے فلائی کرنا ہو گا۔ اللہ خالد کو اپنی حفظ و امان میں رکھے نمی کی تو میاں میں جان ہے۔ پتا نہیں بچوں کا کیا حال ہو گا۔" راحیلہ کو رہ رہ کر بہن کا خیال آ رہا تھا۔

"راحیلہ! میں نے آج کی فلائٹ میں سے ایک سیٹ بک کرانے کی کوشش کی ہے مگر ویری سوری کہ کوئی سیٹ خالی نہیں ملی۔" عثمان نے انہیں آکر بتایا اور ان کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی۔

"عثمان! اب کیا ہو گا۔ میرا آج اسلام آباد پہنچنا لازمی ہے۔ نمی کل سے مسلسل بے ہوش ہے۔ ایسی حالت میں مجھے اس کے پاس ہونا چاہیے۔" پریشانی و اضطراب سے وہ اٹھ کر ٹہلنے لگیں۔

"ڈونٹ وری۔ تم قدرہ کے ساتھ چلی جاؤ۔ میرے پاس اپنی گاڑی ہے نا۔" عثمان نے تسلی آمیز لہجے میں مسئلے کا حل نکالا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر عروب سلطان پور کیسے جائے گی۔" اپنی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد انہیں ایک نئی فکر نے آستایا۔

"ارے بھئی! عروب کے بارے میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قادرین لاہور آیا ہوا ہے۔ اپنی زمینوں کے لیے کچھ مشینری اور کھاد وغیرہ خریدنی تھیں اسے آج واپسی ہے اس کی عروب اس کے ساتھ چلی جائے۔ میرا بھتیجا ہے۔ فل پروٹیکشن دے گا اسے۔" عثمان تو جیسے سب کچھ طے کیے ہوئے تھے۔

وہ جو ماں کی اسلام آباد روانگی کا سن کر قدرے مطمئن ہوئی تھی کہ چلو سلطان پور کے ان چاہے سفر سے تو وقتی جان چھوٹی مگر عثمان کے پلان نے اس کی لمحہ بھر کی خوش فہمی کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق راحیلہ ڈرائیور کے ساتھ عازم اسلام آباد ہوئیں۔

"او کے جان! ٹیک کیئر اور سیلف جیسے ہی خالد کے بارے میں تسلی بخش خبر ملی۔ میں فوراً" سلطان پور آجاؤں گی۔" اس کے پھولے ہوئے چہرے پہ الوداعی بوسہ دیتے ہوئے راحیلہ نے اسے تسلی دی تھی۔

"او بیٹے! قادرین تمہارا ویٹ کر رہا ہے۔ جانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ اماں تمہیں دیکھ کر کتنی خوش ہوں گی۔ بہت لونگ اور کیئرنگ ہیں سب دیکھنا تم بالکل ہوم سک نیس فیل نہیں کرو۔ گی؟" عثمان کی باتوں کو خاموشی سے سنتی ان کی معیت میں چلتی پورچ کی طرف چلی آئی جہاں قادرین نواز اپنی پجارو کی ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

الوداعی 'دعائیہ کلمات اور بیٹی کی حفاظت و آرام کے حوالے سے ڈھیروں ڈھیر ہدایات پہنچانے کے بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ عروب پہلے ہی براجمان ہو چکی تھی۔ ساون لگتے ہی گرمی کا زور کسی قدر ٹوٹ گیا تھا۔ روز شام کو آسمان سفید و سرمئی بادلوں سے ڈھک جاتا۔ کبھی یہ بادل ٹوٹ کر برستے ہوئے قطرات ارضی کا تن من بھگو ڈالتے تو کبھی ان کی خود پہ جمی ترسی و منتظر نظروں سے محظوظ ہوتے چھٹ جاتے۔

آج بھی صبح سے آسمان پہ بادلوں کی چھدری سی چادر تنی ہوئی تھی۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ گھٹاؤں کی صورت اختیار کر لی تھی۔

موسم کے خطرناک ہوتے تیوروں سے دل ہی دل میں سہمتے ہوئے اس نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔

وہ ہونٹ بھینچے اس کے وجود سے قطعی بے نیاز پتھریلے تاثرات میں لپٹے چہرے کے ساتھ پورا دھیان ڈرائیونگ پہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ انہیں گھر سے نکلے تقریباً" دو گھنٹے ہونے کو تھے مگر اس سارے عرصے میں اسے مخاطب کرنا تو دور کی بات ایک نگاہ غلط تک نہیں ڈالی تھی۔ جو عروب کے لیے خاصے اچنبھے کی بات تھی۔

پہلو میں نازک دلفریب سراپے کی مالک توبہ شکن پری وش براجمان ہو اور بھوکے نفس کے پجاری دیہاتی پہ ذرا برابر بھی اثر نہ پڑے۔ عروب نے اس کی اس درجہ سرد لاتعلقی کو اس کے احساس کمتری پہ محمول کیا تھا۔ جو ہر ان پڑھ 'جاہل دیہاتی کو [illegible] کسی تعلیم یافتہ اور شہر کے پالشڈ فرد [illegible] حاوی ہو جاتا ہے۔

بادل یوں زور سے گرجے کہ آسمان کا منہ ہی کھل گیا۔ چھما چھم موسلا دھار برسنے لگا۔ سڑک کے اطراف میں درختوں کی شاخیں تیز طوفانی جھکڑوں کی زد میں [illegible] ہونے کے بعد دوبارہ ہی لمحے مخالف سمت وار کرنے والے طوفانی تھپیڑوں سے نبرد آزما ہونے کو ایک لمحے کو پھر تن جاتے اور اگلی ساعت بے بسی و بے اختیاری کی انتہائی حالت میں دوبارہ "خود سپردگی" پر مجبور ہو جاتے۔

ساون کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ جان جاتی تھی اس کی ایسے طوفانی بارشی موسم سے۔ جب بھی آسمان پہ گھٹاؤں کو اٹھتا دیکھتی۔ فوراً" اپنے بیڈ روم

کی ساری ونڈوز بند کر کے "قلعہ بند" ہو کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس پہ مستزاد بجلی کے کڑاکے اور بادلوں کی گھن گرج اسے لگتا کہ کسی لمحے اس کی روح کو اس کے جسم سے باہر کھینچ لیں گے۔

اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ ایسا خطرناک موسم اور وہ بھی سخت ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ گھر سے دور اکیلی ویران سڑک پر گزارے گی۔ گاڑی میں چھائے ہولناک سناٹے نے [illegible] ماحول کی حد درجہ طوفان خیزی 'دل میں اٹھ آنے والے شدید پرخوف ہراساں کر دینے والے اندیشوں نے اسے مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ابھی کتنا [illegible] موسم اس قدر خراب ہو رہا ہے۔ اس [illegible] لیے اتنا مشکل راستہ کیسے طے ہو گا؟"

"موسم کی قدرتی و لمحہ بھر کی تبدیلی اگر اتنی ہی نازک طبیعت پہ گراں گزر رہی ہے تو گھر میں ہی تشریف رکھتیں۔ گاؤں کا قصد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" حد درجہ خشک و کھردرے لب و لہجے میں جواب آیا تھا۔

احساس توہین سے لمحہ بھر کو سن سی بیٹھی رہ گئی۔ اس نے جیسے پتھر کھینچ مارے تھے۔ کیا اعلا درجے کی بے مہری اور بے گانگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔

خون کے گھونٹ پی کر ایک جھلستی سی نگاہ اس پہ ڈالی۔ مضبوط سانولے مردانہ ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل سے نبرد آزما تھے۔ اس کی مغرور کھڑی ناک کے نیچے بالائی لب پہ آویزاں اس کی گھنی مونچھوں پہ نظر پڑتے ہی اس کے حاکمانہ مزاج اور سخت دلی کا احساس اس کے دل میں جاں گزیں ہوا تھا۔

"سمرین ٹھیک کہتی ہے۔ یہ دیہاتی لوگ سرے سے جنگلی 'وحشی اور بد تہذیب ہوتے ہیں۔" اپنے اندر کے کھولاؤ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے وہ اپنا دھیان بٹانے کی خاطر سمرین کی باتیں ذہن میں دہرانے لگی۔

"مما کہتی ہیں اس لکڑ پتھر بے حس انسان سے شادی سے انکار کرنے کے لیے مجھے پاپا کو کوئی سولڈ ریزن بتانا ہو گا۔

یہ [illegible] ہے کہ اسے بات کرنے کی تمیز [illegible] چھو کر نہیں گزری۔ ایسے [illegible] اور نفسی کے مارے ان پڑھ سے شادی۔ [illegible]" وہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ کر پرسکون ہو گئی

وہ لاہور کی حدود سے نکل آئے تھے۔ تیز بر فیلا اور شوریدہ سری پہ آمادہ غضب ناک موسم کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ تیز چمکیلی دھوپ میں پجارو تیزی سے منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ راستہ کچا اور دونوں اطراف میں سرسبز کھیت کھلیان اور ثمر بار درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے وہ کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے مناظر کو وہ بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

گاڑی کچے راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی شاہ خاور دن بھر کا سفر طے کرنے کے بعد مغرب کی گود میں سر رکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔

کسان 'ہاری اپنے ڈھور ڈنگروں کو ہنکاتے ہوئے اپنے بسیروں کو لوٹ رہے تھے۔ لڑکپن کی حدود میں قدم رکھتا ایک لڑکا سائیکل پہ سوار پیچھے کیریر پہ چارے کا گٹھا لادے جب ان کی گاڑی کے پاس سے گزرا تو ایک استعجاب بھری نظر اس پہ ڈالی۔ اس کے جی میں کیا آئی کہ ترنگ میں آکر لڑکے کو آنکھ ماری۔ وہ بے چارہ یوں بوکھلایا کہ سائیکل مارے گھبراہٹ کے ادھر ادھر لہرانے لگی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی جبکہ قادرین نے بے باکی کے اس مظاہرے پر ایک سخت ناگواری سے بھرپور نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ گاڑی لکڑی کے بہت بڑے منقش دروازے کے عین سامنے جا کر رک گئی تھی۔ پجارو کی آمد سے سرخ اینٹوں سے بنے وسیع و عریض مکان میں ہلچل مچ گئی تھی سامنے دادو کھڑی تھیں۔ بے حد کمزور اور بیمار اس کے باوجود اس کے استقبال کو دروازے پہ کھڑی تھیں۔ اس کے سلام کے جواب میں وہ کتنی دیر تک اسے خود سے لگائے کھڑی رہیں۔ اسے بوڑھے لوگوں کی قربت سے عجیب بے زاری و کوفت ہوتی تھی۔ انہیں کمپنی دینا

اسے ہمیشہ جھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا مگر جب دادا، دادو کے شفیق سینے سے لگی تو نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا تھا۔ ان کے قرب میں عجیب طرح کے تحفظ اور پناہ کا احساس ہو رہا تھا۔

آنٹی نگہت، انکل نواز اور آمنہ سب باری باری اس کو گلے لگا کر محبت و اپنائیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور بڑے اشتیاق اور چاہت سے عثمان اور راحیلہ کا حال چال دریافت کرنے لگے۔

"عروب! بچی تم تھک گئی ہوگی۔ اب آرام کرو۔" دادی نے طویل سفر اور ناہموار راستوں پہ گاڑی کے ہچکولے کھانے کی وجہ سے اس کا جو انجر پنجر ہلا تھا اس سے چہرے پہ اضمحلال اور آنکھوں کی تھکان کو بھانپتے ہوئے آرام کا مشورہ دیا۔

وسیع و عریض کچے صحن کے وسط میں بان کی چارپائیاں بچھی تھیں۔

پوری تاریخوں کا چاند ماحول کو اجلی دودھیا روشنی بخش رہا تھا۔

"کیا ہوا تم سو کیوں نہیں رہیں۔؟" آمنہ نے اسے یونہی پاؤں لٹکائے بیٹھے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

"ایکچوئلی! میں صحن میں سونے کی عادی نہیں ہوں۔ ہم سب اپنے اپنے بیڈ رومز میں آرام کرتے ہیں۔ یوں سب کے ساتھ ایک جگہ پر سوتے ہوئے میں ایزی فیل نہیں کر سکوں گی۔"

چارپائیوں کی لمبی قطار کو دیکھتے ہوئے اس نے بلا جھجک اپنا مسئلہ بتایا۔ وہ واقعی یوں کھلے ماحول میں سونے کی عادی نہیں تھی۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ آؤ میں تمہارا بستر اندر لگا دیتی ہوں۔" آمنہ اٹھتے ہوئے بولی تو وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

"یہ کچا کمرہ قادرین بھائی نے بطور خاص گرمیوں کے لیے بنوایا ہے۔ دن ہم یہاں گزارتے ہیں۔ مٹی کے فرش پر چھڑکاؤ کے بعد جو سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی ہے۔ مانو گرمی سے جلتے اعصاب کو سکون سا مل جاتا ہے۔" چارپائی پہ کھجور کے رنگین پتوں کی چٹائی بچھاتے ہوئے آمنہ نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا تو وہ کچھ کہنے کی بجائے گھوم پھر کر کمرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔

کمرہ کافی سے زیادہ وسیع تھا۔ کچی دیواروں پر سفید چکنی مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ کم پاور کے زرد بلب کی روشنی میں کمرے کی دیواروں سے لے کر ہر چیز خیالی زرد دکھائی دے رہی تھی۔ اندر سونے کی بات کرتے ہوئے اس نے اکیلے سونے پر بھی زور دیا تھا تبھی آمنہ اس کا بستر سیٹ کرنے کے بعد باہر صحن میں چلی گئی۔

گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی مگر اے سی کی خنکی کے عادی اس کے اعصاب کو زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

"توبہ یہ لوگ اتنی گرمی میں کیسے رہ رہے ہیں۔ مجھے تو فلی ایئر کنڈیشنڈ گھر سے نکل کر ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ پاکستان میں موسم اتنا گرم اور سخت بھی ہوتا ہے۔" چارپائی پہ چت لیٹے ہوئے ہوا سے زیادہ شور پیدا کرتے سیلنگ فین پہ نظریں جمائے اس نے حیرت سے سوچا۔

اجنبی جگہ اور پرائے بستر پر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ شومئی قسمت تھوڑی دیر بعد بجلی چلی گئی۔ [illegible] آکر وہ اٹھ کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔

گھر کے تمام نفوس گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے گرمی اور گھٹن کم کرنے کی خاطر کھڑکی بھی کھول دی۔ دوسری جانب مویشیوں کا باڑا تھا۔ گائیں بھینسوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں رات کے پرسکوت ماحول میں جلترنگ بجا رہی تھیں۔

کھڑکی کھلنے سے گھٹن کا دباؤ تو قدرے کم ہوا تھا مگر گوبر کی بدبو کا ایک زوردار ریلا بھی کمرے میں در آیا تھا۔

"اف ماما پاپا! کس عذاب میں جھونک دیا ہے مجھے اس تعفن سے تو میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔" ناگواری سے ناک دباتی وہ دل ہی دل میں ممی پاپا سے شکوہ کرنے لگی۔ اچھا خاصا ٹائم گزرنے پر بھی بجلی نہ آئی۔ لیکن سارے دن کے بے آرام سفر کی تھکاوٹ نیند کو بہلا پھسلا کر اس کی آنکھوں میں لے ہی آئی تھی۔

✿ ✿ ✿

"یہ کیا اتنا ہیوی ناشتا؟ میں تو کافی لائٹ ناشتا لیتی ہوں۔" اگلے دن وہ اپنے معمول کے مطابق دن کے گیارہ بجے بھرپور نیند لے کر بیدار ہوئی تو غسل کرنے کے بعد برآمدے میں چٹائی پہ اپنی خاطر ناشتے کے لوازمات کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دیسی گھی میں تر بتر پراٹھے۔ انڈوں کا حلوہ، بھنا ہوا مغز، لسی، چائے اور نجانے کیا کیا۔

"اوہ! مجھے تم سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔" آمنہ کسی قدر شرمندگی سے بولی۔

"اصل میں ہمارے ہاں مرغ کی پہلی بانگ سے ہی ناشتے کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ تم اس وقت سو رہی تھیں۔ اس لیے اپنی سمجھ سے میں نے کئی چیزیں بنا دیں۔ خیر تم بتاؤ میں وہی ناشتا بنا دیتی ہوں۔" آمنہ نے سادگی سے پوچھا۔

"تم نے خواہ مخواہ اتنی تکلیف کی۔ میں تو عموماً جوس، دودھ یا کبھی کبھار پورج لے لیتی ہوں۔" وہ تکلفات نبھانے کا تردد بہت کم کیا کرتی تھی۔ مگر اپنی یہ سادہ و دوستانہ مزاج کی کزن اتنی پسند آئی کہ اسے اپنے لیے مزید زحمت دینا گوارا نہ کیا۔

"ہمارے گھر میں سب کی پسند کا ناشتا بنتا ہے۔ جیسے اماں اور ابا سادہ روٹی کے ساتھ سالن اور لسی، دادی دہی کے ساتھ پھلکے جب کہ قادرین بھائی صرف دہی کی میٹھی لسی لیتے ہیں۔"

تیز دھوپ پورے آنگن میں پھیلی ہوئی تھی۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ موٹے پائے والی پیڑھی پہ دادی بھنڈیوں کے ڈھیر کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں کاٹ رہی تھیں۔ چاچی نگہت گوبر کے اپلے تھاپنے اور ساتھ ساتھ دو تین دن پہلے تھپے سوکھے اپلوں کو دن بھر کے بالن کے لیے تھال میں ڈالتی جا رہی تھیں۔

"یہ دودھ پی لو۔ ویسے بھی تھوڑی دیر بعد دوپہر کا دسترخوان لگنے والا ہے۔" آمنہ جھٹ پٹ کچن سے اس کے لیے ایک بڑا سا سٹیل کا گلاس دودھ سے لبالب بھر کر لے آئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔

"آمنہ! ذرا ادھر آؤ، نلکا تو چلاؤ۔" قادرین نے آمنہ کو آواز دے کر بلایا۔ وہ ابھی ابھی جانوروں کا چارہ تیار کر کے آیا تھا۔ قمیص کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائے دونوں بازوؤں پر بھوسہ اور چوکر لگے ہوئے تھے۔

آمنہ تیزی سے ہینڈ پمپ چلانے لگی۔ زیر زمین تازہ پانی کی ایک موٹی دھار بہنے لگی جس سے اس نے بازو اچھی طرح دھونے کے بعد ایک چھپا کا منہ پہ بھی مارا۔

"بھائی! دادی کہہ رہی ہیں عروب کو آموں کے باغ کی سیر کرا لائیں۔" تار سے تولیہ اتار کر اسے دیتے ہوئے آمنہ بولی یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ جب بھی اس سیزن میں عثمان اور راحیلہ گاؤں کا چکر لگاتے باغ ضرور دیکھنے جاتے تھے۔ اس بار وہ نہ سہی عروب تو آئی تھی۔ چنانچہ اس کی سیر بھی لازمی بنتی تھی۔

"تو ٹھیک ہے ان محترمہ کو کوئی ڈھنگ کا جوڑا پہنا دو۔ پھر میں چلنے کی کرتا ہوں۔" تولیہ چارپائی پہ ڈالتے ہوئے بھرپور سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جانے کی مشروط ہامی بھری تھی۔

"ڈھنگ کے کپڑے؟ واٹ ڈو یو مین۔ میرے ڈریس میں آپ کو کون سی بے ہودگی نظر آگئی ہے۔" اپنی ذات پر انگشت نمائی تو کبھی وہ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی کجا کہ اس کے منہ سے' مارے غصے کے اس کا خون کھول اٹھا تبھی تیز لہجے میں بولی۔

"اس گلے میں ڈالی دھجی میں آپ کو باہر بے پردہ لے جانا ہماری خاندانی روایات اور دینی احکام کی سراسر منافی کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے گاؤں کی سب عورتیں، بچیاں مکمل باپردہ اور ستر کا اہتمام کرتی ہیں۔ آمنہ اور اماں کو دیکھ کر تو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا۔" وہ اپنے مخصوص سرد انداز میں گویا ہوا۔

"ارے بھائی! صرف دوپٹے کا ہی تو مسئلہ ہے۔ وہ

میں اپنا اوڑھا رہی ہوں۔ بس آپ چلنے کی کریں۔"
آمنہ خاصی پرجوش ہو رہی تھی۔

"ان سے بھی پوچھ لو شاید دو گز دوپٹے کا اتنی گرمی میں اوڑھنا محال ہو جائے ان کے لیے۔" بھرپور استہزائیہ نظریں اس پہ جماتے طنز کا تیر اچھالا۔

وہ ایسا نہیں تھا صرف اس سے بات کرتے ہوئے زبان خود بخود طنز اگلنے لگتی تھی۔ چہرے پہ سخت چڑچڑے تاثرات اور سیاہ آنکھوں میں حد درجہ بے زاری کے آثار جھلکنے لگتے تھے۔ روشن کشادہ پیشانی ان گنت شکنوں سے اٹتی چلی جاتی۔

اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب ماں کو ڈاکٹر سے دکھانے کے بعد وہ چاچا عثمان کے گھر گئے تھے۔ نائٹ جینز پہ بیگی شرٹ پہنے عروب عثمان نے جب اس کی بہن کے انتہائی محنت اور چاؤ سے تیار کردہ سوٹ کو ناپسندیدگی سے لپیٹ کر دوسرے صوفے پر اچھال دیا تھا۔ ماں کے شرمندہ اور چاچی راحیلہ کے خفت زدہ چہرے دیکھ کر اس کا دل چاہا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اس مغرور بدتمیز لڑکی کے گلابیاں چھلکاتے رخسار پر دے مارے جسے کسی کے محبت بھرے جذبات کی قدر تو دور کی بات گھر آئے مہمانوں بلکہ باپ کی بھابھی اور بھتیجے سے بھی ڈھنگ سے بات کرنے کی تمیز نہ تھی۔ اگر ماں اور چاچی کا خیال نہ ہوتا تو وہ اسی وقت اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔ اسے دیکھ کر اس کی سرمئی آنکھوں میں تحقیر اور شگفتہ لبوں پہ جو تمسخرانہ مسکراہٹ مچلنے لگتی تھی۔ اس سے قادرین کا دل چاہتا کہ کاش وہ اس لڑکی کا غرور پاش پاش کر سکتا جسے اپنے سوا سارے انسان کیڑے مکوڑے دکھائی دیتے تھے۔

"مائی فٹ! دو گز کا تنبو لپیٹ کر اور وہ بھی ان جیسے بد دماغ انسان کے ساتھ تفریح کے نام پر خود کو سزا دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ کل کا سفر تو ان کے ہمراہ میرے لیے suffer ثابت ہوا تھا۔" ادھار رکھنے کی وہ بھی قائل نہیں تھی سو جواباً چاچا کے بیٹے پہ خوب بھڑاس نکال لی۔

"میرے لیے تو یہ باعث [illegible] ہے۔" لاپروائی سے کندھے اچکاتا شاہانہ چال چلتے ہوئے وہ صحن کے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ ایک مخصوص بے نیازی اس کی چال سے ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے سارا زمانہ اس کی ٹھوکروں کی زد میں ہو۔

"ہونہہ! جاہل گنوار میرے منہ پر میری ہی برائیاں۔ سمجھتا کیا ہے خود کو اکڑو کہیں کا۔" آمنہ کی موجودگی میں وہ دل ہی دل میں اسے خوب گالیوں سے نوازنے لگی۔ کاٹن کے نائٹ ٹراؤزر پہ پلین بلیک چکن کا کرتہ پہنے جس کے کالر اور فرنٹ پر خوب صورت کڑھائی کی ہوئی تھی۔ گلے میں ہلکا سا اسکارف تھا راحیلہ کی بطور خاص تاکید پر اس نے معمول کے کپڑے بیگ میں رکھنے سے گریز کیا تھا۔ مگر اس پر بھی اتنا کھلا اعتراض اس کا دل چاہا کسی کو بتائے بغیر چپکے سے اپنے گھر کی راہ لے۔ مارے طیش کے اس کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ آمنہ سمجھ تو گئی تھی کہ اسے اپنے لباس پہ کی گئی تنقید بری لگی ہے تبھی وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

"اصل میں نا ہم گاؤں والوں کے دل جتنے کشادہ ہوتے ہیں سوچ اتنی ہی محدود رہتی ہے۔ اپنی بہن بیٹیوں کو کھلے منہ باہر دیکھنا ان کی غیرت پر تازیانے کا کام دیتا ہے۔ اور ویسے بھی پردہ عورت کو زمانے کے سرد گرم سے یوں محفوظ رکھتا ہے جیسے سیپ موتی کو۔ میں تمہیں مودودی صاحب کی کتاب "پردہ" گفٹ کروں گی۔ اسے پڑھ کر تمہیں بے پردگی کی ساری قباحتیں سمجھ میں آجائیں گی۔"

وہ بے دلی سے آمنہ کی باتیں خاموشی سے سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ آج ہی مما کو کال کر کے کہے گی [illegible] آنا ہے یا نہیں بس اسے قدیر کو بھیج کر بلوا لیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا یہاں پر۔

✿ ✿ ✿

"آنٹی! آپ مسلسل کام کرتے ہوئے تھکتی نہیں ہیں۔" عروب نے صبح سے نگہت کو کسی نہ کسی کام میں لگے دیکھا تو حیرانی سے پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"ارے تھکن کیسی؟ صحت ہے تو کام ہو رہا ہے۔" پرات میں کریلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر نمک چھڑک کر انہیں مسلتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

"آمنہ کافی میرا ہاتھ بٹا دیتی ہے۔ اس لیے کام جلدی نبٹ جاتے ہیں۔ ہاں البتہ اس کی شادی کے بعد مجھے مشکل ضرور ہوگی۔"

"چلیں شکر ہے اماں! آپ نے عروب کے سامنے میری کار گزاریوں کا اعتراف تو کیا ورنہ تو ہر وقت لٹھ لے میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں کہ یہ کرو وہ کرو۔ ایسا کیوں کیا؟"

نگہت کی بات پر آمنہ نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ وہ اس وقت [illegible] بیڈ شیٹ پہ کڑھائی کر رہی تھی۔ [illegible] کے دھاگے اس کے ارد گرد بکھرے تھے۔

"تو ٹھیک کرتی ہوں نا۔ کل کلاں سسرال میں الٹے سیدھے ہاتھ مارے تو حرف تو میری تربیت پر آئے گا نا۔" کریلوں کی کڑواہٹ اچھی طرح نکال کر اچھی طرح دھونے کے بعد پرات میں پھیلا کر رکھ دیے۔

"اویں خواہ مخواہ سسرال کا نام خراب ہے۔ دیکھیے گا کل کو بہو آئے گی پھر اس کے کاموں میں یوں کیڑے نکالیے گا۔ منہ پہ دس نہ سنائیں تو میرا نام آمنہ نہیں۔ یہ تو میں بے چاری ہوں جو آپ کی ہر کڑوی کسیلی چپ چاپ برداشت کر جاتی ہوں۔" آمنہ مصنوعی رقت سے بولی۔

"کٹ کھنی بلی! تم اور چپ چاپ برداشت کر جاؤ کس نے دیکھا۔ کس نے سنا۔" اسی دم قادرین نے صحن میں قدم رکھا اس نے آمنہ کا آخری جملہ سن لیا تھا تبھی ہلکی سی چھیڑ لیے اس پہ چوٹ کرتا تخت پہ دادی کے قریب براجمان ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں لائی کی تنگی شاخوں سے بنی ہوئی خوب صورت سی ٹوکری تھی۔ جو تازہ کھجوروں سے بھری ہوئی تھی۔

"آپ کی زوجہ محترمہ کی بات ہو رہی تھی کہ جن کے آنے سے میری قدر ہوگی۔ ورنہ تو اماں کی نظروں میں مجھ سے بڑھ کر کوئی پھوہڑ بد سلیقہ ہے ہی نہیں۔" فریج [illegible] آمنہ نے کھجوروں سے پلیٹ بھری اور عروب کے سامنے رکھ دی۔

"میری زوجہ؟ خیر اس کی موجودگی میں تمہاری قدر کا تو پتا نہیں البتہ نقص امن کا امکان ضرور ہے۔" ٹوکری میں سے دو تین کھجور کے دانے چن کر اکٹھے منہ میں ڈالتے ہوئے وہ مزے سے بولا۔

ان سب کی آپس کی نوک جھونک میں عروب کو اپنا آپ انتہائی مس فٹ لگا۔ "بھائی! آپ کا مطلب ہے کہ میں جھگڑالو اور بدتمیز ہوں۔ جو آپ کی بیوی سے لڑوں گی۔" آمنہ غصے سے چیخی۔

دادی اور نگہت مسکرانے لگیں۔

"میں نے تمہارا نام کب لیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہی جھگڑالو اور فساد برپا کرنے والی نکل آئے۔" فوراً بات بناتے ہوئے اس نے ایک سرسری سی نظر عروب پہ ڈالی جو پلیٹ میں پڑی کھجوروں کو انگلی سے چھانٹنے والے انداز میں ادھر سے ادھر کر رہی تھی۔ ایک دو دانے منہ میں ڈالنے کے بعد اس کا دل بھر گیا تھا۔ اتنا میٹھا پھل پہلے اس نے کھایا جو نہیں تھا۔

"ارے میں تو ایسی بہو لاؤں گی جو مجھے آمنہ کی کمی محسوس ہی نہیں ہونے دے گی۔ میں بھی اسے بیٹیوں جیسا پیار دوں گی۔ کام کاج میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔ مجھے سکھ آرام دے گی تو میں بھی اسے سیاہ سفید کی مالک بنا دوں گی۔" بہو کے حوالے سے نگہت کے اپنے ہی ارمان تھے۔

"بہو لائے گی مگر پسند تو میں کروں گی نا آخر اپنے بچوں کے بارے میں تو اس نے سارے فیصلے کرنے کے اختیار مجھے سونپے ہیں۔" دادی کے لہجے میں بیٹے کے لیے مان بول رہا تھا۔

"جی بالکل دادی۔" قادرین نے فوراً "سعادت مندی" سے سر ہلایا۔

"میرے قادرین کی دلہن کوئی اپلے تھاپنے جھاڑو لگانے اور چولہا چکی کرنے والی تھوڑی ہوگی۔ میں تو کوئی پڑھی لکھی خوب صورت اور اچھے ماحول کی لڑکی

لاؤں گی۔" اب وہ زمانے لد گئے جب لڑکی بگھار اچھا لگاتی تو ساس کو اپنا منظور نظر مل جاتا۔ میرے قادر کے ساتھ پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی شہری لڑکی ہی سجے گی بے شک بکی پہ بیٹھ کر کھائے۔" محبت بھرے لہجے میں بولتے ہوئے دادی کا مخاطب تو آمنہ تھی مگر نظریں اس پہ ٹکی تھیں۔

وہ کنفیوز ہو کر خواہ مخواہ کلائی میں پڑے بریسلٹ کو گھمانے لگی۔

"ارے دادی! یہ شہری پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی اور خوبصورت لڑکیاں بہت مغرور بد دماغ اور دوسروں کو پاؤں کی جوتی برابر نہیں سمجھتیں۔ ان کی خوب صورتی پہ نہ جائیں ہم دیہاتیوں کو تو یہ انسانوں کے دائرے سے خارج سمجھتی ہیں۔ جن کے پاس نہ احساسات ہوتے ہیں۔ نہ جذبات اور نہ ہی عزت نفس۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولا۔ عروب نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گہری نظریں جن میں استہزا اچھل رہا تھا۔ ہونٹوں پہ تمسخرانہ تبسم وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"کمینہ! مجھ پہ پوائنٹس مار رہا ہے۔ کسی پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی لڑکی کے قابل ہو بھی۔ کوئی ان پڑھ گاؤں کی جاہل گنوار ہی تمہارے لیے ٹھیک رہے گی۔" دل ہی دل میں دانت پیستے ہوئے ایک کھولتی نظر اس پہ ڈالی۔ وہ ہنوز اس کی نظروں کی گرفت میں تھی۔

"چلو چھوڑو یہ باتیں۔ دن ڈھل رہا ہے۔ اٹھو آمنہ کچھ ہانڈی روٹی کی کرو۔" گمبھیر گفتگو سمیٹنے کا عندیہ دیتے ہوئے پرات اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔ آمنہ نے چادر دھاگے سمیٹ کر شاپر میں ڈالے اور شاپر اٹھا کر اندر چلی گئی۔ قادرین بھی باڑے کی سمت چل دیا۔

سائے مغرب کی طرف لمبے ہوتے جا رہے تھے دم توڑتی دھوپ کی ملگجی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ تلاش رزق میں سرگرداں پنچھی [illegible] کے درختوں پہ بنے اپنے بسیروں [illegible] لگے تھے۔ ان کی چہکار نے ماحول میں ایک خوب صورت ترنم بکھیر دیا تھا۔

"عروب چڑا! میں نے عثمان سے تیرے اور قادرین کے رشتے کی بات کی تھی۔ بات کیا بلکہ جھولی پھیلائی تھی اپنے قادرین کے واسطے عثمان کو میں نے بتا نہیں بے شک تمہیں گل نواز سے کم پیار بھی نہیں دیا۔ میری ممتا کی لاج رکھتے ہوئے میری جھولی تو وہ کبھی خالی نہیں لوٹائے گا مگر میں چاہتی ہوں تو اپنے دل سے چاہے تو ادھر کی ہامی بھر۔ ورنہ کوئی زور زبردستی نہیں ہے تجھ پر۔" سادگی سے بولتے ہوئے دادی نے گویا۔ قبول کے کل اختیارات اس کے ہاتھ میں تھما دیے اسے دل میں خوب ہنسی آئی۔

"سوئیٹ دادو کو معلوم ہی نہیں مما پاپا بال میرے کورٹ میں پھینک چکے ہیں۔ میری خواہش کے خلاف تو آج تک کوئی کام ہوا نہیں۔ اسکول میں سبجیکٹس کا انتخاب ہو یا گھر کی کلر اسکیم۔ گاڑی کا ماڈل بدلنا ہو یا ملازمین کو برطرف کرنا۔ سب میں تو میری چلتی ہے کجا کہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ۔"

"ویسے اگر تمہیں چاچے کا گھر پسند نہیں تو پہلے سے مجھے بتا دو۔ تمہارا نام آئے بغیر میں [illegible] اوپر لے لوں گی۔ آمنہ کو بھی میں نے [illegible] شرمیلی ماں، بھائی کے آگے منہ [illegible] مگر میرے سامنے اپنا دل کھول [illegible] تمہاری بھی دادی ہوں [illegible] میری مجال ہے جو منہ سے بھاپ نکالوں [illegible] دادی اب ایک بے تکلف سہیلی کی طرح [illegible] رازداری سے دریافت کر رہی تھیں [illegible] ان کے پاس آکر بیٹھ گئی اور [illegible] گلے لگ کے بولی۔

"[illegible] دادو۔ شادی کے بارے میں کبھی کوئی خیال میرے دل کو چھو کر ہی نہیں گزرا۔ ہاں جب بھی کوئی ایسی بات ہوئی تو سب سے پہلے آپ ہی سے شیئر کروں گی۔" اب کی بار وہ پورے خلوص دل سے بولی۔

☆ ☆ ☆

"تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہاری ذہنی اپروچ قابل

تعریف ہے مگر یہ کیا کہ تمہاری انگیجمنٹ اور میٹرک بھی پاس کرنے والے کزن سے کر دی گئی ہے۔ حالانکہ تم تو اچھا ماحول اور ایجوکیٹڈ لائف پارٹنر ڈیزرو کرتی ہو۔"

عروب کی بات بلکہ اعتراض کو سن کر آمنہ کے بستر کو جھاڑتے ہاتھ ایک دم رک گئے تھے۔ وہ جو بھی رنگ پر چڑھی ناشپاتی کھا رہی تھی۔ آمنہ بے حد سنجیدہ ہو گئی۔

"پتا ہے عروب! اگر کسی پودے کو اس کی زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگایا جائے تو بہت ممکن ہے اس پودے کو "آگی" مٹی اور موسم راس نہ آئیں۔ اس صورت میں پودا تو مرجھا جائے گا یا پھر سوکھ کر اسی جگہ پر مر جائے گا۔"

"[illegible] تمہارا دل تو چاہتا ہو گا اس گلی بندھی روٹین لائف سے ہٹ کر تو بالکل مختلف ماحول میں سروائیو کرنا۔ ساری زندگی یونہی کنویں کا مینڈک بنے رہنا سو بورنگ ہے۔" آمنہ کی بات سے وہ مطمئن نہیں ہوئی تبھی منہ بنا کر بولی۔

"ہم لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔ مگر "آنا" "فانا" نہیں بلکہ بتدریج ہو۔ جو چیز اچانک ہو جائے اس کا حسن بہت جلد گہنا جاتا ہے۔" آمنہ کو عروب کی بات بری لگی تھی۔ تقریباً ہر شہری کی طرح وہ بھی گاؤں والوں کو "علاقہ غیر" ہی سمجھتی تھی۔

پرائیویٹ ایف اے امتیازی نمبروں سے کرنے کا ہی اعجاز تھا کہ آمنہ کی ذہنی اپروچ گہرائی، حقیقت پسندی اور ٹھوس پن لیے ہوئے تھی۔

کمرے کی صفائی ہو گئی تھی۔ آمنہ نے اسے اٹھنے کا اشارہ دیا۔

آمنہ کا رخ دوسرے کمرے کی طرف تھا۔ وہ ناشپاتی یونہی پکڑی اس کے پیچھے چل پڑی۔

"ہم نے بھی کبھی دولتیوں کو دیکھا ہے۔ بے صبرے، بے تاب اور کم فہم، جو اپنی اصلیت پر آتے دیر نہیں لگاتے۔ بلاوجہ کی جلدی کی بجائے اک یقین و اطمینان کی سی کیفیت میں بتدریج آگہی پانے کا عمل ہمیں اچھا لگتا ہے۔ [illegible] شہروں کی تیز رفتاری اور بے باکی قابل نفرت [illegible] گاؤں کے کھلے ڈلے ماحول [illegible] شہر بھی اچھے ہیں بھی اچھے [illegible] ان لوگوں میں بسنے والے انسان اچھے ہوں۔"

[illegible] کسی ٹرافی کو بڑی توجہ سے صاف کرتے ہوئے آمنہ کا لہجہ رواں، سادہ مگر ٹھوس تھا۔

"یہ ٹرافی کس نے ون کی تھی؟" عروب نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔ "قادرین بھائی نے بین الصوبائی کرکٹ مقابلوں میں جیتی تھی۔ یہ صرف ٹرافی نہیں بلکہ یہ میڈل بھی انہوں نے حاصل کیے تھے۔"

آمنہ کی بات سن کر وہ مارے حیرت کے بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ شیلف پہ کئی قسم کی ٹرافیاں گولڈ، سلور اور برونز کے میڈلز اور کئی قسم کی اسناد بھی تھیں۔

سادہ سے لکڑی کے سنگل بیڈ کے دائیں طرف بک ریک تھا۔ جس میں اردو انگریزی لٹریچر کی بہترین کتب ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ کونے میں ایک میز پہ کمپیوٹر اور زراعت سے متعلق کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے ایک چیئر رکھی تھی۔

عروب کو پورے گھر میں سے صرف یہی کمرہ پسند آیا۔

"کیا وہ ایجوکیٹڈ ہیں؟" مارے استعجاب کے اس کے منہ سے بس یہی نکل سکا۔

"جی! اپلائیڈ فزکس میں گولڈ میڈلسٹ ہیں۔" آمنہ کے لہجے میں بھائی کے لیے تفاخر تھا۔

"تو پھر جاب کیوں نہیں کی۔ زمینیں کیوں سنبھال لی ہیں؟" "اتنا آؤٹ اسٹینڈنگ اکیڈمک ریکارڈ اور جانوروں کا چارہ بھوسہ۔" عروب کو یہ بات کچھ ہضم نہیں ہوئی۔

"ارے! انہیں تو بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی سے لیکچرار شپ کی آفر ہو چکی ہے۔ مگر زمینوں کا کام تو انہوں نے اپنی مرضی سے برضا اور رغبت سنبھالا ہے۔ ابا بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہیں۔ اس لیے زمین داری ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ دوسرے مزارعوں کو ٹھیکے پر زمینیں دیں۔ مگر بے ایمانی سے کام لیتے ہوئے آدھی پیداوار کو وہ ہڑپ کر جاتے بس اسی لیے سارا کام

بھائی نے خود اپنے کندھوں پہ اٹھالیا ہے۔ ساتھ میں چاچا عثمان کی زمینیں بھی شامل ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، فصلوں کا حساب کتاب۔ لاگت و منافع کا پورا پورا حساب رکھتے ہوئے ہر سال چاچا عثمان کے ہاتھ پر ان کا حصہ رکھ دیتے ہیں؟" آمنہ اپنے بھائی کی تعریفوں میں رطب اللسان تھی۔ وہ بے توجہی کا تاثر دیتی ریک سے کتابیں اٹھا کر ان کی یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔

"بھائی کہتے ہیں شہروں کی بے باکی اور جاہ پسندی نہ لو۔ وہاں کی تہذیب و تعلیم اور وقت کی اہمیت لے لو۔ اور شہر کی مصنوعی معاشرتی زندگی کے بجائے گاؤں کی اپنائیت و یگانگت' بھائی چارے اور پرخلوص تعاون کے جذبات سے گندھا طرز عمل اپنالو۔ دونوں جانب کی اچھی اور مفید مکمل چیزیں اپنالو' باقی نظر انداز کردو۔ اس طرح نہ تو شہر سے آنے والوں کو گاؤں آٹھویں صدی کا عجوبہ لگیں گے اور نہ گاؤں سے آنے والوں کی آنکھیں شہروں کی چمکتی دمکتی رنگوں میں لپٹی تیز رفتار زندگی دیکھ کر چندھیا جائیں گی۔"

"ڈسٹنگ ہوگئی ہے تو باہر چلیں۔ مجھے یہاں گرمی لگ رہی ہے۔" آمنہ کا "بھائی نامہ" سنتے سنتے وہ اکتا کر بولی۔

"ہاں چلو' چلتے ہیں۔"

"ارے دادو! یہ کیا کررہی ہیں؟" چنوں کی دال کو چھاج پہ صاف کرتا دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

"پتر یہ دال ہے تمہاری چاچی نے چکی پر چنے رگڑے ہیں۔ اسے صاف کرکے دیتی ہوں۔ دال سے یہ چکی پہ آٹا (بیسن) پیسے گی۔" چھاج میں پڑی دال کو جب دادی اچھالتیں تو چھلکے اڑ کر نیچے گرتے جب کہ دال چھاج ہی میں رہ جاتی تھی اس کو یہ عمل بہت دلچسپ معلوم ہوا وہیں بیٹھ کر اس نے چند دانے ہتھیلی پر پھیلا کر پھونک ماری تو چھلکے اڑ کر نیچے گر گئے۔ مٹھی بھر دال اس نے تھال میں ڈال دی۔

"ارے بیٹھ کیوں گئی ہو۔ باہر قادرین [illegible] تم دونوں کا انتظار کررہا ہے میں نے [illegible] عروب کو باغ دکھالاؤ۔ ہوسکتا ہے کل یا پرسوں روزہ ہوجائے تو پھر باہر نکلنا مشکل ہوجائے گا۔"

"سچ دادی! بھائی مان گئے ہیں۔" دادی کی بات سن کر آمنہ خوشی سے چہکی۔ پھر "فوراً" اندر سے دو چادریں نکال کر لے آئی۔

"چلو عروب' یہ چادر پہنو' جلدی کرو' ایسا نہ ہو کہ ان کا ارادہ بدل جائے۔" ایک چادر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے آمنہ جلدی سے بولی۔

بڑے بڑے سرخ پھولوں اور شیشوں سے مزین نیلی چادر اس نے اوڑھ لی۔ جیپ میں سفر کرنے کی وجہ سے وہ آدھے گھنٹے میں اپنی زمینوں پر پہنچ گئے۔

چار سو سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ دو فٹ نکلے کپاس کے پودوں میں سے بہت سی عورتیں' بچیاں فالتو اور خودرو جڑی بوٹیاں زمین سے اکھاڑ کر کاشت شدہ حصے سے باہر پھینکتے جارہے تھے کہ کہیں زمین کی زرخیزی و نمکیات کپاس کے پودوں کی بجائے یہ ناکارہ جڑی بوٹیاں نہ جذب کرلیں۔

سرخ و پیلے آموں سے لدے اونچے اونچے درخت دور ہی سے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ آموں کے باغ تک پہنچنے سے پہلے پانی کا ایک نالا پڑتا تھا جسے عبور کرکے ہی اپنے "مطلوبہ" مقام تک پہنچا جاسکتا تھا۔ نالے کو عبور کرنے کے لیے درمیان میں [illegible] کے تنے کو دو حصوں میں چیر کر' دو [illegible] ایک آدمی کے گزرنے کی [illegible] تھی۔ قادرین کے [illegible] آمنہ نے بھی بھائی کی تقلید کی مگر اس [illegible]

"ارے [illegible] کچھ نہیں ہوتا۔" آمنہ نے اسے [illegible] حوصلہ بڑھایا۔

"[illegible] مجھے پانی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ [illegible] نہیں کرسکتی۔" جھجکتے ہوئے پاؤں رکھتے ہی ذرا جھٹکا تو گھبرا کر اس نے پاؤں ہی کھینچ لیا۔

"عروب! تم تو بچوں کو پیچھے چھوڑ گئی ہو۔" آمنہ کو اس کی ڈری ہوئی صورت دیکھ کر ہنسی آگئی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بہلا پھسلا کر بالآخر پل پر لے ہی آئی۔

"عام دنوں میں نالے میں اتنی طغیانی نہیں ہوتی جتنا آج کل ساون کے موسم میں ہوتی ہے۔" آمنہ کی شاید خاصی پریکٹس تھی اس لیے آرام سے پاؤں جما کر وہ چل رہی تھی۔ جب کہ وہ تقریباً "گھسٹ گھسٹ کر" چل رہی تھی۔

نوعمر لڑکے جب کام سے اور گرمی سے تنگ آجاتے تو قمیص اتار کر "فوراً" بھاگتے ہوئے نالے میں کود جاتے۔ کنارے سے لڑکوں کو الٹی چھلانگ لگا کر نالے میں [illegible] چھپاکے کی آواز سے [illegible] عروب کو عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"ان کو دیکھو! ابھی ساون کے دنوں میں نالے میں زہریلے سانپ' کیڑے [illegible] اور دیگر موذی حشرات بہ کثرت [illegible] مگر مجال ہے جو باز آجائیں۔" آمنہ [illegible] کہتے ہوئے کہہ رہی تھی اور یہ سن کر [illegible] کی اور جان خشک ہوگئی تھی۔ پانی میں دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے مبادا کہیں چکرا کر غڑاپ سے نیچے ہی نہ جاگرے اس نے اپنی نظریں دور [illegible] پہ لگادیں۔ جہاں سے کوئل کے کوکنے کی مدھر آواز آرہی تھی۔

"عروب' تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ سخت گرمیوں میں کوئل اپنے انڈے چھوڑ دیتی ہے۔ کوئل اور کوے کے انڈوں میں اتنی مماثلت ہوتی ہے کہ کوے انہیں اپنے انڈے جان کر مادہ کوا انہیں سینے بیٹھ جاتی ہے۔ جب بچے نکلتے ہیں تو تب ہی بی کوی کو اپنی نادانی کا ادراک ہوتا ہے کہ اس کے بچے پیدائش کے وقت بے شک کالے سہی پر جسامت میں ہوتے تو بڑے ہیں۔ اپنی عقل کا ماتم کرتے یہ تو اڑ جاتے ہیں اور چالاک کوئل آرام سے آکر اپنے بچے چگنے لگتی ہے۔"

آمنہ پانی سے اس کا دھیان ہٹانے کو شے ہوئے اسے کوئی قصہ سنا رہی تھی مگر اس کی توجہ پاؤں کے نیچے ہلتی لکڑی پر تھی۔ ہیڈ پنجند سے نکلے نالے سے چھوٹی چھوٹی راجباہیں اور کھالے نکال کر کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔

بمشکل نالا اتنا کم چوڑا کہ ایک وقت میں ایک ہی پاؤں رکھا جاسکتا تھا اور دوسرا پاؤں دوسرے تختے پر۔ اگرچہ انہیں [illegible] میں خوب ملا کر (کیل) ٹھونک دیا گیا تھا مگر راستے کو [illegible] اور سیدھا ہونے کے لیے چیرا ہوا حصہ [illegible] اور چھوٹوں والا حصہ نیچے دیا گیا تھا جس [illegible] مسلسل ہل رہا تھا اور ایسا ہی لمحہ تھا کہ دائیں [illegible] کا تختہ بوجھ نہ سہارتے ہوئے ایک طرف کو مڑ گیا۔ آمنہ اور اس سے آگے کو چلتے قادرین نے ایک زوردار چیخ سنی تھی۔

نالے کے شفاف ٹھاٹھیں مارتے پانی کی سطح پر سرخ پھولوں والی نیلی چادر کا سرا دیکھ کر قادرین نے پانی میں چھلانگ لگانے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائی۔

☼ ☼ ☼

روزے کا ہے مہینہ
بخشش کا ان کے سایہ
[illegible] مسلمان
رمضان بن کے آیا

قریبی مسجد کے اسپیکر سے نعت خواں کی خوب صورت مترنم آواز ماحول کو روح پرور فسوں بخش رہی تھی۔

برآمدے سے متصل "اوپن ایئر" کچن میں ہونے والی کھٹرپٹر اور پہلو میں آمنہ کی جگہ خالی دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ جانوروں کے ڈکرانے کی آوازیں، برساتی مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازوں سے ہم آہنگ ہوکر صبح کاذب کے پرنور سکوت کو لمحہ بھر کے لیے درہم برہم کردیتیں مگر چند ثانیے بعد وہی مخصوص اعصاب کو سکون دیتی خاموشی کی دبیز چادر تن جاتی۔

مسلسل لوڈشیڈنگ اور مچھروں سے کافی دنوں تک ہاتھا پائی کرنے کے بعد تھک کر وہ آمنہ کے ساتھ چارپائی شیئر کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

گزشتہ رات تراویح ادا کرتے ہوئے اس سے روزہ رکھنے کے بارے میں دریافت کیا تھا مگر اتنی گرمی جہاں اسے سی تو دور کی بات پنکھے کے پر ہلنے بمشکل کہ بجلی چلی جاتی۔ اس نے سہولت سے انکار کردیا تھا۔

کچن میں ہونے والی سحری کی تیاریوں سے توجہ ہٹا کر وہ چپ تک آسمان کی سیاہ چادر پہ ٹنکے لاتعداد ستاروں کو دیکھنے لگی۔

دھیان کی اسکرین پہ ایک ہی منظر بار بار ابھر رہا تھا۔ ذرا سی بے توجہی سے اس کے پاؤں کا رپٹنا غڑاپ سے نالے میں جا گرنا۔ تیراکی سے قطعی نابلد ہونے کی وجہ سے اس کے ناک اور منہ میں ڈھیروں پانی گھس آیا تھا۔ گزرتا ہر پل اسے پانی کی اتھاہ میں ڈوبتا یہ سوچنے پہ مجبور کر رہا تھا بس عروب تمہاری زندگی بس یہیں تک تھی۔ کافی گہرائی لیے نالے میں اس کے پاؤں اس سے پہلے کہ دلدلی زمین کو چھوتے کسی مہربان فرشتے نے اس کے وجود کو متاع عزیز کی طرح بازوؤں میں سمیٹے کنارے پہ لا کھڑا کیا تھا۔

پیٹ میں کافی مقدار میں پانی کے چلے جانے اور ہوش حواس کے ساتھ چھوڑ دینے کے باوجود اسے اپنے نجات دہندہ کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ جس نے بروقت پانی میں کود کر اسے حیات نو بخشی تھی۔

"اگر جو بپھری لہریں مجھے اپنے سنگ بہا لے جاتیں تو کیا ہو جاتا؟ اگر زہریلے آبی سانپ مجھے کاٹ کر اگلے جہاں پہنچانے میں دیر نہ لگاتے تو میرے پاپا کا کیا ہوتا؟

وہ میرے بغیر زندہ نہ رہ پاتے' پاپا کہتے تو ہیں میری سانسوں کی ڈور عروب کے وجود سے بندھی ہے تو کیا خدانا خواستہ میرے دنیا چھوڑنے پر میرے پاپا۔"

پچھلے دو دنوں سے کھیتوں سے ہنگامی حالت میں واپسی کے بعد بھی تکلیف دہ سوچیں اسے کئی بار رلا چکی تھیں دادی کے شہد چٹانے' دیگر دیسی ٹوٹکوں اور گھر بھر کی محبت اور توجہ نے اسے چند گھنٹوں میں بولنے کے قابل کر دیا تھا۔

"ارے میرا قادر اس وقت موجود نہ ہوتا تو ہم سب عثمان کو کیا منہ دکھاتے۔" دادی کو تو موقع چاہیے ہوتا تھا اپنے پوتے کی تعریفوں کے پل باندھنے کا۔

شاید زندگی میں پہلی بار یہ تعریفیں اسے بری نہیں لگی تھیں۔ بلکہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ داد و تحسین کا مستحق تھا۔

طبیعت سنبھلنے پر کئی مرتبہ اس نے قادرین کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اُدھر تو وہی بے نیازی کا عالم تھا کہ گویا وہ اس کے ہمراہ کہیں گئی نہ ہو۔ تو اس نے اسے ڈوبنے سے بچایا ہو۔ الٹا دادی کے بار بار سراہنے پر وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اس میں اتنا شکر گزار ہونے کی کیا بات ہے۔ میرا فرض تھا۔ اگر اس کی جگہ آمنہ ڈوب رہی ہوتی تو تب بھی میں اس کی جان بچانے کی پوری کوشش کرتا۔"

"ہونہہ! بات ہی ختم۔" وہ چاہ کر بھی نہیں کیوں دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

دل میں کہیں دور ایک انوکھی سی خواہش چٹکیاں بھر رہی تھی۔ جس نے اس کے دل و جان کو نشاط آمیز درد میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ ایک لحظہ کو ہی رک کر اس کی خیریت دریافت کرے۔

ذرا جو ہمدردی میں ڈوبا اس کی صحت و سلامتی کے بارے میں ایک آدھ فقرہ ہی اس کی تشنہ سماعتوں کو سونپ دے تو اس بے نام بے قراری سے تو جان چھوٹے گی۔

لیکن اُدھر تو جیسے چہرے پہ اس پہ نگاہ پڑتے ہی سرد و سپاٹ تاثرات سج جاتے تھے۔

رمضان المبارک کا پہلا عشرہ ختم ہونے کو تھا۔

"دادو آپ اتنی کمزور اور بیمار ہیں پھر روزے کیوں رکھ رہی ہیں۔"

"دھی رانی' روزہ ایمان کی مضبوطی سے رکھا جاتا ہے۔ بیماری اور کمزوری تو اس سے یوں بھاگ جاتی ہیں کہ گویا میں سولہ سال کی صحت مند چھوری ہوں۔" دادی ہنستے ہوئے بولیں۔

"تم روزہ نہیں رکھتی ہو بیٹا۔" انہوں نے بظاہر سادہ الفاظ میں پوچھا تھا مگر نہ جانے جواب انکار میں دیتے ہوئے اسے شرمندگی ہوئی تھی۔ تبھی خاموش رہی۔

"رکھا کرو۔ بیٹا! انسان کو اپنے نفس کی بھوک کا پتا چلتا ہے۔ جب ہم بغیر وقفے کے کھاتے پیتے رہتے ہیں تو ہمیں لذت اور کھانوں کی اہمیت کا علم نہیں ہوتا۔

اگر کچھ وقفے سے بھوک رکھ کر کھائیں گے تو اس کی لذت دو گنی محسوس ہوگی اور رزق کو ضائع کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکیں گے اور سب سے بڑی بات روزے دار کی دعا اللہ فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ خواہش درجہ قبولیت پا جاتی ہے۔"

"خواہش؟ دعا؟" دادو کے فلسفے کو بغور سنتے ہوئے اس نے زیر لب دہرایا۔

"میرے پاس کیا نہیں ہے۔ جس کی میں خواہش کروں۔ محبت کرنے والے' جان چھڑکنے والے ماں باپ' دنیا کی ہر آسائش' قدموں میں ڈھیر کرنے والے' اس کی ہر خواہش کو پل میں پوری کرنے والے۔ شاندار طرز زندگی' لائف۔ ہاں! کیا نہیں ہے میرے پاس جو مانگنے کے لیے اس کے سامنے دست سوال پھیلاؤں۔" خود سے سوال جواب کرتے ہوئے ایک شاندار سراپا چھم سے اس کی نظروں میں آن سمایا تھا اونچا لمبا قد' سرخی گھلتا ہوا بدن' فراخ پیشانی پہ روشن ذہانت کا بھرپور تاثر دیتیں سیاہ گھور آنکھیں۔

"دادو! میں کل سے روزہ رکھوں گی۔ آپ پلیز سحری کے وقت مجھے اٹھا دیجئے گا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اگر مما یہاں ہوتیں تو اپنی لاڈلی کے منہ سے روزہ رکھنے کا سن کر یقیناً بے ہوش ہو جاتیں۔ عثمان اور راحیلہ دونوں صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ راحیلہ جب بھی اسے روزے رکھنے کا کہتیں وہ آسانی سے بات بچا جاتی۔

"اتنی گرمی میں؟ اماں پلیز میری آئلی اسکن ہے۔ پمپلز نکل آئیں گے۔ ان شاء اللہ سردیوں میں زندگی رہی تو ضرور رکھوں گی۔" اسی طرح کے جواز تراش کر وہ پہلو تہی کر جایا کرتی تھی۔

"شاباش میری بچی! اللہ تمہیں سیدھے راہ کی ہدایت دے' دین و دنیا کی کامیابیاں سمیٹو۔" دادی کو اس کے منہ سے سن کر بے طرح خوشی ہوئی تھی۔ ذرا دعائیہ انداز میں اس کا حوصلہ بڑھانے لگیں۔

افطار پر روز ہی تقریباً خاصا اہتمام ہوتا تھا۔ مگر آج اس کے روزہ رکھنے کی خوشی میں تو آمنہ نے اچھی خاصی دعوت کا سماں پیدا کر لیا تھا۔

کھجور' پھل' شربت' قورمہ' سبزی' بریانی بھی طرح طرح کے اور جانے کیا کیا۔

دادی اس کی طرف ایک ڈش بڑھاتیں تو چاچا نواز دوسری کے لیے اصرار کرتے۔ محبت بھرے ان مظاہروں پہ وہ بری طرح جھینپتی آمنہ کا دل رکھنے کی خاطر کچھ نہ کچھ چکھ رہی تھی ورنہ اتنا کچھ کھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

"دادی آپ کی دوائیاں میں لے آیا ہوں۔ بس انہیں وقت پر کھانا آپ کے ذمے ہے۔" جب سارے اس سے پورا دن بھوکے پیاسے رہنے پر تاثرات پوچھ رہے تھے تو خاموشی سے کھانا کھاتے قادرین نے موضوع الٹتے ہوئے دادی کو مخاطب کیا۔ وہ آج ہی ملتان سے لوٹا تھا۔ زمینوں کے لیے کھاد' بیج اور دیگر امور نبٹانے کے لیے اکثر و بیشتر اس کے چکر مختلف شہروں میں لگتے تھے۔

عروب کو لگا کہ قادرین کو مسلسل اس کی ذات کا مرکز گفتگو بننا پسند نہیں آیا تبھی تو بات کا رخ بدل رہا تھا۔ دل میں زور سے ایک پن سی چبھی تھی۔

"ارے آؤ ناہید بیٹا! کافی دنوں بعد پھیرا ڈالا ہے۔"

نگہت آنٹی کی پرجوش آواز پہ اس نے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جس سے گھر کے سارے افراد انتہائی محبت و اپنائیت سے پیش آ رہے تھے۔ روز کی طرح نماز تراویح سے فارغ ہونے کے بعد صحن میں بچھی چارپائیوں پہ سب ٹھنڈے میٹھے آم چوس رہے تھے۔

"وہ میں قادرین بھائی سے اپنی کتابوں کا پوچھنے آئی تھی۔" دھیمی سی آواز میں بولتے ہوئے وہ دادی کے ساتھ ٹک گئی۔

عروب نے غور سے اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ لان کے پھولدار سبز سوٹ پہنے' سانولی سلونی رنگت پہ کالی آنکھیں دوسروں کی توجہ کھینچنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھیں۔ دبلا پتلا سراپا سیاہ بالوں کے بیچ نکلی دودھیا مانگ یوں لگ رہی تھی جیسے تاریک سیاہ آسمان پہ کہکشاں کی روشن جگمگاتی تاروں کی لمبی سی لکیر۔

"ناہید! مجھے تمہاری کچھ تو مطلوبہ کتابیں مل گئیں اور کچھ نہیں ملیں۔ وہ میں ان شاء اللہ اگلے چکر میں ڈھونڈ لاؤں گا۔ مارکیٹ میں نہیں تو لائبریری کو کھنگالوں گا۔" وہ خوش دلی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"بہت شکریہ قادرین بھائی!" ناہید شکر گزاری کے احساس سے مغلوب ہو کر بولی تو اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے سر خم کیا عروب نے آدھا کھایا آم واپس پلیٹ میں ڈال دیا تھا اچھا خاصا میٹھا آم ایک دم سے پھیکا بے مزہ لگنے لگا تھا۔

"چلو میں تمہاری کتابیں تمہیں بیگ سے نکال دوں بعد میں کام میں لگ جانے سے مجھے بھول جائیں گی۔" چارپائی کے نیچے رکھی گڑوی سے آم سے سنے ہاتھ دھوتا قادرین اٹھ کھڑا ہوا ناہید اس کے پیچھے چل پڑی۔

عروب کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا۔ ناہید کے لمبے سیاہ گھنے بالوں کی چوٹی کمر پر جھول رہی تھی۔ مسکرا کر باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں قادرین کے کمرے میں چلے گئے تھے۔

"یہ محترمہ کون تھیں؟" سادہ لہجہ دھیمی سی آتش لیے ہوئے تھا۔

"ناہید باجی ہیں۔ عزیز بوا کی بیٹی اور "ان" کی بہن۔" آمنہ نے قدرے شرماتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"یہ پرائیویٹ ایم اے کر رہی ہیں۔ گاؤں میں کوئی کالج، یونیورسٹی نہیں ہے۔ بھائی کی حوصلہ افزائی اور تعاون سے یہ تعلیمی مدارج طے کرتی جا رہی ہیں کیونکہ انہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ بھائی ہی انہیں کتابیں لا کر دیتے اور داخلہ بھجواتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری اور ادب سے کافی دلچسپی ہے انہیں۔ دلچسپیاں مشترک ہونے کی وجہ سے ان کی اور بھائی کی خوب گپ شپ رہتی ہے۔" آمنہ سادگی سے بتا رہی تھی جبکہ اس نے بے اختیار اپنے اسٹیپ کٹ براؤن سلکی بال کیچر سے نکال کر کندھوں پر بکھرا لیے تھے۔

اسے اپنے بال ہمیشہ پسند رہے تھے جنہیں وہ نت نئے رجحانات کے مطابق کاٹتے چھانٹتے اور سنوارنے کے لیے وہ ہر ماہ باقاعدگی سے پارلر کا چکر لگایا کرتی۔

آج اسے یوں لگا جیسے اس کے بال ضرورت سے زیادہ چھوٹے ہیں۔ انہیں تھوڑا سا لمبا ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ایک عجیب سی خود ترسی کی کیفیت میں گھری وہ بالوں کو دوبارہ کیچر میں مقید کرنے لگی۔ تصور میں بار بار لمبی دراز جھولتی ہوئی چوٹی آ رہی تھی۔

مرد وجیہہ ہو اور اپنی وجاہت کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے بھی ارد گرد سے اغماض برتے تو نو عمری کے لیے خاصا مہلک ثابت ہوتا ہے۔

عروب کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس کا دل جس میں قادرین نواز کے لیے کچھ تھا تو وہ صرف نفرت اور بے زاری تھی۔ مگر اس کا یہ نادان دل اس کے ہمیشہ کے ساتھ کا تمنائی کب بنا اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ شاید اس دن سے جب قادرین نے اسے ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اسے پانی سے نکال کر جیپ میں لانے تک صرف چند لمحے ہی تو لگے ہوں گے مگر وہی چند لمحے اس کی پوری زندگی پہ محیط ہو گئے تھے اشفاق احمد نے ایک بار کہا تھا۔

"محبوب وہ ہوتا ہے جس کا خوب بھی خوب لگے محبت اس سے ہوتی ہے جس کی ہر غلط بات کو بھی صحیح تسلیم کرے۔"

"کیا مجھے قادرین نواز سے محبت ہو گئی ہے۔" وہ جتنی بار بھی خود سے پوچھتی دل کا جواب اثبات ہی میں آتا۔ "ہاں" پھر کیسے نہ اسے قادرین کا خود کو دیکھ کر تیوری چڑھانا برا لگتا تھا اور نہ ہی اس نے اس کے سامنے بد تمیزی اور زبان درازی کا مظاہرہ کیا تھا۔

محبت یوں بھی مکمل ہو گی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا وہ ساری رات کروٹیں بدلتی اپنے دل کی بدلتی کیفیت پر حیران ہوتی رہی ذہن کے پردے پر وہ مسکراتے چہرے ساری رات اسے ڈسٹرب کرتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"دادو! آپ نے ایک بار کہا تھا کہ اگر آنے والے وقت کے بارے میں میں جو بھی فیصلہ کروں سب سے پہلے آپ کو مطلع کروں؟" اس کا انداز کچھ یاددہانی کراتا ہوا تھا۔

"ہاں! مجھے یاد ہے۔" تسبیح کے دانے گراتے ہوئے انہوں نے بغور اس کا چہرہ جانچا۔ جھکی ہوئی نظریں، دھیمے سے کچھ کہنے کو بے تاب لرزاں گلابی ہونٹ خوب صورت نقوش سے سجے چہرے پہ ایک درخواست گزاری کا سا تاثر لیے مکمل کر بات کرنے میں جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

"دادو! یہاں قدم رکھنے کے بعد ہی کوک میں جو مدھرتا ہوتی ہے۔ مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔ وقت سحر مرغ کی بانگ اور چڑیوں کو حسن بخشتی میرے پیروں میں ایسی زنجیر بندھ گئی ہے کہ میں چاہوں بھی تو یہاں سے نہیں جا سکتی۔ کنویں کی چرخی کا رواں مجھے پاگل کر چکا ہے۔ یہ سبزہ یہ کھیت یہ ڈوبتی شامیں مجھے کیوں جکڑتی ہیں۔"

عجیب بے بسی سی بے بسی تھی اس کے لہجے میں۔ اگرچہ اس نے ٹو دی پوائنٹ بات نہیں کی مگر سادہ لوح پر چلیں دیدہ دادی کو اس کی مبہم باتوں میں چھپے اس کے مدعا کو پانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی ویسے بھی جو دل کے پاس ہوں ان کے دل کی بات بن کہے جاننا کون سا کار دشوار ہے؟

اس کی بات کا جواب دادی نے ایک بھرپور بوسہ اس کی پیشانی پہ ثبت کر کے دیا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ان کے بوڑھے جھریوں بھرے چہرے پہ شکر گزاری کا اظہار کرتی پرشفقت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اطمینان سے سر جھکا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج چاند رات تھی۔ گو کہ تلاش بسیار کے باوجود بھی ہلال عید اس کی نظروں کی گرفت میں نہیں آسکا تھا مگر گلی محلے میں اٹھتے بچوں کے شور اور پر رونق ہنگامے یہ باور کرا رہے تھے کہ شوال کا چاند نکل چکا

وہ بے تابی سے آسمان پہ نظریں جمائے کھڑی تھی کہ چاند نظر آئے اور وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے آمنہ چاند دکھائی نہ دینے پر تھک کر کچھ دیر پہلے اندر چلی گئی تھی۔ اس کی عیدی آگئی ہوئی تھی۔ جنہیں شوق وچاہت سے اوڑھنے پہننے کے بعد ٹرنک میں سلیقے سے رکھتی جارہی تھی۔

وہ چبوترے پر چڑھ آئی جہاں قادرین پہلے سے موجود سینے پہ بازو باندھے چاند کی تلاش میں آسمان پہ نظریں گاڑھے کھڑا تھا۔

اس کا دل اسے مخاطب کرنے کو چاہا مگر وہی اپنائیت سے عاری خشک تاثرات سے سجا چہرہ۔

عروب کو لگا اگر اس نے یہ موقع گنوا دیا تو شاید ساری زندگی کچھ نہیں کہہ پائے گی۔

"سنیے! شرمندگی اور پسپائی کا اظہار کس زبان میں آپ تک پہنچایا جائے جو آپ کی سمجھ میں آجائے۔"

وہ سر جھکا کر ہاتھ مسلتے ہوئے بدقت تمام بولی۔ اپنا مفہوم چند لفظوں میں بیان کرنے میں کس قدر دشواری پیش آرہی تھی۔ قادرین نے اس کا جھکا ہوا سر دیکھا۔ اس کے لہجے میں واضح شکست تھی۔ جسے قادرین کا نکتہ رس ذہن فوراً محسوس کرچکا تھا۔ تاہم اپنے مخصوص اکھڑے لہجے میں بولا۔

"شرمندگی اور پسپائی؟ بڑے عجیب سے لگ رہے ہیں یہ الفاظ تمہارے منہ سے۔ ارے ان ہونٹوں سے تو دیہاتیوں کی برائیاں ان کی جہالت کے قصے ان کے ظلم و بربریت کی داستانیں بیان ہوتی اچھی لگتی ہیں۔"

وہی طنزیہ لہجہ وہی کاٹ دار مسخرانہ ہنسی۔

اسے رونا سا آرہا تھا۔

گھر میں جب بھی اس کی شادی کا تذکرہ ہوتا تو بلا اتفاق رائے نام عروب حسن کلی لیا جاتا تھا۔ جس سے —— وہ تین بار ٹاکرا ہونے پر ایک مغرور بدماغ انسانیت سے عاری لڑکی کا تاثر ملا۔ بزرگوں خصوصاً دادی کے کیے گئے فیصلے سے انحراف کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مگر عروب کے مغرورانہ رویے نے اسے اس سے متنفر ضرور کردیا تھا۔ تبھی تو وہ اپنی ناگواری برملا جتاتا رہتا تھا۔ لیکن وہ مغرور کب اور کیسے عروب اس کی پسند کے روپ میں ڈھلتی گئی۔ ضدی، سرکش اور بدتمیز عروب تو شاید لاہور ہی میں رہ گئی تھی اس کے بدلتے ہوئے روپ نے اس پہ انکشاف کیا کہ بزرگوں کے کیے ہوئے فیصلے نے اس کے دل کے اندر تک سرنگیں کھود ڈالی تھیں۔ تبھی تو کل جب دادی نے آمنہ کی رخصتی کے ساتھ اس کی اور عروب کی تاریخ ٹھہرانے کی بات اشارے کنایے میں کی تو دل اندر تک شاد ہوگیا تھا۔ من پسند ہستی کا ساتھ یونہی ہلکا پھلکا سا بنادیتا ہے انسان کو۔

"احساس ندامت انسان کی سچائی کی دلیل ہے ندامت انہیں ہوتی ہے جن کے ضمیر زندہ ہوتے ہیں۔ تم نادم ہو کہ تم نے میری دل آزاری کی۔ مگر اپنی غلطیوں کا احساس اور ازالے کی کوشش رب کریم کے حضور بہت پسندیدہ ہے۔ ہم حقیر ——— بندے کس گنتی میں کہ آپس کی غلطیوں سے چشم پوشی نہ کریں۔" نرم لہجہ دھیما انداز۔

عروب نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ویسے کچھ دیر پہلے تم نے پوچھا تھا اظہار ندامت کے لیے کون سی زبان استعمال کی جائے تو میرا خیال ہے۔ پیار کی زبان۔ ٹھیک [illegible] آئی رائٹ؟"

"جی۔" اس کے [illegible] آسمان ٹوٹ پڑا۔ آنکھیں پھاڑے بھونچکا [illegible] کو دیکھنے لگی۔ جس کے ہونٹوں میں ایک [illegible] تبسم دبا ہوا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اسے مسکراتے دیکھا تو بہت عجیب سا لگا۔ کھلا کھلا روشن چہرہ۔ آنکھوں سے برستی اجنبیت اور قہر ساماں تاثرات کہیں پیچھے چلے گئے تھے وہاں ایک شوخی اور اپنائیت آمیز چمک تھی۔ وہ سٹپٹا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔

لائٹ بلو کاٹن کا سوٹ جس پہ رائل بلو سوتی دھاگے سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔ سر پہ دوپٹہ اوڑھے قادرین کو اپنے دل کے قریب لگی۔

ایسا ہوتا لیکن وہ آر جے جو نئے ہوتے ہیں۔ وہ مائیک آف کرنا بھول جاتے ہیں۔ ایک دفعہ آف ایئر میں میری آواز آن ایئر ہوئی تھی۔ مگر یہ مائیک کی خرابی کی وجہ سے ہوا۔"

○ "بچپن کیسا گزرا؟ بہن بھائیوں کی تعداد اور آپ کا نمبر کون سا ہے؟"

☆ "بچپن کی تو بات ہی اپنی ہے۔ بہت اچھا گزرا سب بہت پیار کرتے تھے اور اپنی ہر ضد پوری کروائی۔ کیونکہ میں بہت زیادہ ضدی ہوں۔ ہم دو ہی بھائی ہیں میرا نمبر دوسرا ہے۔"

○ "کوئی ایسا واقعہ جو ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہو؟"

☆ قہقہہ "مزے کی بات ہے۔ واقعات مجھ سے دور رہتے ہیں۔ میری امی جان کا کہنا ہے کہ صرف تم وہ سوچتے ہو۔ جو حال میں ہے۔ ماضی اور مستقبل کا پتا ہی نہیں، بہرحال دوست کی وفات کا واقعہ ہی ہے۔ اس لیے کہ اس کی وفات کا اس کے گھر میں سے کسی نے مجھے نہیں بتایا اور مجھے آج تک افسوس ہے کہ مجھے عام ذرائع سے ایک ماہ بعد خبر ہوئی۔"

○ "کوئی ایسا پروگرام جو کسی خاصیت کی بنا پر آپ کے ذہن میں محفوظ ہو گیا ہو؟"

☆ "جی ایسے کوئی شوز ہیں اور ان کی خاصیت ایک تو یہ تھی کہ کالر بہت اچھی بات کر گئے اور دوسرا میں خود ان شوز پہ مطمئن ہوا ہوں۔ بعض اوقات بہت اچھے ٹاپکس ذہن میں آتے ہیں۔ خاص طور پر جن میں گھریلو معاملات ہوں۔ جیسا کہ ساس بہو کا جھگڑا وغیرہ۔"

○ "میں نے سنا ہے کہ آپ تین تین جابز کرتے ہیں کیا یہ روٹین ٹف نہیں ہے؟ ریڈیو کے لیے کیسے وقت نکالتے ہیں؟"

☆ "ارادہ ہو کچھ کرنے کا تو کچھ مشکل نہیں ہوتا سب کو آپریٹ کرنے والے ہیں۔ اسپیشلی ہمارے اسٹیشن منیجر سید حسن رضا صاحب جو ہمارے بزرگ بھی ہیں اور بچوں کی طرح رکھتے ہیں۔ تو کوئی مشکل نہیں ہوتی اور چار بجے شام مجھے ڈیوٹی پہ جانا ہوتا ہے۔ الحمدللہ سب لوگ اچھے ملے ہوئے ہیں اس لیے کبھی مشکل کا احساس نہیں ہوا۔"

○ "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

☆ "سچ بولوں تو کوئی چھٹی ہے ہی نہیں اور اگر مل بھی جائے تو بہت بورنگ وقت گزرتا ہے جب دوست بھی نہ مل پائیں۔ دوست مل جائیں تو ٹائم کا احساس نہیں ہوتا پر ضروری نہیں کہ میری چھٹی ہے تو دوست بھی ویلے فارغ ہوں اور جب وہ نہ ملیں تو بس مکھیاں مارنا مجبوری ہے (قہقہہ) (مجبوری میں سب چلتا ہے ڈونٹ وری)"

○ "گھر سے باہر نکلتے وقت کیا کچھ لے کر نکلتے ہیں؟"

☆ "بائیک لے کر نکلتا ہوں اور کیا ہوتا ہے ساتھ۔ باقی ماں کی دعائیں ہر وقت ساتھ ہوتی ہیں۔

○ نئے آنے والوں کے لیے کوئی خاص بات یا میسج یا نصیحت کریں گے؟

☆ "جی صرف اتنا کہوں گا کہ آپ کی کامیابی آپ کی صلاحیتیں ہیں۔ کبھی کسی کو روند کر آگے بڑھنے کی کوشش مت کریں۔ اچھے برے کی لڑائی سے بچیں اور ہمیشہ اپنا دل صاف رکھیں۔ جو کچھ آپ میں ہے وہ کسی اور میں نہیں اور جو کسی اور میں ہے وہ آپ حاصل نہیں کر سکتے۔ بس خود پر یقین رکھیں کہ آپ ٹھیک ہیں۔ اس شعر کے ساتھ اختتام کرنا چاہوں گا۔

جو اعلا ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

☆ ☆

شعاع منیر

کرن کرن روشنی

اے ابن آدم

"اے ابن آدم! ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے۔ پر ہو گا وہی جو میری چاہت ہے پس تو نے اپنے آپ کو سپرد کر دیا اس کے جو میری چاہت ہے تو میں بخش دوں گا تجھ کو وہ بھی جو تیری چاہت ہے اور اگر تو نے مخالفت کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں تجھ کو تھکا دوں گا اس میں جو تیری چاہت ہے اور پھر ہو گا وہی جو میری چاہت ہے۔"

حدیث قدسی

فوزیہ غزل۔۔۔ رسالہ شیخوپورہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

"ابو ہریرہؓ سے روایت ہے ایک دیہاتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا۔"

"مجھے ایسا کام بتائیے جب میں وہ کروں تو بہشت میں داخل ہو جاؤں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ کی عبادت کر اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا اور فرض نماز درستی سے ادا کرتا رہ اور فرض زکوۃ دیتا رہ اور رمضان کے روزے رکھ۔"

وہ دیہاتی کہنے لگا۔ "قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اس سے زیادہ (کوئی کام) نہیں کروں گا۔" جب وہ پیٹھ پھیر کر چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر کسی کو جنتی آدمی دیکھنا اچھا لگتا ہو تو وہ اس شخص کو دیکھے۔"

حیرو ہتاب۔ کراچی

سچی توبہ

عتبہ غلام کی فتنہ انگیزی اور شراب نوشی کی داستانیں بڑی مشہور تھیں۔ ایک دن حضرت خواجہ حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت اس آیت۔

"کیا مومنوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ سے ڈریں۔" کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔

آپ نے اس آیت کی ایسی تفسیر بیان کی کہ لوگ رونے لگے۔ ایک نوجوان اس مجلس میں کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"اگر میرے جیسا کوئی فاسق اور فاجر توبہ کرے تو کیا اس کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔" آپ نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تیری توبہ قبول کرے گا اور گناہ معاف کر دے گا۔"

عتبہ نے جب یہ بات سنی تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کانپنے لگا۔ اور چیخنا شروع کر دیا اور وہ اسی دوران بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو حضرت حسن بصری کو اپنے قریب یہ اشعار پڑھتے ہوئے پایا۔ ترجمہ۔

"اے عرش کے مالک کے نافرمان تو کیا جانتا ہے کہ نافرمان کی کیا سزا ہے۔

نافرمان لوگوں کے لیے شور کرتا جہنم ہے اور روز حشر غیظ والا دن ہے جس دن پیشانیوں سے پکڑا جائے گا۔

اگر تو آگ کے عذاب کو برداشت کر سکتا ہے تو پھر گناہ کرتا رہ ورنہ گناہوں سے باز رہ۔

تو نے اپنے گناہوں کے بدلے اپنے آپ کو رہن رکھ دیا ہے اس کو چھڑانے کی کوشش کر۔"

عتبہ نے پھر چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو کہنے لگا۔

"اے حسن بصری! کیا میرے جیسے بد بخت کی رب

غفور توبہ قبول کرے گا۔"
آپ نے فرمایا۔ "ہاں۔" اس نے سر اٹھا کر تین دعائیں مانگیں۔
"اے اللہ! اگر تو نے واقعی میرے گناہوں کو معاف کر کے توبہ قبول کر لی ہے تو مجھے ایسا حافظہ اور عقل دے جس سے مجھے قرآن مجید، علوم دین یاد ہو جائیں جو بھی سنوں کبھی نہ بھولوں۔"
"اے اللہ! مجھے ایسی آواز عطا فرما جس سے میں قرات کروں تو سخت سے سخت دل بھی موم ہو جائیں۔"
"یا اللہ! مجھے رزق حلال ایسے طریقے سے عطا فرما جس کا مجھے گمان تک نہ ہو۔"
اللہ تعالیٰ نے عتبہ کی تینوں دعائیں قبول فرمائیں۔ اس کی فہم و فراست بڑھ گئی۔ اس سے تلاوت قرآن سن کر گناہ گار توبہ کر لیتا۔ اس کے گھر میں کھانا پہنچتا رہا۔ اسے ساری زندگی معلوم نہ ہو سکا کہ کھانا کون لاتا ہے۔
"بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

(امام غزالی از مکاشفۃ القلوب)
شائستہ رشید۔۔۔ لاہور

کرنیں

☆ اللہ تعالیٰ کا قرب جنت ہے اور اللہ تعالیٰ سے دوری دوزخ ہے۔
☆ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنت ہے اور عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری دوزخ ہے۔
☆ قبر اس وقفے کا نام ہے جو مرنے اور اٹھانے کے درمیان ہے۔ یہ وقفہ ہے مقام نہیں۔
☆ اگر تمہیں پتا چل جائے کہ تمہارا رزق اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو پھر رزق تلاش نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کو تلاش کرو جس کے پاس تمہارا رزق ہے۔
☆ جہاں دو راستے آتے ہیں [illegible] آتی ہے۔ جس آدمی کے پاس راستہ ہی ایک ہو اسے سوچنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔
☆ زندہ رہنا چاہو تو موت قیامت ہے اور مرنا چاہو تو زندگی قیامت ہے۔
☆ سخی تب سخاوت کرے گا جب سائل بھی موجود ہو۔
☆ جو کسی مقصد کے لیے مرتے ہیں وہ مرتے نہیں اور جو بے مقصد جیتے ہیں وہ جیتے نہیں۔
☆ دعا یہ کرو کہ اے اللہ جو تجھے دینا ہے وہ بغیر مانگے دے اور جو کچھ نہیں دینا ہے اس کے مانگنے کی توفیق ہی نہ دے۔
☆ جھوٹے معاشرے میں عزت کے نام سے مشہور ہونے والا آدمی دراصل ذلت میں ہے۔

مسز نگہت غفار۔۔۔ کراچی

اللہ تک پہنچنے کا راستہ

حضرت ابو یزید بسطامی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے پروردگار کو خواب میں دیکھا اور پوچھا۔
"آپ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟" جواب ملا۔
"اپنے نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ۔"

(حوالہ [illegible])
مہوش اعوان۔۔۔ [illegible]

انسان بھی کیا چیز ہے

دولت کمانے کے لیے [illegible] کھو دیتا ہے پھر صحت کو واپس پانے کے لیے [illegible] دولت کھو دیتا ہے۔ مستقبل کو سوچ کر [illegible] حال ضائع کر دیتا ہے۔ پھر مستقبل میں [illegible] یاد کر کے روتا ہے۔ جیتا ہے ایسے جیسے کبھی مرنا نہیں اور مر جاتا ہے جیسے کبھی [illegible] تھا ہی نہیں۔

حنیفہ اعوان۔۔۔ اٹک

ہلال عید

چاند رات کو
تمہارے آنگن میں
ہلال عید جگمگائے
ستاروں کی کہکشاں اتر آئے
اور
روز عید تم پہ
خوشیوں کی پھوار برسے
اور مسرتوں کا ہجوم تمہارے گرد
یوں ہالہ کیے رہے
جیسے چاند کے گرد روشنی

سدرۃ المنتہیٰ۔۔۔ [illegible]

نصیب

چاند رات آئے تو دیکھیں [illegible] ہلال عید
اک ہمارا ہی نصیب [illegible] گیا
چھت پہ [illegible] کے نظارے میں کھوئے کھوئے
بس [illegible] چاند کا بادل پہ آ گیا

(جیدی)
فوزیہ ثمرین، ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

آخری کامیابی

امریکہ کے ایک شہر میں کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بیمار ہو گیا۔ جب مریض کی حالت تشویش ناک ہو گئی تو گھر والوں نے پادری کو آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے بلا لیا۔
خاصی دیر بعد جب پادری صاحب مریض کے کمرے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ مریض نے پادری صاحب کی زندگی کا بیمہ کر لیا ہے۔

سائرہ۔۔۔ کراچی

پہلی آواز

☆ زیادہ خوش حالی اور زیادہ بدحالی دونوں برائی کی طرف لے جاتی ہیں۔
☆ فقیر وہ ہے کہ اس کی خاموشی فکر اور اس کی گفتگو ذکر کے ساتھ ہو۔
☆ جب آئے دن تمہاری رائے بدلتی رہتی ہے تو پھر اپنی رائے پر بھروسہ کیوں کرتے ہو۔
☆ جو کام محبت سے ہو سکتا ہے اس کے لیے لشکر کشی کی [illegible] ہوا ہے۔
☆ [illegible] باتوں سے افضل کسی انسان کے دل کو [illegible] جیتنا ہے۔
☆ سب سے کمزور دنیا میں وہ ہے جو اپنی خواہش پر قابو نہ رکھتا ہو اور سب سے قوی وہ ہے جو ضبط کی قوت رکھتا ہو۔
☆ جو شخص سانس سے زندہ رہتا ہے وہ موت سے مر جاتا ہے، جو اخلاص و صدق سے زندہ رہتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔
☆ میں ایک رات کامل ایسا لفظ تلاش کرتا رہا جس سے بادشاہ راضی ہو اور اللہ تعالیٰ خفا نہ ہو لیکن نہ ملا۔

تانی چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ یو کے

سند یسہ

چمن میں ہے پت جھڑ کا موسم
تم بہار سے کہہ دینا
دکھ کی لمبی گھڑیاں ہیں
انتظار سے کہہ دینا
پیار کے بدلے ملے ہیں دھوکے
اعتبار سے کہہ دینا
گئی ہے چین قرار کی دولت
بے قرار سے کہہ دینا

تانی چوہدری۔۔۔ آکسفورڈ یو کے

عمل اور دعوا ان کے خلاف

☆ حضرت سیدنا حاتم اصم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے حضرت سیدنا شقیق بلخی نے فرمایا کہ لوگ چار چیزوں کا دعوا کرتے ہیں، لیکن ان کا عمل اس دعوا کے بالکل خلاف ہے۔
☆ لوگ دعوا کرتے ہیں کہ ہم اللہ عزوجل کے بندے اور غلام ہیں، مگر وہ عمل آزاد لوگوں والے کرتے ہیں۔

☆ ان کا دعوا تو یہ ہے کہ ہمارے رزق کا کفیل اللہ رب العزت ہے، لیکن اس بات پر مطمئن نہیں ہوتے۔
☆ ان کا دعوا ہے کہ دنیا آخرت سے بہتر نہیں مگر پھر بھی دنیا کا مال جمع کرتے ہیں۔
☆ ان کا دعوا تو یہ ہے کہ موت برحق ہے، لیکن ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے انہوں نے مرنا ہی نہیں۔

ثمانہ رفیق شیلہ۔ سمندری

تماشا سرِ بازار لگا رکھا ہے

اس نے حق بات کو لوگوں سے چھپا رکھا ہے
اک تماشا سرِ بازار لگا رکھا ہے
وہ یہ کہتا ہے کہ انصاف ملے گا سب کو
جس نے منصف کو بھی سولی پہ چڑھا رکھا ہے
اس نے چوروں سے سرِعام شراکت کی ہے
اس نے قاتل کو بھی مسند پہ بٹھا رکھا ہے
اے خدا تجھے لوگ دیکھتے ہیں اور تو نے
اک فرعون کی مہلت کو بڑھا رکھا ہے

راشدہ۔ لاہور

جلد بازی

ویکیوم فروخت کرنے والے ایک جوشیلے نوجوان نے ایک گھر کے دروازے پر دستک دی، دروازہ ایک خاتون نے کھولا، اس سے پہلے کہ خاتون کچھ کہتی نوجوان دوڑ کر اندر گیا اور اس نے مٹھی بھر مٹی زمین پر بچھے قالین پر بکھیر دی اور پھر خاتون سے کہنے لگا۔

"محترمہ...!"

"میرا ویکیوم کلینر معجزہ دکھائے گا۔ اور قالین پہلے سے زیادہ چمک اٹھے گا، اگر ایسا نہ ہوا تو میں ریزہ ریزہ کھا جاؤں گا۔"

عورت نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولی۔

"جلد کھانا شروع کر دو۔" سیلز مین حیران ہو کر بولا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

خاتون نے دو ٹوک کہا۔ "کل سے بجلی گئی ہوئی ہے۔"

سمیرا عبدالغنی بٹ۔ ورچھف لودھرے

عشق

☆ عشق کا دیوتا جوان ہے اس لیے کم سنوں کو پسند کرتا ہے، بوڑھے اور بڑھاپے سے اسے نفرت ہے۔
☆ عشق نازک بھی ہے یہ سخت جگہ میں نہیں رہ سکتا، نہ سختی برداشت کر سکتا ہے، اس کی راہ گزر روح ہے جو انتہائی نرم ہے۔
☆ یہ پھولوں پر چلتا ہے دل اس کا مسکن ہے، یہ سخت جگہ کو ناپسند کرتا ہے، اس لیے سنگ دل سے نکل جاتا ہے۔
☆ ضدی بھی بہت ہے، آپ لاکھ کوشش کریں کہ یہ دل سے نکل جائے، نہیں نکلے گا، کسی کی نہیں مانتا، اپنی منواتا ہے۔
☆ خدا آپ کو نظر نہیں آتا، حالانکہ وہ قریب ہے، بلکہ اقرب ہے، یوں سمجھ لو کہ آپ کی آنکھ میں ہے، کبھی آنکھوں میں پڑی چیز خود کو نظر آتی ہے۔
☆ عشق میں انسان روح کی تہوں تک بھی پہنچ جاتا ہے۔
☆ عشق مجازی، عشق حقیقی تک جانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

پاگل

ایک صاحب ماہرِ نفسیات کے کلینک میں داخل ہوئے [illegible] تمباکو کا تھیلا نکالا اور تمباکو کو اپنے کان میں [illegible] ماہرِ نفسیات نے کہا۔
"آپ کی اس حرکت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو میری ضرورت ہے۔" ان صاحب نے کہا۔
"جی ہاں کیا آپ کے پاس ماچس ہوگی۔"

سدرہ سہیل۔ لاہور

☆ ☆

بشریٰ محمود

عظمیٰ مغل، کی ڈائری میں تحریر
[illegible] کی نظم

ہاں اے دل دیوانہ

وہ آ کر [illegible]
[illegible] پہچانا
[illegible] سوچ لیا دل میں
[illegible] ہو گیا بے گانہ
ہاں اے دل دیوانہ

وہ آپ بھی آتے تھے
ہم کو بھی بلاتے تھے
کس چاہ سے ملتے تھے
کیا پیار جتاتے تھے
کل تک جو حقیقت تھی
کیوں آج ہے افسانہ
ہاں اے دل دیوانہ

بس ختم ہوا قصہ
اب ذکر نہ ہو اس کا
وہ شخص وفا دشمن
اب اس سے نہیں ملنا
گھر اس کے نہیں جانا
ہاں اے دل دیوانہ

ہاں کل سے نہ جائیں گے
پر آج تو ہو آئیں
اس کو نہیں پا سکتے
پر اپنے ہی کو کھو آئیں
تو باز نہ آئے گا
مشکل تجھے سمجھانا
وہ بھی تیرا کہنا تھا
یہ بھی تیرا فرمانا
ہاں اے دل دیوانہ

عفت جبیں، کی ڈائری میں تحریر
عدیم ہاشمی کی غزل

اُسی ایک فرد کے واسطے مرے دل میں درد ہے کس لیے
میری زندگی کا مطالبہ وہی ایک فرد ہے کس لیے

تُو جو شہر میں ہی مقیم ہے تو مسافرت کی فضا ہے کیوں
تیرا کارواں جو نہیں گیا تو ہوا میں گرد ہے کس لیے

جو لکھا ہے میرے نصیب میں، کہیں تو نے پڑھ تو نہیں لیا
تیرا ہاتھ سرد ہے کس لیے، تیرا رنگ زرد ہے کس لیے

وہ جو ترکِ ربط کا عہد تھا، کہیں ٹوٹنے تو نہیں لگا
میرے دل کے درد کو دیکھ کر میرے دل میں درد ہے کس لیے

کوئی واسطہ جو نہیں رہا، تیری آنکھوں میں یہ نمی ہے کیوں
میرے غم کی آگ کو دیکھ کر، تیری آہ سرد ہے کس لیے

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
عہد کے حوالے سے خوبصورت نظم

عیداب کے برس نہیں آئی

ہے وہی آسمان، زمین وہی
ماہ و انجم اسی طرح روشن
کہکشاں اب بھی مسکراتی ہے
پھول کلیاں مہک رہی ہیں یونہی
بعد مدت کے سارے پردیسی
اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے
ہر طرف رنگ و بو کا میلہ ہے
اور تنہا میں اپنے کمرے میں
کب سے بیٹھی ہوں اور سوچتی ہوں
جو گزشتہ برس تھی رونق اب
وہ کہیں بھی نظر آتی نہیں
ہے فضا میں عجیب سناٹا

ہاں فقط ایک تیرے جانے سے
ایسا محسوس ہو رہا ہے مجھے
رت خوشی کی ہے ہر طرف آئی
صرف چھوٹے سے میرے آنگن میں
عیداب کے برس نہیں آئی
عیداب کے برس نہیں آئی

قرین کیوٹی، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

نہ میں نے چاند دیکھا
اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا
میرا ملبوس اب میلا ہے
حنا سے ہاتھ خالی ہیں
اور چوڑی سے کلائی
نہ میرے پاس تھے تم
اور نہ میلے شہر سے گزرے
میں کیا افشاں لگاتی
مانگ میں سیندور بھرتی
رنگ اور خوشبو پہنتی
چاند کی جانب نظر کرتی
کہ میری لذت دیدار تو تم ہو
مرا تہوار تو تم ہو...

نرجس رانی، کی ڈائری میں تحریر
طلعت اخلاق کی نظم

اتنا ہی یاد رکھو مجھے
جیسے کسی کتاب میں
بیتے دنوں کے دوست کا
اک خط پڑا ہوا ملے
لفظ مٹے مٹے سے ہوں
رنگ اڑا اڑا سا ہی
لیکن وہ اجنبی نہ ہو
اٹھ کر تیرے گلے لگے

بھولے ہوئے تمام دکھ
گزرے ہوئے تمام سکھ
بیتے دنوں کی سب کتھا
تجھ سے کہے اور رو پڑے
اتنا ہی یاد رکھ مجھے
بیتے دنوں کے دوست کا
جیسے کوئی خط ہو ں میں
رکھا ہوا کتاب میں

ام... کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی غزل

حجاب تھا کہ ستارہ، گریز پا ہی لگا
وہ اپنی ذات کے ہر رنگ میں جدا ہی لگا

میں ایسے شخص کی معصومیت میں کیا لکھوں
جو مجھ کو اپنی خطاؤں میں بھی بھلا ہی لگا

زباں سے چپ تھا مگر آنکھ بات کرتی ہے
نظر اٹھائی ہے جب بھی تو بولتا ہی لگا

جو خواب دینے پہ قادر تھا، مری نظروں میں
عذاب دیتے ہوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

نہ میرے لطف پہ حیران، نہ اپنی الجھن پر
مجھے یہ شخص تو ہر شخص سے جدا ہی لگا

یاسمین کنول، کی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی غزل

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

کچھ ایسی برف تھی اس کی نظر میں
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

تم نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

میں اس کی انجمن میں تھا اکیلا
کسی نے بھی مجھے دیکھا نہیں تھا

ابھی حرفوں میں رنگ آتے کہاں سے
ابھی میں نے اسے لکھا نہیں تھا

تھی پوری شکل اس کی یاد مجھ کو
مگر میں نے اسے دیکھا نہیں تھا

یہ امجد آج تک وہ شخص دل میں
کسی صورت بھی میرا نہیں تھا

عائشہ شہوار، کی ڈائری میں تحریر
ظریف احسن کی غزل

کھلا کہ لمحہ موجود کے گماں میں تھا
جو اپنے آپ سے باہر بڑی اماں میں تھا

عجیب کار ہنر بال و پر کے ساتھ رہا
کہ میں زمیں پہ رہ کر بھی آسمان میں تھا

نئی رتوں نے یہ منظر عجیب دکھلائے
لہو کا رنگ لیے تیر بھی کمان میں تھا

وہ ایک رشتہ بڑا معتبر سا رشتہ تھا
جو اب سے پہلے مکینوں میں اور مکاں میں تھا

تمہاری یاد تلے عمر یوں گزاری ہے
کہ دھوپ دھوپ نہ تھی اور میں سائباں میں تھا

سمیعہ عبدالرحمن، کی ڈائری میں تحریر
عطا شاد کی غزل

بڑا کٹھن ہے راستہ جو آ سکو تو ساتھ دو
یہ زندگی کا فاصلہ مٹا سکو تو ساتھ دو

بڑے فریب کھاؤ گے بڑے ستم اٹھاؤ گے
یہ عمر بھر کا ساتھ ہے نبھا سکو تو ساتھ دو

جو تم کہو یہ دل تو کیا میں جان بھی فدا کروں
جو میں کہوں تو بس اک نظر لٹا سکو تو ساتھ دو

میں اک غریب بے نوا، میں اک فقیر بے صدا
میری نظر کی التجا جو پا سکو تو ساتھ دو

یہ زندگی یہاں خوشی غموں کا ساتھ ساتھ ہے
رلا سکو تو ساتھ دو، ہنسا سکو تو ساتھ دو

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

☆ "سر آپ بہت تیزی سے گنجے ہو رہے ہیں' کیا آپ اس سلسلے میں کوئی احتیاطی تدابیر کر رہے ہیں؟"
"ہاں۔ میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا سوچ رہا ہوں۔"

☆ "کبیر صاحب کا انتقال کیسے ہوا؟"
"وہ ایک ماڈرن باربر شاپ میں شیو کروانے گئے تھے' جہاں لڑکیاں گاہکوں کا شیو بناتی ہیں' ایک لڑکی ان کا شیو بنا رہی تھی کہ اچانک ایک چوہا لڑکی کے پاؤں پر سے گزر گیا۔"

☆ "میں بہت جلدی میں ہوں' کیا تم میرا کالر موڑے بغیر اور میری گردن کے گرد تولیہ لپیٹے بغیر میرا شیو بنا سکتے ہو؟"
"کیوں نہیں جناب' اگر آپ حکم دیں تو میں آپ کی ٹوپی اتارے بغیر آپ کے بال بھی کاٹ سکتا ہوں۔"

...منصور... شہداد

مشورہ

ایک صاحب نے دوست سے کہا۔
"آپ نے بیٹے کو وکیل بنانے کا فیصلہ کیا سوچ کر کیا؟"
"وہ بچپن ہی سے جھگڑالو تھا' بہت بحث کرتا تھا' کام نکلوانے کے لیے عجیب عجیب دلیلیں ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی کمزوریاں نکال کر لاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ بہتر ہے کہ اسے ان کاموں کا معاوضہ بھی ملنے لگے۔" دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

منورہ اقبال۔۔۔ جام پور

خوش فہمی

کسی ملک کے بادشاہ نے ایک مرتبہ فوج کے ایک چھوٹے افسر کو امتیازی نشان عطا کیا تو اس نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا۔
"جہاں پناہ! میں خود کو اس کا حق دار نہیں سمجھتا' یہ تمغہ میں صرف میدان جنگ میں کارنامہ دکھا کر ہی وصول کر سکتا ہوں۔"
فوجی افسر کو توقع تھی کہ بادشاہ اس کا جواب سن کر خوش ہوگا یا کم از کم تحسین کے کلمات تو ضرور کہے گا۔ لیکن توقع کے برخلاف بادشاہ نے کہا۔
"عجیب احمق آدمی ہو' کیا تمہاری خواہش کی خاطر میں جنگ چھیڑ دوں۔"

معصومہ نذیر۔۔۔ اسلام آباد

مرض کی تشخیص

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔
"میں جب بھی کافی پیتا ہوں تو آنکھ میں بہت تیز اور شدید تکلیف پہنچانے والا درد محسوس ہوتا ہے' اس کا کیا علاج ہے؟"
"بہت آسان علاج ہے' بس یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ کافی پینے سے پہلے چمچ کپ سے نکال دینا۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حنا عباس۔۔۔ لاہور

حجامت کارنر

"تمہاری کبھی سرجری ہوئی ہے۔"
"بہت مرتبہ۔ کیونکہ میں بال کٹواتے ہوئے شیو بھی بنواتا ہوں۔"

باکمال لوگ

"ویسے پراپرٹی ڈیلر بھی بڑے باکمال لوگ ہوتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ڈیلر نے گوادر کی دو ایکڑ زمین مجھے بیچ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہاں زبردست فلیٹ تعمیر ہوں گے اور میں چند لاکھ لگا کر کروڑوں کماؤں گا۔ جب میں نے وہاں جا کر دیکھا تو اس زمین پر دس دس فٹ پانی کھڑا تھا۔"
"اوہ۔ حد ہوگئی۔ پھر تم اس سے اپنی رقم واپس لینے گئے۔" دوست نے بے اختیار افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں گیا تھا' پیسے تو نہیں ملے' البتہ اس نے مجھے ایک ایک کشتی دے دی ہے۔" ان صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

عشرت۔۔۔ فیصل آباد

دودھ کا جلا

ایک ڈاکٹر کافی ہاؤس گئی۔ آرڈر دینے سے پہلے اس نے ویٹر سے پوچھا۔
"کیا یہاں کی کافی خالص ہوتی ہے۔"
"یقیناً میڈم!" ویٹر نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا۔
"ہماری کافی آپ کے خوابوں کے شہزادے کی طرح خالص ہے۔" ڈاکٹر نے کچھ لمحے غور کیا' پھر آہستہ سے بولی۔
"میرے لیے چائے لے آؤ۔"

مہوش فیضان۔۔۔ کراچی

ترجیح

عارف صاحب کی ملاقات ایک روز چراغ الٰہ دین کے جن سے ہوگئی۔ جن نے کسی بات پر خوش ہو کر انہیں پیشکش کر ڈالی کہ وہ ان کی کوئی ایک خواہش پوری کر سکتا ہے۔
عارف صاحب فوراً بولے۔
"کراچی کی جن سڑکوں پر ابھی تک فلائی اوور نہیں بنے ہیں ان سب پر ایک صاف ستھرا چوڑا اور شاندار فلائی اوور بنا دو۔ روزانہ کسی نہ کسی سڑک پر میری گاڑی ٹریفک میں پھنس جاتی ہے' جس کے سبب گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔"
"یہ تو بہت مشکل کام ہے سر۔" جن سر کھجاتے ہوئے بولا۔
"ہزاروں ٹن سریا' سیمنٹ اور دوسرا میٹریل درکار ہوگا۔ لیبر بھی چاہیے ہوں گے۔ سیکڑوں رکاوٹیں ہٹانا ہوں گی' بے شمار محکموں میں کام پھنس جائیں گے اور ممکن ہے کہ رشوتیں نہ ملنے کی وجہ سے فلائی اوور مکمل ہونے کے بعد توڑ دیے جائیں۔" عارف صاحب مایوسی سے بولے۔
"اچھا تو مجھے ایک تفصیلی مضمون لکھ کر لا دو' جسے پڑھ کر میں عورت کو مکمل طور پر سمجھ سکوں کہ وہ کیا سوچتی ہے' کیوں روتی ہے' کیوں ہنستی ہے' کیا چاہتی ہے اور اسے کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے۔"
جن نے ایک بار پھر سر کھجایا اور ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد مردہ سے لہجے میں بولا۔
"ٹھیک ہے سر! میں شہر کی ساری سڑکوں پر فلائی اوور ہی بنوا دیتا ہوں۔"

صدف عبداللہ۔۔۔ لاہور

قدر شناس

برنارڈ شا کے ڈرامے کے مینجر نے شا کو درجہ اول کے چھ اعزازی پاس دیتے ہوئے کہا۔
"یہ پاس آپ شہر کے معززین کو اپنی طرف سے دے کر انہیں ضرور مدعو کریں' تاکہ ہمارے ڈرامے کی نمائش کامیاب ہو جائے۔"
ان ہی دنوں شا کے گھر میں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ چنانچہ شا نے مینجر کے چلے جانے کے بعد ٹھیکیدار کو بلا کر کہا۔
"یہ ڈرامے کے پاس ہیں' تم آج شام اپنے عزیزوں کے ساتھ جا کر اسے دیکھ آنا۔"
دوسرے دن ٹھیکیدار نے شا کو تعمیراتی کام کا بل دیا تو

اس میں تین گھنٹے کا اور ٹائم بھی درج تھا۔

قائزہ اطہر۔۔۔ کراچی

بے چارگی

زخمی سپاہی بہت پریشان تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اسپتال اسے عقوبت خانہ محسوس ہونے لگا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کا بازو تھام لیا اور التجائیہ لہجے میں بولا۔

"اب مجھ پر رحم کریں' ڈاکٹر صاحب! مجھ سے تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ آپ روزانہ آتے ہیں اور میرے زخم کو کریدتے ہیں۔ اس سے مجھے جو اذیت ہوتی ہے اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔" ڈاکٹر نے گہری سانس لی اور بولا۔

"مجبوری ہے دوست! مجھے ہر حال میں رائفل کی گولی تلاش کرنی ہے۔"

"اف خدایا! آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" زخمی سپاہی نے کہا۔

"وہ گولی تو میری جیب میں ہے۔"

امبرا سلم۔۔۔ لاہور

سلسلۂ کلام

بحری جہاز پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک نئے ملاح نے شور مچا دیا۔

"ایک آدمی سمندر میں گر گیا ہے۔" جیسے ہی اطلاع کیپٹن تک پہنچی تو اس نے جہاز کا رخ موڑنے کا حکم دیا' جہاز کئی میل پیچھے آ گیا تو ملاح نے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"سر! دراصل کوئی آدمی سمندر میں نہیں گرا۔" کیپٹن ملاح پر خوب گرجا برسا اور جہاز کا ایک رخ ایک بار پھر موڑا گیا۔ جہاں تیز رفتاری سے منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ تو ملاح نے گویا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

"سر! میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ سمندر میں آدمی نہیں عورت گری ہے۔"

صبا حسیب۔۔۔ آزاد کشمیر

عید کارڈ

اس نے پھر عید کارڈ میں مجھ کو
لفظ اک بے دھیان لکھا ہے

پھر میری عید کر کری کر دی
پھر مجھے بھائی جان لکھا ہے

ہانیہ۔۔۔ گجرات

جیب

روزے رکھے ہیں کس دھڑلے سے
عید بھی ٹھاٹ سے منالی ہے

عید سے قبل پیٹ خالی تھا
عید کے بعد جیب خالی ہے

فوزیہ ثمریٹ/ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

کنجوس

رشید حد سے زیادہ کنجوس تھا۔

ایک دن وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو کلفٹن گھمانے لے گیا۔

رشید نے بیوی کو سارا دن پیدل ادھر ادھر پھرا کر تھکا ڈالا' کچھ کھانے کا تو ارادہ ہی نہیں تھا اس کا۔

ایک جگہ ایک شخص ریڑھی پر بھٹے/کارن لیے کھڑا تھا۔

شرمیلی اور [illegible] دلہن نے آخر کار ناک اونچی کر کے [illegible] لے کر کہا۔

"[illegible] کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔" [illegible] بتانا تھا نا۔" رشید نے فوراً" دلہن کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

"چلو قریب چل کر اچھی طرح سونگھنا۔ یہاں کیا خاک مزا آئے گا۔"

سونیا بابر۔۔۔ قاضیاں محلہ بالا

==

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

شیر خورمہ

اجزا:

دودھ	ایک لیٹر
عرق کیوڑہ	دو کھانے کے چمچے
شکر	آدھا کلو
چھوٹی الائچی	دو عدد
گھی	آدھا پاؤ
سویاں	آدھا پاؤ
بادام	دس گرام
پستے	دس گرام
چھوارے	پچاس گرام

ترکیب:

چھوارے رات کو ہی گرم پانی میں بھگو دیں' پستے' بادام بھی الگ برتن میں بھگو دیں۔ صبح ہونے پر چھوارے سے گٹھلی نکال کر جتنے ٹکڑوں میں آپ چاہیں انہیں کاٹ لیں۔ سائز سب کا ایک ہو۔ پستہ' بادام کی ہوائیاں ایک طرح کی کتر لیں پھر دودھ کو الائچی میں بگھار کر کچھ دیر شکر ڈال کر پکائیں۔

پھر اس میں سویاں شامل کر کے خوب پکائیں جب اچھی طرح پک جائے تو اس میں ہوائیاں شامل کر کے عرق کیوڑہ ڈال دیں۔ سرونگ پیالے میں نکال کر پیش کریں۔ یہ عید کی خاص سوغات ہے۔

سویوں کا مزعفر

اجزا:

سویاں	250 گرام
چینی	دو کپ
پانی	دو کپ
زعفران	ایک چٹکی
الائچی سبز	دس عدد
لونگیں	پانچ عدد

بادام	دس گرام
پستے	دس گرام
چاندی کے ورق	دو عدد
عرق کیوڑہ	ایک کھانے کا چمچہ
گھی	250 گرام
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
کشمش	بیس دانے
دودھ	دو پیالی

ترکیب :

پانی، چینی اور پیلا رنگ مکس کر کے ابالیں اور اس کا گاڑھا شیرہ تیار کر لیں۔ پھر دوسری دیگچی میں تیل گرم کر کے لونگ اور الائچیاں ڈال کر چند سیکنڈ بعد سویاں ڈال کر تلیں۔ جب سویوں کا رنگ سنہری مائل ہو جائے تب اس میں دودھ میں بھگویا ہوا زعفران، شیرہ اور بچا ہوا دودھ ڈال کر ڈھکن رکھ کر دم لگا دیں۔ عرق کیوڑہ شامل کر کے چند سیکنڈ دیگچی کا ڈھکن بند کر کے رکھیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد پستے بادام کی باریک ہوائیاں اور چاندی کے ورق سے سجا کر پیش کریں۔ عید کی اسپیشل ڈش ہے۔ اس مزعفر کا شمار شاہی ڈشوں میں ہوتا ہے۔

کلر فل مینگو ٹرائفل

اجزا :

آم (چوکور کاٹ لیں)	تین عدد
سادہ کیک (چوکور کاٹ لیں)	دو عدد
جیلی (سبز لال اور پیلی)	ایک ایک پیکٹ
کریم	ایک پیکٹ
ونیلا کسٹرڈ	تین کھانے کے چمچے
دودھ	ایک کلو
چینی	چوتھائی کپ
پستہ بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

دودھ کو گرم کر کے اس میں چینی ڈالیں چمچہ چلاتی رہیں اور تھوڑے دودھ میں کسٹرڈ گھول کر گرم دودھ میں ڈالیں۔ کسٹرڈ گاڑھا ہو جائے تو چولہا بند کر دیں اس کے بعد ایک ڈش میں کیک کے سلائس ڈالیں۔ کسٹرڈ میں آدھی کریم مکس کر لیں اور کیک سلائس پر کسٹرڈ پھیلائیں مینگو سلائس ڈالیں۔ جیلی سیٹ کر کے چوکور ٹکڑے کر کے ڈالیں۔ کریم ڈال دیں اور پستہ بادام سجا کر ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

فروٹ کریم ڈیلائٹ

اجزا :

دودھ	آدھا کلو
چینی	آدھا کپ
کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
کریم	آدھا کپ
خربوزہ (سلائس کاٹ لیں)	ایک عدد
انار (دانے الگ کر لیں)	آدھا کپ
سیب (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد

ترکیب :

ایک پین میں دودھ گرم کریں۔ چینی ڈال دیں۔ پھر کارن فلور تھوڑے دودھ میں [illegible] دودھ میں ڈالیں۔ گاڑھا ہو جائے [illegible] کر دیں۔ ٹھنڈا کر لیں۔ اب ڈش میں [illegible] مکسچر ڈالیں اس پر خربوزے [illegible] کے سلائس لگا دیں۔ اس کے بعد [illegible] میں انار کے دانے ڈال کر ٹھنڈا [illegible] کریں۔

☆ ☆

حسن وصحت

ادارہ

یقین کرنا مشکل ہوتا ہے مگر ایسی خواتین بھی ہیں جو ساری زندگی میک اپ استعمال کرتی ہیں مگر وہ بھی میک اپ کے دوران غلطیاں کر جاتی ہیں اور اناڑی پن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ایسا عموماً تب ہوتا ہے جب جلدی جلدی میں میک اپ کیا جائے یا پھر معقول پروڈکٹس پاس میں نہ ہو اور تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ سوچے سمجھے بغیر میک اپ کیا جائے۔ ایسی غلطیوں کی سینکڑوں وجوہات ہو سکتی ہیں اور ان سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے آگاہی۔ ذیل میں کچھ ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی جا رہی ہیں جو میک اپ کے دوران کی جاتی ہیں اور پھر ان سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا جا رہا ہے۔

فاؤنڈیشن

یہ یا تو ہلکا ہوتا ہے یا پھر ڈارک ... جب بھی ممکن ہو، فاؤنڈیشن خریدنے سے قبل اس کی جانچ کر لیا کریں۔ اسے چیک کرنے کا بہترین جگہ گال یا پھر گردن ہے۔ ہمیشہ ایسا فاؤنڈیشن خریدیں جس کے شیڈ آپ کی جلد کی ٹون سے سیٹ ہو جائے۔ اس ٹون سے ہلکا یا ڈارک نہ ہو۔

بعض اوقات میچ کا فاؤنڈیشن دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ ایک یا ایک سے زائد کلر کو مکس کر کے اپنا من پسند فاؤنڈیشن حاصل کر سکتی ہیں۔ جب بھی یہ عمل کریں تو قبل از وقت کر لیں یہ نہ ہو کہ عین میک اپ کے وقت کلر مکسنگ کرنے بیٹھ جائیں۔ اگر آپ عین موقع پر کریں گی تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ آپ غلط رنگ یا شیڈ کا انتخاب کر بیٹھیں گی۔ ظاہر ہے یہ آپ کے میک اپ کا حسن خراب کر دے گا۔

س : روح نکلے تو جسم تڑپتا ہے، دل ٹوٹے تو آنسو بہتے ہیں، احساس مرجائے تب کیا ہوتا ہے؟
ج : روح مرجاتی ہے۔

رانجھاری ــــــ کراچی

س : کیا تمہیں علم نہیں کہ پلکوں کی ذرا سی جنبش سے تمہارے ہاتھوں میں تھمے سارے دہلے گرا سکتی ہوں۔
ج : ہاں بھئی، مان لیا آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ ریاستیں چلی گئیں مگر رانجھاری کے اطوار نہ بدلے۔

عالیہ مسرت واسطی ــــــ کراچی

س : ذوالقرنین بھیا! میری ساری خوبصورت گھنیری پلکیں گر کر اب بہت تھوڑی رہ گئی ہیں، میں کیا کروں؟
ج : میرے مشورے پر عمل کیا تو رہی سہی پلکیں بھی گر جائیں گی۔
س : نین بھیا! کبھی کبھی آپ ایسے بے زار کن جواب دیتے ہیں جیسے ٹال رہے ہوں، ایسا کیوں ہے؟
ج : کبھی اپنے سوالوں پر بھی نظر ڈال لیا کرو۔

روشن مقصود ــــــ کراچی

س :

روک کے ڈوبتے سورج کو ذرا یہ کہہ دو!

ج :

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے

ہاجرہ گل ــــــ کراچی

س : نین! اگر آپ کا کبھی ٹکراؤ کسی حسین لڑکی سے ہو جائے تو پھر؟
ج : پھر وہی ہو گا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔

رفیقہ درانی ــــــ کھاریاں

س : جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے پھر بھی وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتا ہے۔ کیسے؟
ج : کبھی اڑ کر کبھی رینگ کر۔

س : ذوالقرنین صاحب! جلدی سے بتایئے کہ لوگ انسان کو گدھا کیوں کہتے ہیں؟
ج : لوگوں کو گدھا پسند ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

غزالہ پروین ــــــ کراچی

س : نین جی! ابھی آپ افق کے پار گئے ہیں؟
ج : پچھلی باتیں یاد دلا کر اداس کر دیا تم نے۔
س : اپنی عمر تو سچ بتا دو؟
ج : کوئی میں خاتون ہوں جو عمر پوچھ رہی ہو۔

یاسمین انصاری ــــــ گوجرانوالہ

س : بھائی جان! لوگ جب آپ کا نام بگاڑ کر پکارتے ہیں تو آپ کو برا نہیں لگتا؟
ج : بہت اچھا لگتا ہے۔ ریپیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔

عظمیٰ سحر ــــــ بلوچستان

س : نین! تمہارا ستارہ کون سا ہے۔ پتا چلے تو بتاؤں کہ گردش میں ہے کہ نہیں؟
ج : بے فکر رہو میرے اور تمہارے خیالات میں بڑا فرق ہے۔
س : کیوں یار! کیا خیال ہے، مستعفی ہوتے ہو کہ نہیں اس رسالے سے؟
ج : زیادہ بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔

شیریں عزیز ــــــ راولپنڈی

س : کسی سے [illegible] کو بچھڑتے ہوئے آنکھوں میں آنسو [illegible] کیا یہ بات درست ہے؟
ج : [illegible] سو فیصد درست۔ کل ایک بکری پڑوسیوں کی بچھڑ گئی (بھاگ گئی) تو آنکھوں میں آنسو آ گئے (پڑوسیوں کے)

==

منصور حسین کا کردار مشکوک لگتا ہے۔

فوزیہ یاسمین کا ناول "دست کوزہ گر" بہترین جارہا ہے۔ حمل کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا۔ شرمین اور ابرار پر بے طرح غصہ آیا۔ ویسے میری پیشن گوئی ہے کہ حمل کی شادی خرم سے ہی ہوگی۔ "اور بے پیا" نایاب جیلانی نے ہمیشہ کی طرح خوب لکھا مگر حریم کے ساتھ بہت برا ہوا۔ تمام ہی افسانے اچھے تھے۔ مگر "امید سحر کی بات" نازیہ جمال کا سب سے بہترین تھا۔ ضوباریہ ساحر کے ناول کا اختتام خوش کر گیا بہت ہی سبق آموز ناول تھا۔

آپ سے گزارش ہے کہ آواز کی دنیا سے FM-105 کے زین العابدین اور جاسم علی کا انٹرویو بھی کریں۔

رابعہ عمران چوہدری ۔۔۔ رحیم یار خان

اگست کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے اور تبصرہ حاضر خدمت ہے۔ ضوباریہ ساحر کی تحریر کا اختتام بہت ہی اچھا ہوا۔ مسرت کے ساتھ بہت برا ہوا۔ مگر مسرت کے بھائیوں کا کردار اور رویہ پسند آیا۔ واقعی اگر وہ غلطی نہ کرتے تو مسرت سے بھی غلطی نہ ہوتی کہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ رویہ اچھا رکھنا چاہیے۔ تاکہ وہ غلط قدم اٹھا کر ساری زندگی کو پچھتاووں کی نذر نہ کریں۔

بہت عرصے کے بعد کرن میں دوبارہ حاضری دی ہے اور تبصرہ فی الحال مختصر رہا ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ ٹائٹل اور کرن کتاب بھی اچھی لگی۔ راؤ سمیرا ایاز کا افسانہ بہت منفرد اور اچھا لگا۔ ام ثمامہ کی کاوش پسند آئی۔ روشنی بخاری کا ناولٹ ٹاپ آف دی لسٹ رہا۔ آج کل تو کسی بھی "پیر بابا" پر بھروسہ نہ کیا جائے، جگہ جگہ پہ جعلی پیر عورتوں کو بے وقوف بنا کر خوب پیسہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان عزت کے لٹیروں سے سب کو بچائے رکھے۔

ام طیفور کی تحریر بھی کافی دلچسپ تھی۔ نایاب جیلانی کی کاوش اچھی ہے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ انٹرویو بھی اچھے رہے۔ غرضیکہ کرن ڈائجسٹ شروع سے لے کر آخر تک منفرد رہا' اب کرن میں کہانیوں کے ٹاپک بھی منفرد ہیں۔ کافی چینج آیا ہے اور یقیناً "یہ [illegible] کا کمال ہے' ہماری پرانی رائٹرز تو جہاں بھی لکھیں [illegible] کہانیاں [illegible] کی منتظر [illegible] انٹرویو بھی چھاپی گئی ہیں اب اجازت دیں اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی۔

سعدیہ افضل ۔۔۔ لاہور

میں پچھلے پانچ سال سے کرن کی خاموش قاری ہوں اور کسی بھی ماہنامے میں پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ بہت سے ایسے ناول پڑھے جن کو پڑھ کے دل تبصرہ کرنے کو مچل گیا۔ لیکن کچھ مجبوریوں کی وجہ سے نہیں کر سکی ان ہی میں سرفہرست نبیلہ عزیز کا ناول "زردل" جس نے مجھے اپنا اسیر کر رکھا ہے۔ نبیلہ جی ہر کردار میں ایک الگ کشش محسوس ہوتی ہے چاہے وہ زری ہو یا علیزے اور خواہ ایک معمولی ورکر "عدیل" ہو یا ایک کامیاب وکیل دل آور شاہ بس علیزے کا ہیرو واضح کریں اور پلیز جلدی سے زری اور دل آور شاہ کی اچھی سی شادی کروا دیں۔

فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ فوزیہ جی! خرم اور حمل کی شادی کروا کر جلدی سے ان دونوں کی لڑائی کو ختم کر دیں کہ آخر حمل بھی ایک نازک جذبات رکھنے والی لڑکی ہے اور اپنے سنگ دل باپ کے بعد بیاہی شوہر یہ اچھا نہیں ہے۔ سعدیہ عزیز کا ناولٹ "محبت جادو والی ہے" اچھا لگا۔ باقی سارے افسانے اور ناولٹ اپنی جگہ اچھے تھے۔ لیکن نایاب جیلانی کے مکمل ناول "رستے پیا" نے جہاں ماہیر کے خوب صورت الفاظ سے دل خوش کر دیا وہیں اس کا اینڈ پڑھ کر دل گھبرا گیا۔ نایاب [illegible] براہ کرم حریم اور اس کے بچے کو کچھ [illegible] کہ ماہیر کا کیا ہوگا؟ اور نازک احساسات اور خوب صورت دل والی حریم اس انجام کی [illegible] ہے۔ بس ان دونوں کو ایسا ہی ایک [illegible] پیار کرنے والا اور ساتھ ساتھ [illegible] الگ کرنا سراسر زیادتی ہے۔

مستقل سلسلوں میں تمام سلسلے بہت اچھے تھے۔ [illegible] تبصرہ پھر بھی کروں گی کہ ابھی پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں اور مجھے خط لکھنے کا ٹھیک طریقہ بھی نہیں معلوم اگر خط قابل اشاعت لگے تو ضرور شائع کیجیے گا۔

اللہ پاک کرن کو اور اس کی سب رائٹرز اور تمام لوگ جو اس سے منسلک ہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور کرن اسی طرح ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔ (آمین)

☆ ☆